وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ القرآن

وَاِذَا قُرِئَ فَاَنْصِتُوْا الحدیث

تیسیر الکلام

قادری

جلد اوّل

تالیف

جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا عبدالقدیر دامت برکاتہم شیخ الحدیث مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی

ناشر

کتب خانہ رشیدیہ

راجہ بازار راولپنڈی

Scanned by CamScanner

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ (القرآن)

وذکر الامام احمد بن حنبل الاجماع علیٰ انها نزلت فی الصلوٰۃ ۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱۴۳ ج ۳)

وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا ۔

(مسلم ص ۱۷۴ ج ۱ ، و ابوعوانہ ص ۱۳۳ ج ۲)

تحقیق الکلام

جلد اوّل

جس میں قرآن کریم کی آیات کریمات اور صحیح احادیث اور شروح حدیث اور کتب تفسیر و فقہ کے واضح حوالوں کے ساتھ یہ بات مُبرہن کی گئی ہے کہ امام کی اقتداء اختیار کرنے کے بعد قرآن کریم کی قرأت کے وقت خواہ سِرّاً ہو یا جہراً مقتدی کسی قسم کی قرأت نہیں کرسکتا اور فریق ثانی نے قدیماً و حدیثاً جو دلائل بزعم خویش اپنے مسلک کے اثبات پر نقل کیے ہیں خالص علمی اور تحقیقی انداز میں ان کی حقیقت کو طشت از بام کیا گیا ہے اور ایسے سنجیدہ طریقہ سے ان کے بخیئے ادھیڑے گئے ہیں کہ بفضلہٖ کبھی رفو نہ ہوسکیں خصوصاً دورِ حاضر میں اس مسئلہ پر فریقِ ثانی کی مایۂ ناز کتابوں "خیر الکلام اور توضیح الکلام" وغیرہ کے رکیک شبہات کی ایسی علمی تردید کی گئی ہے کہ ہر منصف مزاج دادِ تحسین دینے پر مجبور ہوتا ہے اور حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ان حضرات نے اپنے مسلک کے اثبات کے لیے کیا کیا حیلے اور بہانے کیے ہیں اور اپنے خود ساختہ اختراعات کا سہارا لیا ہے۔ یہ کتاب اہلِ علم کے لیے بیش بہا علمی ذخیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے شرفِ قبولیّت مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین ۔

تالیف

شیخ الحدیث جامع المنقول والمعقول حضرت مولانا **عبدالقدیر** صاحب دامت برکاتہم

Scanned by CamScanner

نام کتاب ——— تدقیق الکلام (جلد اوّل)

نام مصنف ——— شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب دام مجدہم

ناشر ——— کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

طبع اوّل ——— شوال المکرم ۱۴۰۹ھ بمطابق جون ۱۹۸۹ء

مطبع ——— فائن بکس پرنٹرز ۔ لاہور

کتابت ——— شوکت محمود صدّیقی ادارہ انیس الکتابت گوجرانوالہ

تعداد ——— گیارہ سو

قیمت ——— ۶۰ روپے

ادارہ نشرواشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

مدنی کتب خانہ النور مارکیٹ اردو بازار گوجرانوالہ

مکتبہ حنفیہ گلی ڈاکخانہ والی اردو بازار گوجرانوالہ

انجمن اسلامیہ جامع مسجد بوہڑ والی گکھڑ منڈی، ضلع گوجرانوالہ

کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار، راولپنڈی

Scanned by CamScanner

فہرستِ مضامین

تدقیق الکلام جلد اوّل

مضامین	صفحہ
مقدمہ ۔ از شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خانصاحب صفدر	۹
امام کے پیچھے فاتحہ خوانی اور اس میں خلصی پریشانی اور سرگردانی	۱۹
بعض ضروری باتوں کا تذکرہ	۲۳
قرآنِ کریم نے امام کا وظیفہ قرأت بتاکر اس کی تحدید بھی کر دی ہے ۔	۲۸
قرأت خلف الامام کا مسئلہ اور قرآنِ کریم میں اس کا تذکرہ	۲۸
فیصلہ	۲۹
الحاصل	۳۱
فائدہ	۳۱
الحاصل	۳۳
مزید سُنیے !	۳۵
الدلیل الاوّل للانصات عند قرأتہ	۳۵
بیان شانِ نزول آیت کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا	۳۸

مضامین	صفحہ
الحاصل	۴۰
صاحبِ خیر الکلام کی اُلٹی چال	۴۳
حضرت امام رازیؒ کی تفسیر میں دو باتیں	۴۹
پہلی بات کا جواب تو خود قرآنِ کریم میں ہی موجود ہے ۔	۴۹
دوسری بات کا جواب	۵۰
مصنف خیر الکلام سے انصات کا معنیٰ	۵۴
جواب کی وجہ اوّل	۵۵
دوم	۵۵
غایۃ المرام وخلاصۃ الکلام	۵۸
حضرت امام بیہقیؒ کا استدلال	۵۹
اور اس کا جوابِ اوّل	۵۹
دوم	۶۰
تیسری بات	۶۱
صاحب توضیح الکلام کی بے لبسی	۶۲
الانتباہ	۶۲

Scanned by CamScanner

مصنف خیر الکلام کا اعتراض	۶۶
الجواب	۶۷
ایک اور بات بھی مزیدار سُنتے جائیے	۶۸
فائدہ	۷۱
ضروری تشریح	۷۴
مسئلہ قرأۃ خلف الامام میں علامہ واحدیؒ کی سردردی اور امام رازیؒ کی حمایتِ حق میں باطل کی سرکوبی۔	۷۷
مصنف خیر الکلام کا انصات کا معنیٰ شور وغل اور کلام اور قرأۃ مشوشہ سے سکوت کرنا باطل ہے۔	۷۸
فائدہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ الآیۃ کی بعد والی آیت کریمہ کا تذکرہ	۸۱
آمدم برسرِ مطلب	۸۳
فیصلہ	۸۴
الحاصل	۹۴
الدّلیل الثانی للانصات عند قرائتہٖ	۹۵
حافظ ابنِ حجرؒ کے تساہل کا شکوہ	۹۷
علامہ بیہقیؒ کے رویّہ کی شکایت، ان کا مذہبی تعصّب اور بے جا حمایت	۱۰۵
الحاصل	۱۰۸
الانتباہ	۱۱۱
فائدہ	۱۱۴
الفائدۃ الاُولیٰ	۱۱۵
الفائدۃ الثانیۃ	۱۱۷
نتیجۃ الکلام	۱۲۰
الہدیۃ السّنیّۃ فی المکالمۃ بین قتادہؒ وشعبۃؒ	۱۲۲
فائدہ امام محمدؒ کی طرف سری نمازوں میں قرأت کی نسبت غلط ہے	۱۲۴
فائدہ حنفیہؒ کی غیبی مدد	۱۲۸
فائدہ مسلم کی حدیث وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا صحیح ہے۔	۱۲۹
فائدہ جلیلہ	۱۳۷
الانتباہ	۱۳۸
صاحبِ توضیح الکلام کی اُلٹی چال	۱۳۸
جواب	۱۴۰
الحاصل	۱۴۱
اطلاع	۱۴۳
صاحبِ توضیح الکلام کی لفظ خداج کی نافہمی	۱۴۶
الدّلیل الثالث علی منع القرأۃ خلف الامام المسمّٰی بامامۃ القرآن	۱۴۸
الحاصل	۱۴۹
الدّلیل الرابع امامت جبریل علیہ السّلام	۱۵۱
الخامس من الادلۃ امامت ابی بکرن الصدیق رضؓ	

Scanned by CamScanner

سوال ۱ اور اس کا جواب	۱۵۳	غیر مقلدین کے لیے مدرک فی الرکوع کی فاتحہ کا مسئلہ لاینحل مسئلہ	۱۷۵
سوال ۲ " " " "	۱۵۳		
سوال ۳ " " " "	۱۵۴	السادس من الادلۃ حدیث ابی بکرہ رضی اللہ عنہ	۱۷۶
سوال ۴ " " " "	۱۵۵	مصنف خیر الکلام کی طرف سے پہلی تاویل اور اس کا جواب	۱۷۷
مقام حیرت وحسرت	۱۵۶		
عذرِ گناہ بدتر از گناہ	۱۶۰	دوسری تاویل اور اسکی تردید	۱۷۸
فائدہ	۱۶۲	مصنف خیر الکلام کی بدحواسی کہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی رکعت نہیں ہوئی۔	۱۸۰
تنبیہ	۱۶۳		
غیر مقلدین کے امام بخاریؒ کے خلاف مسائل	۱۶۳	اس کی تردید پانچ وجوہات سے	۱۸۱
مصنف خیر الکلام کا تعصب میں مرجوع روایات پر عمل	۱۶۴	السابع من الادلۃ حدیث السترۃ	۱۸۳
		سُترہ کے فوائد	۱۸۴
رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرضِ وفات میں ظہر اور عشاء ابوبکرؓ کی اقتدا میں ادا کیں۔	۱۶۵	قرأت صفتِ خداوندی ہے اس لیے اس میں وحدت کا لحاظ کیا گیا۔	۱۸۵
مرض الوفات میں ایک دن صبح کی ایک رکعت آپؐ نے اقتدار میں پڑھی	۱۶۸	سترہ والی حدیث کا مصنف خیر الکلام کی طرف سے غلط جواب	۱۸۷
تنبیہ (مصنف خیر الکلام کا ابنِ ماجہ کی روایت کو رد کرنا اور اس کا رد)	۱۶۹	اور اس کا رد	۱۸۸
پہلی وجہ	۱۶۹	مصنف خیر الکلام کی طرف سے مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی عبارت سے غلط استدلال	۱۸۹
دوسری وجہ	۱۶۹	مصنف خیر الکلام کی ایک اور جہالت	۱۹۰
تیسری وجہ	۱۷۰	اعذار فاسدہ کا بیان اور تحریفِ حدیثِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم	۱۹۱
مصنف خیر الکلام کا ایک مغالطہ	۱۷۱		
متفرقات وعجائبات	۱۷۲	مقتدی کے حکماً قاری ہونے کی ایک نظیر	۱۹۳
		حاصل حدیث من کان لہ امام	۱۹۵
مقامِ حیرت	۱۷۴	الثامن من الادلۃ قرأۃ التشہد فی قیام الثالثۃ	۱۹۷

Scanned by CamScanner

التاسع من الادلۃ کون قرأۃ الفاتحۃ فی الجماعۃ کالمبالیتہ	۱۹۹	ہے۔ اصل یہ حدیث مرسل اور منقطع ہے۔	۲۱۱
العاشر من الادلۃ ترک القرأۃ خلف الامام قولہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم "من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ	۲۰۱	فائدہ۔ مصنف خیر الکلام کا حدیث من کان لہ امام کی طرف سے جواب اور اس کا رد	۲۱۲ ۲۱۲
اس کے راوی علیٰ شرط الشیخین بھی ہیں۔	۲۰۲	غیر مقلدین کے پاس فرضیتِ فاتحہ بحقِ مقتدی کی کوئی صریح اور صحیح دلیل نہیں	۲۱۲
علامہ سندھیؒ کا من کان لہ امام کو دو جملے بنانا غلط ہے۔	۲۰۴	اذا قرأ فانصتوا صحیح اور صریح روایت کے مقابلہ میں حدیث عبادہؓ ترمذی والی حسن درجہ ہونے کی وجہ معارض نہیں بن سکتی لہٰذا ساقط ہوگی۔	۲۱۳
اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی سے قرأۃ خلف الامام کی نفی پر استدلال اور اس کا رد۔	۲۰۵	صحیح مسلم کی روایت کو ترمذی کی روایت پر ترجیح ہوگی۔	۲۱۴
مقتدی بحکم شارع قاری ہے جس طرح حضرت عثمانؓ عدم شرکت کے باوجود بحکم شارع بدری ہیں۔	۲۰۷	تکملۃ البیان فی المتفرقات امام کے پیچھے ثنا پڑھنے کا قول مرجوح ہے	۲۱۴ ۲۱۴
الحاصل: مقتدی حکم شرع کی بجاآوری (استماع وانصات) میں حکماً قاری ہے۔	۲۰۸	احناف پر اس مسئلہ سے مغالطہ کا جواب سُنّتِ فجر عند قرأۃ الامام سے مغالطہ اور جواب	۲۱۵ ۲۱۷
مصنف خیر الکلام کی طرف سے حدیثِ مذکور کا ایک اور غلط معنیٰ	۲۰۹	پہلا جواب	۲۱۷
حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کی زد سے بچنے کا ایک اور طریقہ	۲۱۰	دوسرا جواب	۲۱۸
حدیث عبادۃ رضی اللہ عنہ ترمذی والی کی سند شاذ		تیسرا اور چوتھا جواب	۲۱۹
		مصنف خیر الکلام کی نافہمی یا کجروی	۲۲۰
		اس کا جواب	۲۲۱
		الحاصل اذا قرئ القرآن اور	

Scanned by CamScanner

اذا قرأ فانصتوا قضیہ مہملہ ہے جو جزئیہ کے حکم میں ہے	۲۲۲	ہوسکتا ہے بیان تغیر نہیں	۲۲۹
خلاصہ ۱: مصنف خیر الکلام کی غلط بیانی کہ قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ قرآن پڑھتے وقت کچھ اور بھی پڑھا جاتا ہے۔	۲۲۳	حدیث لاصلوٰۃ ظنی الثبوت اور ظنی الدلالۃ ہے آیت میں تغیر نہیں کرسکتی۔	۲۳۰
۲۔ دوسری وجہ تردید	۲۲۴	محمد بن اسحٰق والی روایت درجہ حسن کی ہے	
مصنف خیر الکلام کا ابن عمرؓ کو قائلین قرأت خلف الامام میں شامل کرنا، اور اس کی تردید	۲۲۴	اذا قرأ فانصتوا درجہ صحیح کی ہے لہٰذا حسن متروک ہوگی۔	۲۳۰
غلط بیانی کہ ابنِ مسعود، زید بن ثابت ابوہریرہ اور ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم قائلین میں سے ہیں۔	۲۲۵	مصنف خیر الکلام نے چالاکی سے قوم کو اندھیرے میں ڈالا ہے۔	۲۳۲
مصنف خیر الکلام کا ایک عقلی ڈھکوسلا	۲۲۵	ایک مغالطہ اور اس کا جواب	۲۳۲
اور اس کا جواب	۲۲۶	حدیث عبادہؓ متواتر نہیں	
تخصیص عام اور نسخِ حکم کا بیان	۲۲۷	حدیث عبادہؓ مقتدی کی بجائے منفرد کے بارے میں سفیانؒ بن عیینہؒ اور امام احمدؒ کا فیصلہ	۲۳۴
اور دونوں میں فرق	۲۲۸	حدیث عبادہؓ کے آخر میں فصاعدًا مازاد کی زیادتی بتاتی ہے کہ یہ مقتدی کے بارے میں نہیں۔	۲۳۵
نمبر ۱: دو آیتوں یا حدیثوں میں تعارض ہو۔ مقدم و مؤخر معلوم نہ ہو تو ان کو ملا کر توجیہ کی جائے گی۔	۲۲۸	مصنف خیر الکلام فاضل جماعت اہلِ حدیث کی الٹی چال اور اس میں ناکامی۔	۲۳۶
بہت سی عام جن میں تخصیص نہیں ان کی مثالیں	۲۲۹	آیت مکی ہے اور حدیث لاصلوٰۃ مدنی سے مغالطہ اور جواب	۲۳۶
بیان تفسیر کتاب اللہ کا خبر واحد سے		حدیث عبادہؓ مسلم کی حدیث واذا	

قرء فانصتوا سے بھی کم درجہ کی ہے۔	۲۳۷	حدیث اذا قرأ فانصتوا مسلم نے روایت کی ہے۔ سند مذکور مقدم ہے	۲۴۲
حدیث عبادہؓ کو صحابی کے مدنی ہونے کی وجہ سے بعد از ہجرت کہنا صحیح نہیں	۲۳۸	اس کی تائید ابنِ کثیرؒ سے، قاضی شوکانیؒ سے۔	
حدیث عبادہؓ کو فجر کے قصہ والی روایت کا مختصر کہنا اور اس کا رد	۲۳۸	امام نوویؒ کا فاقرأ ما تیسّر سے مراد فاتحہ لینا درست نہیں۔	۲۴۳
مولانا عبدالحیؒ کے قول سے دھوکہ کہ حنفیہ کے نزدیک خبر واحد سے تخصیص ہو سکتی ہے اور جواب	۲۳۹	واذا قرأ فانصتوا مسلم کی طرح بخاری بھی سند مذکور مقدم سے روایت کرتے ہیں جسے رواہ البخاری کہا جاتا ہے۔	۲۴۴
فجر کے واقعہ کا مختصر کہنے کا دوسرا رد	۲۳۹		
تیسرا رد			
امام بخاریؒ کی جزء القرأت کا مقام بخاری جیسا نہیں	۲۴۲		

Scanned by CamScanner

مُقدّمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ ۔

اَمَّا بَعۡدُ ؛ مذہب اسلام کے مسائل اصولاً دو حصّوں میں منقسم ہیں ۔ (۱) اصُول، (۲) فروع ۔ اصولِ دین میں اختلاف انتہائی مذموم اور قبیح ہے اور اس اختلاف کی وجہ آدمی یا تو سرے سے دین ہی سے خارج ہوجاتا ہے اور یا اہلِ حق سے کٹ اور ہٹ کر اہلِ بدعت کے فرقوں میں شامل ہوجاتا ہے اور فروعِ دین میں اختلاف اگر مجتہد سے رونما ہو تو وہ معذور بلکہ مأجور ہوگا اور اگر غیر مجتہد یہ کاروائی کرے اور اس میں تعصب مذہبی بھی شامل ہو تو وہ گنہگار ہوگا ۔ حضرات ائمہ دینؒ کے فرعی اختلافات سے جو خالص دیانت اور خلوصِ نیّت پر مبنی ہیں ۔ کتبِ فقہ ، شروحِ حدیث اور کتبِ تفسیر بھری پڑی ہیں ۔ ان اختلافی اور فروعی مسائل میں سے ایک مسئلہ قرأت یا ترک القرأت خلف الامام کا بھی ہے جو عہدِ نبوّت سے تاہنوز اختلافی چلا آرہا ہے ۔ ہر فریق اپنی علمی تحقیق پر عمل کرتا رہا ، کرتا ہے اور کرتا رہے گا ۔ مگر غیر مقلدین حضرات نے اس میں بھی نہایت غلو اور تعصّب کا مظاہرہ کیا اور تمام دُنیا کے احناف کثّرہ اللہ تعالیٰ جماعتھم کو چیلنج کیا اور ان کی نماز کو باطل بے کار اور کالعدم قرار دے کر ان کو فی النّار والسقر تک کا حکم خسروانہ سُنایا ان کے یہ باطل دعاوی اور ان کے الفاظ سبب تالیف احسن الکلام میں مذکور ہیں وہاں ہی ان کو دیکھ لیا جائے ۔ الحمد للہ تعالیٰ احسن الکلام کے مضبوط اور واضح دلائل اور حوالوں کا یہ اثر ہُوا کہ مصنف خیر الکلام اور مؤلف توضیح البیان یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ہمارا تو یہ مسلک ہے کہ فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ فروعی اختلافی ہونے کی بناء پر اجتہادی ہے پس جو شخص حتّی الامکان تحقیق کرے اور یہ سمجھے کہ فاتحہ فرض نہیں خواہ نماز جہری ہو یا سرّی ، اپنی تحقیق

پر عمل کرے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ (خیر الکلام ص۳۳ و توضیح الکلام ص۴۵) کاش کہ یہ حضرات پہلے ہی اس حق گوئی سے کام لیتے اور اپنے غالی دوستوں کو چیلنج بازی اور احناف کی صحیح نماز کے باطل بے کار اور کالعدم ہونے کے ناروا فتویٰ سے باز رکھتے تو ہمیں احسن الکلام لکھنے کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ بفضلہٖ تعالیٰ یہ احسن الکلام کے ٹھوس اور محکم دلائل ہی کا نتیجہ ہے کہ ان حضرات نے ترک القرأت خلف الامام کرنے والوں کی نماز کے باطل نہ ہونے کا اقرار کیا۔ ورنہ غیر مقلدین حضرات کبھی کھلے لفظوں میں اپنی شکستِ فاش کو تسلیم نہ کرتے اور نہ یہ ان کا شیوہ اور عادت ہے۔ اس عبارت سے یہ معلوم ہُوا کہ جن آیات اور احادیث کو وہ قرأت خلف الامام کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں وہ نصّ اور قطعیت کے ساتھ ان کے نزدیک بھی اس دعویٰ پر دال نہیں ہیں ورنہ وہ اس مسئلہ کو اجتہادی مسئلہ کبھی نہ کہتے کیونکہ اجتہاد وہاں ہوتا ہے جہاں صراحت نہ ہو اور ان حضرات کا اس مسئلہ کو اجتہادی کہنا ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صریح، صحیح اور منطوق طور پر ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے جبھی تو یہ مسئلہ ان کے نزدیک اجتہادی ہے لہٰذا آیات و احادیث کو ترک کرنے کا احناف پر الزام اور طعن بالکل بے جا ہے اس لیے کہ بقول ان حضرات کے احناف نے ان دلائل اور احادیث کو ترک نہیں کیا۔ بلکہ ان کے اس مفہوم اور معنیٰ کو ترک کیا ہے۔ جس کو مجوّزین حضرات اپنے اجتہادی رنگ میں اپناتے ہیں اور اس کے برعکس احناف نصِّ قطعی اور صریح و صحیح احادیث سے مقتدی کا وظیفہ ترک القرأت خلف الامام بتاتے ہیں جیسا کہ پیشِ نظر کتاب تدقیق الکلام میں اس کی محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ لہٰذا مصنف خیر الکلام اور مؤلف توضیح الکلام کا چند آیات و احادیث کو پیش کر کے احناف پر یہ طعن و الزام قائم کرنا کہ ہمارے پاس تو یہ یہ دلائل ہیں اور احناف ان کے قائل نہیں محض تضیعِ وقت اور سمع خراشی ہے اس لیے کہ وہ تو ان کے نزدیک بھی ان کے مدعیٰ پر نصّ قطعی نہیں۔ ورنہ وہ اس مسئلہ کو اجتہادی کبھی نہ کہتے:

؎ نکل جاتی ہو سچّی بات جس کے مُنہ سے مستی میں
فقیہہ مصلحت بین سے وہ رندِ بادہ خوار اچّھا

مؤلف توضیح الکلام کی لاعلمی اور بے خبری

موصوف لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ سے لے کر دورِ قریب کے محققین علمائے اہلِ حدیث تک کسی کی تصنیف میں یہ دعوٰی نہیں کیا گیا کہ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز باطل ہے۔ وہ بے نماز ہے وغیرہ (توضیح الکلام ص۴۳) بجائے اس کے کہ ہم طویل راستہ اختیار کریں انتصاراً اصرف دورِ حاضر کے بعض غیر مقلدین حضرات کی چند کتابوں کے حوالے ہی عرض کرتے ہیں۔ غور فرمائیں کہ انھوں نے کیا کہا؟

(۱) پہلے باب میں احادیث صحیحہ صریحہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے الحمد پڑھنا واجب ہے بغیر الحمد پڑھے اسکی نماز درست نہیں۔ (تحقیق الکلام ص۱۲ ج۲)

ظاہر بات ہے کہ جب نماز درست نہ ہُوئی تو باطل ہی ٹھہرے گی اور جب نماز نہ ہُوئی تو پڑھنے والا بے نماز ہی تصور ہوگا۔

(۲) سوال: فاتحہ خلف الامام فرض ہے یا واجب یا سُنّت یا مستحب ہے؟

الجواب: فاتحہ خلف الامام پڑھنا فرض ہے بغیر فاتحہ پڑھے ہُوئے نماز نہیں ہوتی تمام کتبِ احادیث میں مرقوم ہے۔ واللہ اعلم۔ حرّرہٗ السیّد محمد عبدالحفیظ غفرلہٗ۔ سیّد محمد نذیر حسین، سیّد محمد ابوالحسن، سیّد محمد عبدالسّلام غفرلہٗ۔ (فتاوٰی نذیریہ ص۳۹۸ ج۱ وفتاوٰی علمائے اہلِ حدیث ص۱۲۰ ج۳)

(۳) سوال: جو شخص امام کے پیچھے کسی رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھ سکا اس کی وہ رکعت ہُوئی یا نہ؟

الجواب: بغیر سورۂ فاتحہ کے رکعت پوری نہیں ہوتی۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے پس صورتِ مسئولہ میں اس شخص کی وہ رکعت نہیں ہُوئی اس کو دُہرانا چاہیئے... الخ حرّرہٗ محمد عبدالحق ملتانی، سیّد محمد نذیر حسین۔ (فتاوٰی نذیریہ ص۳۹۸ ج۱، فتاوٰی علمائے اہلِ حدیث ص۱۲۱ ج۳)

(۴) خلاصہ تمام مضمون کا یہ ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بامرِ اللہ تعالےٰ صحابہ کرامؓ کو فرمایا میرے پیچھے سورۂ فاتحہ ضرور پڑھا کرو ورنہ تمھاری نماز باطل ہو جائے گی۔ (فتاوٰی ثنائیہ ص۴۸۹ ج۱)

Scanned by CamScanner

سوال : امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کے متعلق آپ کی تحقیق از روئے قرآن و حدیث کیا ہے ؟ کیا فاتحہ کے بغیر نماز ہو جاتی ہے ؟

الجواب : مَیں سورۂ فاتحہ کو امام کے پیچھے پڑھنے کو ضروری جانتا ہوں۔ از روئے قرآن و حدیث میری تحقیق ہے کہ فاتحہ کے بغیر منفرد ہو یا مقتدی، کسی کی نماز نہیں ہوتی۔ (تفسیر ثنائی ۱۵ر جولائی ۱۹۳۸ء و فتاوٰی ثنائیہ ص ۵۵۵/۱ ج ۱)

صاف عیاں ہو گیا کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز باطل ہے، اور جب نماز نہ ہوئی تو پڑھنے والا بے نماز ہی رہا۔

(۵) سوال : سورۃ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا ان الفاظ میں ثابت کر دیا جائے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو یہ ارشاد فرمایا ہو کہ امام کے پیچھے ہر نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھا کرو ؟

جواب : کتاب القرأت بیہقیؒ ص ۴۷ میں یہ حدیث ہے لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب خلف الامام۔ یعنی جو امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے اسکی نماز نہیں لیجیے جن الفاظ کا آپ نے سوال کیا ہے۔ ان سے بھی یہ سخت ہیں کیونکہ آپ نے امر کا سوال کیا ہے اور یہاں سرے سے نماز ہی کی نفی ہے۔ (فتاوٰی اہلِ حدیث عبداللہ روپڑی ص ۱۴۲/۲ و تنظیم اہل حدیث جلد ۱۵ شمارہ ۴ بحوالہ فتاوٰی علمائے حدیث ص ۱۱۱/۳ ج ۳)

جب سرے سے نماز ہی نہ ہوئی تو پڑھنے والا بے نماز ہی رہا۔

(نوٹ) اس روایت میں خلف الامام کا جملہ بعض رواۃ کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ (ملاحظہ ہو فصل الخطاب ص ۷۹)

(۶) فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے "نہیں ہوتی نماز اس شخص کی جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے تنہا ہو یا امام یا مقتدی، بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے کسی کی کوئی نماز نہیں ہوتی، خواہ فرض ہو یا نفل ہر ایک میں سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ حکم عام ہے۔ (از مولانا عبدالسلام بستوی مدرس مدرسہ ریاض العلوم دہلی۔ اخبار اہل حدیث دہلی جلد ۹، شمارہ ۲۳)

Scanned by CamScanner

بحوالہ فتاوٰی علمائے حدیث ص۱۲۲)۔

مؤلف توضیح الکلام ہی ازروئے انصاف و دیانت (اگر ان کے نزدیک انصاف دیانت نامی کوئی چیز ہے اور اس کی ان کے ہاں قدر بھی ہے) یہ فرمائیں کہ کیا یہ تمام محققین علمائے اہلِ حدیث امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والے کو بے نماز نہیں کہہ رہے اور کیا اسکی نماز کو باطل نہیں کہہ رہے؟ یہ احسن الکلام کے محکم براہین و دلائل ہی کا نتیجہ اور اثر ہے کہ مؤلف خیر الکلام و توضیح الکلام عدم بطلان کے فیصلہ پر مجبور ہوئے ہیں۔ ورنہ غیر مقلدین حضرات کا فیصلہ اور فتوٰی یہی ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کی نماز باطل ہے اور وہ بے نماز ہیں اور بے نماز کا ٹھکانہ ہی سقر ہے۔

استاذِ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب دامت برکاتہم نے (جو تقریباً ساٹھ سال تک علومِ نقلیہ اور عقلیہ کے کامیاب مدرس رہے ہیں۔ ڈابھیل میں بھی استاد حدیث رہ چکے ہیں اور اب بھی مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ الحدیث ہیں) انوکھے اور علمی انداز میں ترک القرأت خلف الامام کے دلائل پیشِ نظر کتاب تدقیق الکلام میں بیان فرمائے ہیں۔ علمائے کرام کے لیے یہ انمول موتی ہیں اور ایسے انداز سے پیش کیے ہیں جو حقیقت کی خوب خوب گرہ کشائی کرتے ہیں اور خیر الکلام میں نقل کردہ دلائل کا باحوالہ تانا بانا بھی روشن کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر نام لے کر توضیح الکلام میں نقل کردہ دلائل کا بھی خوب تعاقب کیا ہے مگر زیادہ تر تردید خیر الکلام کے شبہات کی کی گئی ہے۔ کیونکہ توضیح الکلام، خیر الکلام کا علمی سرقہ اور اسی کا چربہ ہے۔ جب اصل کا رد ہو گیا تو فرع کا خود بخود ہو جاتا، قارئینِ کرام کو تدقیق الکلام میں بعض بعض مقامات میں تکرار بھی نظر آئے گا۔ مگر کہیں بھی تکرار فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ پڑھنے والے اہلِ علم حضرات اس کا بخوبی اندازہ لگالیں گے۔ اس مسئلہ کے جن جن گوشوں کو حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اُجاگر کیا ہے اور جن دلائل کو علمی اور تحقیقی طور پر روشن کیا ہے بلا خوف لومۃ لائم یہ کہا سکتا ہے کہ وہ انہی کا حصّہ ہے اور اسی ہی کتاب میں آپ پر وُہ عیاں ہوں گے۔ غیر مقلدین حضرات کو اس سے ناگواری تو ضرور ہو گی مگر ٹھنڈے دل سے اس کتاب کو اوّل سے آخر تک ایک بار پڑھ لیں، چھوڑیں نہیں۔

؎ رُٹھا ہے وہ مجھ سے مجھے منظور ہے لیکن
یارو اسے سمجھاؤ میرا شہر نہ چھوڑے

غیر مقلدین حضرات کے تعصّب اور خیانتوں کو تدقیق الکلام میں جس طرح نمایاں کیا گیا ہے اور ان کی علمی غلطیوں کو واشگاف کیا گیا ہے وہ اسی کتاب کا خاصہ ہے۔ عیاں راچہ بیاں مصنف خیر الکلام اور ان کے شاگردِ رشید مؤلف توضیح الکلام پر جو علمی تنقید کی گئی ہے اور ان کی سوقیانہ اور غیر عالمانہ زبان سے اغماض کیا گیا ہے وہ کتاب کی قدر و قیمت کو اور دوبالا کر دیتا ہے۔ دونوں مؤلفوں نے اپنے عوام کو اندھیرے میں رکھنے کی بے فائدہ کوشش کی ہے اور محقق اقوال کو محض تارِ عنکبوت قسم کے شبہات سے رد کرنے کی نامحمود کوشش کی ہے۔ مؤلف توضیح الکلام کا کتاب میں اکثر یہی طریقہ اور وتیرہ ہے مثال کے طور پر بعض باتیں ملاحظہ ہوں:

اوّل: حضرت امام مالکؒ مؤطا امام مالک ص۲۹ طبع مجتبائی دہلی میں الامر عندنا فرما کر یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں طے شدہ بات اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ امام کے پیچھے سرّی نمازوں میں قرأت کی جائے مگر جہری نمازوں میں نہ کی جائے۔ (محصلہ)

اس عبارت کو کاٹنے کے لیے مؤلف توضیح الکلام ص۶۵ میں تفسیر قرطبی ص۱۱۹ ج۱ کا یہ حوالہ پیش کرتے ہیں اور ایک قول امام مالکؒ کا یہ ہے کہ فاتحہ ہر رکعت میں ہر ایک کے لیے ضروری ہے... الخ اور لکھتے ہیں کہ علامہ قرطبیؒ فقہ مالکی کے مسلّمہ امام ہیں۔ ان کے کلام کو بلا دلیل رد کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

کیوں جناب؟ حضرت امام مالکؒ جو بلا اختلاف مجتہد مطلق اور مسلّم امام ہیں، اور وہ الامر عندنا فرما کر اپنا فیصلہ خود سناتے ہیں اور طبقۂ اُولیٰ کی کتاب مؤطا امام مالکؒ میں یہ موجود ہے ان کے اس فیصلہ کو ساتویں صدی کے (محمدؒ بن احمدؒ بن ابی بکر الاندلسی القرطبیؒ المتوفی ۶۷۱ھ) بقول مؤلف توضیح الکلام مسلّمہ امام کے بلا سند منقول ایک قول سے رد کرنا کون سا انصاف و دیانت ہے؟ کیا یہ اس کا مصداق نہیں کہ: ع

میں وہ جواں ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

دوم : احسن الکلام میں ہم نے حضرت امام شافعیؒ کی یہ عبارت نقل کی تھی: و نحن نقول کل صلوٰۃ صلیت خلف الامام والامام یقرأ لا یسمع فیھا قرأ فیھا (کتاب الام ص۱۵۳ ج۱) یعنی ہم کہتے ہیں کہ تمام سرّی نمازوں میں مقتدی قرأت کرے۔ (جہری میں نہ کرے)

اس کے جواب میں مصنف خیر الکلام اور مؤلف توضیح الکلام نے جو جو شگوفے چھوڑے اور پاپڑ بیلے ہیں وہ قابل دیدنی ہیں۔ (۱) یہ کہ کتاب الام کے مطبوعہ نسخوں میں یہ عبارت موجود نہیں ہے۔ معارف السنن ص۱۸۶ ج۳ میں ہے کہ یہ عبارت مطبوعہ نسخہ سے گر گئی ہے ــــ (۲) فلاں اور فلاں اور فلاں بزرگ لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ تمام نمازوں میں قرأت خلف الامام کے قائل تھے۔ (۳) کتاب الامّ کے نام سے جو مجموعہ سات جلدوں میں مطبوع ہے۔ اس میں امام شافعیؒ کے مختلف رسائل بھی آ گئے ہیں۔ یہ عبارت امام شافعیؒ کے دوسرے رسالہ اختلافِ علیؓ و عبداللہؓ کی ہے۔ جنھیں کتاب الامّ کو حصّہ شمار کرنا علم و عقل کا ماتم کرنا ہے۔ (مجملہ توضیح الکلام ص۶۵ تا ص۷۵)

الجواب : غیر مقلدین حضرات کے ان وکیلوں نے جس بہانہ سازی اور حیلہ وری کا ثبوت دیا ہے وہ صرف انہی کا خاصہ لازمہ ہے۔ ترتیب وار جوابات ملاحظہ ہوں :

(۱) مشہور تو یہی ہے کہ النقد خیر من النسیئۃِ کہ نقد ادھار سے بہتر ہے ہم نقد حوالہ بتاتے ہیں اور آپ اس کو سینہ زوری سے ٹالنے کے لیے بہانہ سازی سے کام لیتے ہیں کہ عبارت کتاب الام سے ساقط ہو گئی ہے یہ وہ معہودہ عبارت نہیں ہے جناب ! یہی وہ معہودہ عبارت ہے جس کا حضرت امام شافعیؒ نے وعدہ فرمایا ہے: لا ریب فیہ۔ جو حضرات اس کو مسقوطہ اور گری ہوئی فرماتے ہیں وہ خود وہم کا شکار ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معہودہ عبارت صلوٰۃ کے باب میں ہو گی جو جلد اوّل میں ہے مگر چونکہ یہ عبارت ساتویں جلد میں ہے اس لیے ان کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔

(۲) حضرت امام شافعیؒ کی اپنی صریح اور واضح عبارت کو چھوڑ کر دوسروں کا سہارا لینا جو قول قدیم کے چکر میں پڑ کر خود غلطی کا شکار ہیں۔ کہاں کا انصاف ہے ! حضرت امام شافعیؒ

کا مسلک سمجھنے کے لیے خود انکی اپنی عبارت ہی واضح اور کافی و وافی ہے ۔

(۳) کتاب الام متداول کتاب ہے اور تمام اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس کی سات جلدیں ہیں اس میں قطع و برید اور اختلاط کا دعوٰی کرنا بعینہٖ ایسا ہے جیسا کہ روافض قرآن کریم کے بارے یا منکرینِ حدیث کتب حدیث کے بارے کرتے ہیں لیکن ایسے لایعنی دعوٰی اور قول سے ان پر کیا زد پڑتی ؟ یا پڑسکتی ہے ؟ کتاب الام فقہ کی کتاب ہے اس میں کسی مقام پر کسی کے اختلاف کا ذکر ہے اور کسی دوسرے مقام میں کسی اور سے اختلاف کا تذکرہ آجاتا ہے ۔

خود مؤلف توضیح الکلام نقل کرتے ہیں کہ ص ۲۸۳ تا ص ۲۹۳ میں سیر الاوزاعیؒ اختلاف علیؓ و عبداللہؓ ، اختلاف العراقینؒ اور اختلاف مالکؒ و شافعیؒ کے مباحث ہیں (محصلہ توضیح الکلام ص ۱۷) علاوہ ازیں ذیل کے حوالے بھی ملاحظہ کریں :

(۱) کتاب الام ص ۶۳ ج ۴ میں ہے باب فی العُمریٰ من کتاب اختلاف مالک والشافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہما ۔

(۲) ص ۶۹ ج ۴ میں ہے : وفی اختلاف مالکؒ والشافعیؒ اللقطة

(۳) ص ۷۰ ج ۴ میں ہے وترجم فی کتاب اختلاف علی وابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما ۔

(۴) ص ۷۱ ج ۴ میں ہے وترجم فی اختلاف مالکؒ والشافعیؒ باب المنبوذ وغیر ذٰلک ۔

کیا ہر مقام پر یہ ناروا دعوٰی کیا جائے گا کہ کتاب الام میں ان کے مختلف رسائل کا اختلاط ہو گیا ہے اس لیے کتاب الام قابلِ اعتبار نہیں ؟ حاشا و کلاّ کہ کسی بھی ذی علم کے ذہن میں یہ شیطانی وسوسہ آتا ہو سبھی ہی جانتے ہیں کہ کتاب الام حضرت امام شافعیؒ کی اپنی تالیف ہے اور اس میں درج شدہ تمام مسائل کتاب الام ہی کے ہیں ایسی لایعنی باتوں سے نہ تو روافض قرآن کریم پر سے اعتماد اُٹھا سکے ہیں اور نہ منکرینِ حدیث کتبِ حدیث سے اور نہ غیر مقلدین کتبِ فقہ اور کتاب الام پر سے اعتبار اٹھا سکتے

ہیں اور نہ کوئی ایسی بیہودہ گوئی کو تسلیم کرتا ہے۔ وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ۔ اللہ تعالیٰ سب کو سمجھ عطا فرمائے۔

؎ دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نُور نہیں

سوم : مؤلف توضیح الکلام ص۵۴ میں خود امام محمدؒ کی اپنی کتاب مؤطا ص۹۴ اور کتاب الآثار ص۱۶۴ کے حوالہ سے ان کا یہ مسلک نقل کرتے ہیں لَا قرأۃ خلف الامام فیما یجھر فیہ ولا فیما لم یجھر وھو قول ابی حنیفۃؒ اور معنیٰ یہ کرتے ہیں "امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیئے خواہ امام بآواز بلند قرأت کرتا ہو یا آہستہ امام ابوحنیفہؒ کا یہی قول ہے"۔

اس کے بعد مؤلف توضیح الکلام نے ص۵۴ تا ص۶۴ تک متعدد حضرات کے حوالے درج کیے ہیں اور آخر میں لکھا ہے ص۶۴ کہ امام محمدؒ (بلکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی) سرّی نمازوں میں فاتحہ پڑھنا مستحسن اور جائز کہتے ہیں۔ (ملخصاً) مگر یہ صرف دفع الوقتی اور مغالطہ آفرینی ہے کیونکہ جب حضرت امام محمدؒ جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست شاگرد ہیں اور خود اپنی کتابوں میں ببانگِ دُہل واشگاف الفاظ میں اپنا اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا یہی مسلک بتاتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے نہ تو جہری نمازوں میں قرأت ہے اور نہ سرّی نمازوں میں۔ تو ان کے اپنے قول اور ارشاد کے مقابلہ میں فلاں نے یہ کہا اور فلاں نے یہ کہا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ تمام عقل مند اس کے قائل ہیں کہ توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہٗ ناپسندیدہ امر ہے اور مشہور ہے کہ صاحب البیت ادریٰ بما فیہ۔

غرضیکہ مؤلف توضیح الکلام اور ان کے استادِ محترم شیخ الحدیث گرامی قدر نے آیات اور صحیح وصریح احادیث اور اقوال راجح کو تعصّب کی بناء پر ترک کے محتمل معانی ضعیف اور غیر صریح احادیث اور اقوالِ مرجوحہ پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے اور بلا وجہ غیر متعلق حوالے اور اقوال درج کر کر کے اپنے حواریوں کو یہ باور کرانے کے درپے ہیں کہ ہم بھی

Scanned by CamScanner

دلائل سے لیس ہیں۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ کتاب تدقیق الکلام کو پڑھنے والے قوی وضعیف دلائل اور راجح ومرجوح اقوال کا اچھی طرح سے موازنہ کرسکیں گے اور مسئلہ قرأت خلف الامام کی پوری حقیقت انشاء اللہ العزیز ان پر منکشف ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الحدیث دام مجدھم مؤلف تدقیق الکلام کو اُمّتِ مسلمہ کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے خالص علمی اور تحقیقی انداز میں مسئلہ کی حقیقت واضح کی ہے اور اس کتاب کو اللہ تعالیٰ علمأ کے لیے استفادہ کا ذریعہ اور موصوف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین ثم آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ وسلّم علیٰ خاتم الانبیآء والمرسلین وعلیھم وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وازواجہٖ واتباعہٖ الیٰ یوم الدّین۔

احقر العباد

ابوالزاہد محمد سرفراز

صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ وخطیب مرکزی جامع مسجد گکھڑ

۲، ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

۱۳، نومبر ۱۹۸۸ء

Scanned by CamScanner

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ

اَمَّا بعد !

امام کے پیچھے فاتحہ خوانی اور اس میں خاصی پریشانی اور سرگردانی

کچھ عرصہ ہُوا ایک شخص آیا کہ ایک اہلِ حدیث کہتا ہے کہ ہماری فاتحہ خوانی کی دلیل تو صحیح بخاری میں ہے ! کیا ہماری بھی کوئی دلیل ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھی جائے ؟ میں نے کہا کہ ہماری دلیل تو قرآن کریم میں آئی ہوئی ہے اور حدیثِ صحیح میں بھی صریح آئی ہوئی ہے ان کی دلیل بخاری والی بحق مقتدی صریح نہیں اور جو روایات مقتدی کے بارہ میں صاف اور صریح ہیں وہ صحیح نہیں ہیں ۔ اگرچہ بعض بزورِ زبان صحیح کہہ بھی دیتے ہیں ۔ جن کی تفصیل اپنے موقع پر انشاء اللہ تعالیٰ آنے والی ہے ۔ میں فی الحال ابتدائی چند تمہیدی باتیں عرض کرتا ہوں ۔ قرآن کریم کی قرأت اور سماعت کے بارے میں کچھ ہدایات کلامِ الٰہی میں منصوص ہیں ۔ ابتداء میں حضرت جبرائیل امین علیہ السّلام جب تشریف لاتے اور حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو وحی الٰہی سُناتے تو آپؐ سنتے ہوئے زبان سے آہستہ آہستہ پڑھتے بھی جاتے ۔ سننا اور پڑھنا بیک وقت گراں بھی تھا لیکن آپ اس لیے پڑھتے تھے کہ کلامِ الٰہی دل میں محفوظ ہو جائے جو آئندہ لوگوں کو پہنچانا ہے ۔ ممکن ہے کہ قلبی داعیہ محبتِ کلامِ الٰہی بھی کارفرما ہو ۔ لیکن آیتِ کریمہ اوّل صورت کا تذکرہ کر رہی ہے ۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ ہمارے

ذمہ ہے اس کا آپؐ کے قلب مبارک میں جمع کر دینا اور پھر اس کو زبان سے پڑھا دینا آپ اس کے چھوٹ جانے کا اندیشہ نہ کریں۔ حضرت جبریل علیہ السّلام کے پڑھنے کے وقت آپ نہایت خاموشی سے سُنیں، نہ زبان کو حرکت دیں نہ ہونٹ ہلائیں۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اور فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ اتبع کا معنی حضرت ابنِ عباسؓ نے اِسْتَمِعْ وَاَنْصِتْ سے کیا ہے اس کے بعد آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہایت خاموشی سے سُنتے ہی تھے جب جبریل علیہ السّلام واپس ہو جاتے تو آپؐ اس کلام کو پڑھا کرتے تھے۔ فَاِذَا ذَهَبَ قَرَاَهٗ۔

(بالمعنیٰ بخاری ص۳ و مسلم ص۱۸۴ ج ۱)

فائدہ: ایک حکم کی متعدد حکمتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ آپؐ کو خاموشی کا حکم دیا گیا کہ قرآن حکیم سُنتے وقت خود نہ پڑھا کریں۔ ایک[۱] اس میں مشقت کا رفع کرنا بھی مطلوب ہے کہ بیک وقت دو کاموں کا سرانجام دینا گراں بھی ہوتا ہے اور دوسرا[۲] خوف اس چھوٹ جانے کا بھی نہ کریں بلکہ ہم آپؐ کے قلبِ مبارک میں اس کو محفوظ کر دیں گے آپؐ جب پڑھنا چاہیں گے ہم پڑھا دیں گے۔ تیسری[۳] بات کہ کلامِ خداوندی کا ادب اور احترام بھی اسی بات میں ہے کہ نہایت ہی توجّہ سے سُنا جائے اس میں تدبّر اور تفکّر کیا جائے اس وقت دوسری طرف توجّہ نہ کی جائے بلکہ ہر ذی عزّت و عظمت کے کلام کا یہی حق ہے۔ بے التفاتی سے سُننا ایک طرح کی بے حرمتی کی علامت ہے۔ مشہور مفسّر حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ اسی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ امرہ اللہ تعالیٰ بالانصات عند تلاوتہٖ اعظامًا واجلالًا (الیٰ) ویتأکد ذٰلك فی الصلوٰۃ ... الخ (تفسیر ابن کثیر ص۲۸۰ ج۲) یعنی خارج از نماز قرآن کریم کی تلاوت اور سماعت کا حق یہی ہے کہ نہایت سکونِ قلبی اور توجہ کامل سے سُنے اور نماز میں تو اور بھی یہ حکم مؤکد بن جاتا ہے۔ اسی میں تلاوتِ کلامِ الٰہی کا اعزاز و احترام پایا جاتا ہے اور یہی بات حضرت امام رازیؒ نے تفسیر کبیر ص۳۴۱ ج۴ میں فرمائی ہے، جس کا تذکرہ عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ آنے والا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سنتے ہوئے قرأت کرنا استماع مامور کے خلاف ہے کیونکہ بظاہر اس میں کلام الٰہی کی بے حرمتی پائی جاتی

ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ھل قرأ معی احد منکم انکار و استکراہ کے انداز میں جو فرمایا تھا اس کا منشا یہی استماع واجب کے حق میں قصور کرنا تھا جو موجبِ کراہۃ ہُوا تھا۔ اس سے قراءۃ خلف الامام عند قرأۃ الامام کی چونکہ ممانعت نکلتی ہے اس لیے بعض غیر مقلدین حضرات نے اس تیسری وجہ کو نظر انداز کرنے کی سعیِ نامشکور کی اور بے معنیٰ باتوں سے اسے ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ تفصیل بیان کرنے میں طول ہوگا۔

الغرض قرآن کریم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اِذَا قَرَأَ اَنْصِتْ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ کا حکم دیا جس کی حضرت ابنِ عباس رضؓ نے اِسْتَمِعْ وَاَنْصِتْ سے تفسیر فرمائی۔ غالباً انھوں نے یہ معنی اس عمومی ضابطہ سے لیا ہے جو فرمانِ خداوندی ہے۔ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا اور بعض حضرات محققین رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کا معنی یہ کیا: لا تکون قراءتك مع قراءته بل متأخرة عنه جیسے کہ حواشی بخاری ص۳ میں مذکور ہے۔ یعنی حضرت جبریل امین علیہ السلام کی قرأت کے وقت آپؐ قرأت نہ کیا کریں۔ خالص خاموشی سے سُنا کریں۔ یہی الفاظ سورۃ الاعراف والی آیتِ کریمہ میں ہیں اور خطاب بصیغہ جمع ہے اور اصل نزول اس کا مقتدی اور امام کے حکم میں ہے تو اس طرح مقتدیوں کو حکم ہُوا کہ امام کی قرأت کے وقت تم صرف سُننے پر اکتفار کرو۔ اس کے ساتھ پڑھا نہ کرو نہ زبان کو حرکت ہو نہ ہونٹ ہلیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عند قراءۃ جبریل علیہ السلام مخفی انداز کی قرأت کرتے تھے مگر اس سے بھی رد کے گئے۔ اسی طرح مقتدیوں کو بھی کرنا چاہیئے۔ یہ کہنا کہ مقتدی کو اونچی قرأت سے منع کیا گیا ہے غلط ہے۔ کیونکہ یہی لفظ استمع وانصت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں فرما رہے ہیں اور مقصود آپ کو سابقہ انداز کی قرأت سے ممانعت ہے۔ اور وہ خفیہ انداز کی قرأت ہی تھی جس میں صرف ہونٹ ہلتے تھے۔ زبان حرکت کرتی تھی آواز پیدا نہ ہوتی تھی فرمایا: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ مقتدیوں کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا۔ اسی کو دیکھتے ہوئے

Scanned by CamScanner

انکاری لہجہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: لعلکم تقرؤن خلف امامکم آپ کا یہ انکار نفسِ قرأۃ پر ہے۔ اسی کو سمجھتے ہوئے لوگوں نے یعنی حضرات صحابہ کرامؓ نے خلف الامام پڑھنا بند کر دیا۔ فانتھی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ترمذی شریف ص۷۲ کی حدیث میں ہے اسی کو دیکھتے ہوئے امام ترمذیؒ فرماتے ہیں واختار اھل الحدیث ان لا یقرأ الرجل مع الامام اِذا جھر الامام بالقرأۃ یہ مطلب انھوں نے فانتھی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح جانتے ہوئے اور موافق حال دیکھتے ہوئے اختیار کیا ہے۔ خواہ یہ فرمان حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہو جیسے کہ روایت میں مروی ہے۔ یا یہ حضرت امام زہریؒ کا مقولہ بنایا جائے جیسے کہ ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے بیان میں ہے کیونکہ حضرت امام زہریؒ نے کثیر التعداد حضرات صحابہ کرامؓ کو دیکھا اور ان کا یہی عمل دیکھنے میں آیا۔ اسی کو مدّنظر رکھتے ہوئے حضرات محدثینِ کریمؒ نے مقتدی کو امام کے ساتھ پڑھنے کی اجازت نہیں دی بلکہ امام کے سکتات میں پڑھنا تجویز کیا ہے جیسے ترمذی میں ہے مگر افسوس کہ موجودہ دور کے اہل حدیث کہلانے والے حضرات کیا عوام اور کیا خواص سب نے الٹی چال ہی اپنائی۔ سب ساتھ ہی پڑھا کرتے ہیں۔ کیونکہ سکتوں میں پڑھنا جو بتایا گیا اس کا کرنا بڑا مشکل ہے جس کا مفصّل تذکرہ انشاء اللہ تعالیٰ اپنے موقع پر آئے گا۔ لیکن اگر کوئی علمی ذمہ داری کو ملحوظ رکھے تو ساتھ پڑھنا جیسے ان کا معمول ہے وہ اس سے بھی زیادہ دشوار ہے اور خطرناک ہے آنکھیں بند کر کے چلنا اور بات ہے لیکن منصف مزاج باحواس شخص اس راستہ کو نہیں اپنائے گا۔ حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اس کو چھوڑنا ہی پسند کر رہے ہیں۔ جب امام ترمذیؒ نے تصریحاً فرمایا: احتیاط اسی کو کہتے ہیں۔ تھوڑے نفع کے لیے مزید نقصان کرنا دانشمندی نہیں۔ لیکن یہ حضرات اہلِ حدیث آج کل کے نام والے لامذہب لوگ ہیں یہ وہ اہلِ حدیث نہیں ہیں جن کا ذکر کتابوں میں آتا ہے اسی لیے میں اُن ہی کو حضرات محدثینِ کرامؒ کے نام سے یاد کرنا بہتر جانتا ہوں اور اِن کو نام نہاد اہلِ حدیث کہتا ہوں تاکہ التباس نہ پڑے۔ یہ انگریزی

Scanned by CamScanner

دور کے اہلِ حدیث امام کے ساتھ ساتھ ہی پڑھا کرتے ہیں۔ ہاں لکھنے میں متعدد مختلف تجاویز پیش کر دیتے ہیں۔ اور حنفیوں کے بالمقابل سب پر صاد کر دیتے ہیں لیکن ان کا اپنا عمل معیت کا ہی ہے۔ اس وقت ہماری گفتگو انہی کے رویّہ کی تردید میں ہے۔ اگرچہ ضمناً اور راستوں کی دشواریاں بھی آپ کے پیش نظر لائی جائیں گی۔ یہ سب باتیں تمہیدی گزارشات ہیں۔ ہر ایک کی پوری تفصیل مالہٗ وماعلیہ حسبِ موقع انشاء اللہ تعالیٰ کی جائے گی واللہُ المستعان وعلیہ التکلان۔ وھوحسبی ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

بعض ضروری باتوں کا تذکرہ

قبل اس کے کہ فاتحہ خلف الامام پڑھنے یا اس کی ممانعت کے دلائل بیان کروں یا ان کی قوۃ اور ضعف کا تذکرہ کروں کچھ اور باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ حقیقتِ حال آپ کے سامنے آجائے بعض لوگ ناواقفیت کی وجہ سے مغالطہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یا جانتے ہوئے دوسروں کو دھوکہ میں ڈال رہے ہیں۔ غور فرمائیں کہ نماز جملہ عبادات سے افضل اور اہم ہے اس کو عماد الدین کہا گیا ہے۔ یہ سب سے اوّل فرض کی گئی ہے۔ جماعت سے پڑھنے کی تاکید اور نہ پڑھنے کی شدید وعید کی گئی ہے۔ مشکوٰۃ صـ۹۳ کی روایت میں فرمایا: اول مانزل جبریل علّمہ الوضوء والصّلوٰۃ۔ اوکما قال۔ یعنی جبریل علیہ السّلام نے بالکل ابتدائی زمانۂ نزول میں آپ کو وضوٗ کا طریقہ اور نماز پڑھنے کا عمل سکھایا اور بتایا۔ اگرچہ آیتِ وضوٗ اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ۔ الآیۃ۔ بعد الہجرۃ مدینہ شریف میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن حکم اس کا پہلے سے مشروع چلا آرہا تھا۔ ہجرت سے قبل تیرہ سال مکّی زندگی میں آپ نے نمازیں پڑھیں ہیں وہ سب وضوٗ کر کے پڑھی گئی ہیں۔ ایسی جگہ آیت کا نزول تقریرِ حکم کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ محکم ہو جائے۔ بلکہ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءِ زمانہ نبوت میں جب کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر وحی کا نزول شروع ہوا اس وقت

Scanned by CamScanner

جنات کو آسمان پر جانے سے منع کیا گیا۔ انھوں نے اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے زمین پر تلاش شروع کی تو دیکھا کہ بطنِ نخلہ کے مقام میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مع جماعتِ صحابہ کرامؓ صبح کی نماز باجماعت ادا فرما رہے تھے۔ جنّات نے سُن کر سمجھ لیا کہ ہم پر پابندی کا یہی سبب ہے اور اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا کہہ کر وہ ایمان لائے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ وضوٗ کرنا بلکہ جماعت سے نماز ادا کرنا بھی ابتدار زمانۂ نبوت سے مشروع چلے آرہے تھے۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ نفلی نماز تھی اگر یہ نفلی بھی ہو تو بھی یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ صبح اور عصر کی دو نمازیں اوّل سے پڑھی جاتی تھیں ہاں پانچ ہونا بعد میں ہُوا۔ کچھ بھی ہو جماعت سے صبح کی نماز کی ادائیگی اس حدیث سے معلوم ہوئی اور وضوٗ کا نماز کے لیے شرط ہونا بھی سب ہی جانتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ آیتِ وضوٗ کی اگرچہ بعد از ہجرت مدینہ طیبہ میں نازل ہُوئی لیکن حکم وضوٗ کا ابتدار زمانۂ نبوت سے ہے اس لیے اس آیت کو تقریرِ حکم کے لیے نازل ہونا کہا جاتا ہے اس کے اور نظائر بھی ہیں فی الحال ہمیں اور بات کرنی ہے۔

جماعت اہلِ حدیث کے دینی راہنماؤں کی علمی لیاقت کا اندازہ لگائیے اور جماعت والوں کو اس پر مبارکباد بھی پیش کیجئے کہ انھوں نے ان ھٰذا العلم دین فانظروا عمن تأخذون دینکم جو روایت مسلم کے مطابق امام ابنِ سیرین رحمۃ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے کی ذمہ داری کیسے پوری کی۔ حضرات حنفیہ کرامؒ نے لکھا ہے کہ قرأت خلف الامام کی ممانعت پر آیتِ کریمہ سورۃ الاعراف والی وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا شہادت دیتی ہے تو ایک فاضل اہلِ حدیث نے فتاوٰے اولیاء کرامؒ کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور اس میں جلی عنوان سے حنفیہؒ کے خلاف لکھا کہ بیٹا باپ سے پہلے ہُوا اور دلیل میں انھوں نے یہ لکھا کہ جماعت تو وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ سے شروع ہُوئی جو مدنی آیت ہے اور بعد از ہجرت نازل ہُوئی اور حنفیہؒ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ والی مکی آیت کو جو قبل از ہجرت نازل ہُوئی ہے جماعت کے بارے میں نازل ہونا بتاتے ہیں۔ یعنی جماعت کا مسئلہ تو وَارْکَعُوْا

Scanned by CamScanner

مَعَ الرّٰکِعِیْنَ سے مدینہ جاکر پیدا ہُوا۔ اور وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ والی آیتِ کریمہ جو سات آٹھ سال قبل کی نازل شدہ ہے اگر اس کو جماعت کے لیے نازل ہونا تسلیم کیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ بیٹا باپ سے سات آٹھ سال قبل پیدا ہوا۔ نعوذ باللہ تعالیٰ ان من العلم لجھلاً۔ اسی کو کہتے ہیں کسی نے کیا اچھا کہا ہے:

ہر آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند

در جہل مرکب ابد الدھر بماند

بلکہ مزید لکھا کہ وَاِذَ قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کے نزول کے وقت تو پنجگانہ نمازیں بھی نہ تھیں وہ تو شبِ معراج میں فرض ہُوئیں جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں ہے جو مکی سورۃ ہے اور بلحاظِ نزول پچاس ۵۰ نمبر پر ہے۔ جماعت اہلِ حدیث والے شاید خوش ہو گئے ہوں اور ممکن ہے اس فاضل مؤلف کو کچھ انعام بھی دیا ہو کہ چلو حنفیہ کے خلاف الزام تراشی تو ہو گئی وَذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ کا منظر آپ کو خوب نظر آئے گا۔ فاضل جماعت اہل حدیث مولوی صاحب لکھتے ہیں: کہ جماعت کا مسئلہ تو وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ سے پیدا ہُوا جو بعد از ہجرت کی نازل شدہ آیت ہے۔ اللہ پاک نے ان کو اتنی توفیق نہ دی کہ ترمذی شریف ص ۲۱/۱ کو اٹھا کر دیکھتے کہ معراج کی رات جو قبل از ہجرت گزری اس سے اگلے روز ہی ظہر کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھائی۔ ایک دن رات اوّل اوّل وقت میں اور دوسرے روز آخری اوقات میں، آپ نے فرمایا اُمِّنِی جبرئیل عند البیت مرتین کیا یہ جماعت وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کی آیت سے پہلے ہے یا نہیں۔ آپ کے قول کے مطابق بیٹا باپ سے پہلے ہوا یا نہیں۔ مشہور ہے کہ: "دروغ گو حافظہ نہ باشد" آپ نے باپ بیٹے کو پہچانا ہی نہیں۔ آپ نے بیٹے کو جس باپ کی طرف منسوب کیا ہے، وہ باپ ہے ہی نہیں۔ اگر انسانوں میں ایسی حرکت کی جاتی تو حدّ قذف لگائی جاتی یا

کم از کم بدزبانی اور فحش کلامی کی تغلیط و تردید تو ضرور کی جاتی ۔ جیسے زبان سے انسان پکڑا جاتا ہے ۔ قلم سے بھی عزت خطرہ میں پڑ جاتی ہے ۔ اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ آپ کا کہنا کہ جماعت امامت وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کے نزول کے بعد کی باتیں ہیں ۔ قطعاً غلط اور جھوٹ ہے ۔ جماعتِ اوّل زمانۂ نبوت سے مشروع چلی آتی ہے دیکھیے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آیتِ کریمہ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ جو سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ہے یہ مکہ شریف میں نازل ہوئی ۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز میں قرأت ذرا اونچی کرتے تھے تاکہ کفار بھی اسے سنیں ۔ شاید کسی کو ہدایت نصیب ہو جائے لیکن کفار الٹا اثر لیتے ، زبان سے بدزبانی کرتے اس پر حکم ہوا کہ آپ اتنا اونچا نہ پڑھا کریں کہ دُور والے بھی سنیں اور اتنا آہستہ بھی نہ ہو کہ پاس والے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین شریکِ جماعت بھی نہ سن سکیں ۔ درمیانے انداز کی قرأت کیا کیجئے ۔ حدیث شریف کے الفاظ دیکھیے : عن ابن عباس (رضی اللہ عنہما) فی قولہ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا نزلت بمکۃ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختف بمکۃ وکان اِذا صلّٰی باصحابہ رفع صوتہ بالقرآن وکان المشرکون اِذا سمعوا القرآن شتموہ ومن انزلہ ومن جاء بہ فقال اللہ لنبیہ لا تجھر بصلاتک ای بقراءتک ۔ (ترمذی ۔ حدیث حسن صحیح ص ۴۴۹) یعنی اتنا اونچا نہ پڑھا کرو کہ مشرک برہم ہوں ۔ یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ متعدد حدیث کی کتابوں میں مروی ہے ۔ بخاری ص ۶۸۶ × ۱۱۱۶ ، مسلم شریف ص ۱۸۳ ، ترمذی ص ۴۴۹ ، نسائی ص ۱۱۶ وغیرہ ۔ کیا آپ کے قول کے مطابق یہ جماعت اور امامت جو قبل از ہجرۃ مکّہ شریف میں ہوئی وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ سے پہلے نہیں ہے ؟ کیا بیٹا باپ سے پہلے نہ ہوا ؟ آپ کو باپ بیٹے کی تمیز ہی نہیں ۔ اگرچہ یہ دو گواہ عادل کافی شافی ہیں ۔

۱ امامۃ جبریل عند البیت ، ۲ اور آپ ؐ کی صلوٰۃ باصحابہ ۔ جیسے ابھی

بیان گزرا لیکن مزید طمانینت کے لیے عرض کرتا ہوں : بخاری ص۱۰۶ اور ترمذی شریف ص۲۴۶ میں وہی واقعہ ہے جو گزشتہ بیان کیا گیا۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں وھو بنخلۃ عامدًا إلیٰ سوق عکاظ وھو یصلی باصحابہ صلوٰۃ الفجر۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقام نخلہ میں تھے اور عکاظ کے بازار کو جانا چاہتے تھے اور اس وقت صبح کی نماز باجماعت حضرات صحابہ کرامؓ کو پڑھا رہے تھے یہ فجر کی نماز باجماعت ابتداء زمانۂ نبوت کی تھی اسی کو علامہ نوویؒ نے شرح مسلم ص۱۸۴ میں فرمایا : حدیث ابنِ عباسؓ فی اوّل الامر۔ اوّل النبوۃ یعنی حضرت ابنِ عباسؓ کی یہ حدیث زمانۂ نبوت کے ابتدائی دنوں کے بارے میں ہے۔ پھر ص۱۸۴ پر فرمایا : فیہ الجھر بالقرأۃ فی الصبح وفیہ صلوٰۃ الجماعۃ وانھا مشروعۃ فی السفر وانھا کانت مشروعۃ من اوّل النبوّۃ۔ یعنی اس حدیث میں صبح کی نماز باجماعت کا ذکر ہے اور قرأۃ بھی جہر سے کی گئی ہے اور جماعت سے نماز کی ادائیگی ابتداء زمانۂ نبوت سے مشروع ہے۔ دیکھئے فاضل اہلِ حدیث کہتے ہیں کہ جماعت اور امامت کا مسئلہ تو وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ مدنی بعد الہجرۃ کی آیت سے پیدا ہوا ہے۔ کیا یہ تیرہ سال قبل از ہجرت ابتداء زمانہ نبوت کا واقعہ نہیں۔ آپ کے قول کے مطابق بیٹا باپ سے تیرہ چودہ سال پہلے پیدا ہو گیا یا نہیں ؟ حدیث کی کتابوں کی خبر نہ ہوتے ہوئے بھی آپ اہلِ حدیث بنتے ہیں۔ اسی کو میں نے کہا تھا کہ ان کا نام اہلِ حدیث اسی طرح ہے جیسے ایک قوم اپنا نام اہلِ قرآن رکھتی ہے نہ وہ اہلِ قرآن ہیں نہ یہ اہلِ حدیث۔ آپ نے ابھی دیکھا : یہ صرف قومی نام ہے گزشتہ میں نے ترمذی سے نقل کیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں : واختار اھل الحدیث ان لا یقرأ الرجل مع الامام اذا جھر الامام بالقرأۃ بل یتبع سکتات الامر۔ یہ آج کل کے اہلِ حدیث وہ اہلِ حدیث نہیں ہیں یہ تو امام کے ساتھ ہی پڑھا کرتے ہیں۔ ان کا رویہ احنافؒ کے ساتھ ضد کرنا اور ہٹ دھرمی کرنا ہی ہے۔ (اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ) ہاں اگر یہ کہا جائے کہ نماز کی جماعت سے ادائیگی کا اشارہ اس آیتِ کریمہ وَارْكَعُوا

مَعَ الرّٰاکِعِیْنَ میں ہے تو یہ ٹھیک ہے لیکن یہ کہنا کہ جماعت سے ادائیگی اس سے ہی مشروع ہوئی تو یہ غلط ہے جیسے آپ نے دیکھا کہ وضوٗ کا کرنا ابتداءِ زمانہ نبوت سے چلا آتا ہے کوئی نماز بلا وضوٗ نہیں پڑھی گئی حالانکہ وضوٗ کی آیت کریمہ اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ ۔ (الآیۃ) مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی جیسے یہاں باپ، بیٹا بنانا جہالت ہے۔ اسی طرح جماعت سے ادائیگی کا حکم وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰاکِعِیْنَ سے جوڑنا خالص جہالت اور نادانی ہے۔

قرآن کریم نے امام کا وظیفہ قرأت بتا کر اس کی تحدید بھی کی ہے

آپ گزشتہ آیتِ کریمہ لَا تَجْھَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِھَا کے شانِ نزول سے معلوم کر چکے ہیں کہ اس میں امام کو ہدایت کی گئی ہے کہ مزید اونچی آواز سے قرأت نہ کرے۔ درمیانے درجے کی آواز ہونی چاہیئے۔ اس سے ایک شبہ کا ازالہ بھی ہو گیا کہ لَا تَجْھَرْ میں جہر سے منع کیا گیا ہے تو مغرب، عشاء اور فجر وغیرہ جہری نمازوں میں امام جہر سے قرأۃ کیوں کرتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ منفی زیادہ اونچی آواز سے قرأۃ کرنا ہے نفس جہر سے منع نہیں کیا گیا۔ اسی لیے مسلم شریف ص ۱۸۳ ج ۱ کی روایت میں وَلَا تجھر ذلك الجھر مروی ہے یعنی وہ جہر نہ کریں جو بضرورت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کیا کرتے تھے کہ کفار بھی سُن لیں اور شاید نفع ہو جائے، اور مروج جہر فقہی جہر ہے یہ بین ذٰلك کے اقسام سے ہے جو کہ وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا کا مفہوم ہے وَلَا تخافِت بھا عن اصحابک سے مراد یہی ہے کہ اتنا اونچا پڑھیں کہ آپ کے ساتھ والے شریکِ جماعت لوگ سُن لیں۔ بہر حال امام کا وظیفہ جہر سے قرأۃ کرنا آیتِ کریمہ نے بیان کیا اور مقدار جہر بھی بیان کر دی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہ۔

قرأت خلف الامام کا مسئلہ اور قرآن کریم میں اس کا تذکرہ

گزشتہ گزر چکا کہ نماز سب عبادات سے اہم ہے۔ قیامت کے دن مسلمان سے

حقوق اللہ کے بارے سب سے پہلے اسی کی پرسش ہوگی۔ نماز میں قرأت کرنا فرض ہے حضراتِ شافعیہ رحمہم اللہ تعالیٰ اور اہلِ حدیث ہونے کے مدعی خاص طور پر فاتحہ کا پڑھنا بھی فرض کہتے ہیں۔ امام اور منفرد تو فاتحہ پڑھا ہی کرتے ہیں کیا مقتدی پر بھی اس کا پڑھنا واجب اور فرض ہے یا نہیں؟ بلکہ اس کا وظیفہ امام کے پیچھے خاموش رہنا ہے اور امام کی قرأت کی طرف کان لگانا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ اہل حدیث اس کا پڑھنا فرض کہتے ہیں جیسے کہ توضیح الکلام میں بھی یہ جا بجا موجود ہے، اور حنفیہ مقتدی کو قرأت سے منع کرتے ہیں۔ اور اسے خاموشی سے سننے کا حکم دیتے ہیں۔

فیصلہ: ایسے اختلافی موقع میں سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ مقتدی کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ ایک امام کے پیچھے کبھی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اور لاکھوں تک مقتدی ہوتے ہیں۔ اسی کی اتباع میں نماز ادا کرتے ہیں۔ روزمرّہ پانچ اوقات میں جماعت ادا کی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے نکاح اور طلاق تک کے مسائل بیان کیے ہیں جو کبھی کبھی وقوع پذیر ہوتے ہیں اور وہ فرض واجب بھی نہیں ہیں۔ ان حالات میں مقتدی کا مسئلہ ضرور قابلِ ذکر بن جاتا ہے۔ **مخلص!** حضرات ائمہ حنفیہ کثرہم اللہ تعالیٰ تو اس بارے میں آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ (الاعراف) پیش کرتے ہیں کہ اس کا نزول ہی جماعت کے بارے میں ہے اور اصل بالذات و مقصود اس میں مقتدی کا مسئلہ ہی ہے کہ وہ امام کی قرأت کے وقت خاموش رہے، لیکن فریقِ ثانی نے اس سے پہلوتہی کی اور مختلف حیلے بہانے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق بنائے جیسے کہ صاحبِ توضیح الکلام نے بھی صـ ۱۱۱ پر کیے ہیں۔ بعض جاہل یا کم علم لوگوں نے تو ضد اور عناد میں یہاں تک کہہ دیا کہ اس آیت میں تو قرآن سنتے وقت خاموشی کا حکم دیا گیا ہے۔ فاتحہ تو قرآن ہی نہیں۔ کیونکہ بزبانِ عوام قرآن کے تیس پارے ہیں۔ اوّل پارہ الٓمٓ سے شروع ہوتا ہے۔ فاتحہ تو اس سے پہلے ہے۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ ان کی اس جہالت پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ ہمارے سامنے ایک غیر مقلد نے بڑے اصرار اور دیدہ دلیری سے یہ بات کہی خدا جانے کس غلط کار انسان نے اس کو

یہ پٹی پڑھائی ہے یا ابلیس کی شاگردی سے اس کو یہ الہام ہوا ہے۔ نعوذ باللہ تعالیٰ۔ مَیں نے اس کو کہا کہ ہم تو ایسے شخص کو جو سورۃ فاتحہ کو قرآن نہ کہے کافر کہتے ہیں۔ اس کو تو اعظم سورۃ فی القرآن کہا گیا ہے جیسے کہ بخاری ص۶۸۳ ج۲ میں ہے۔ باقی اوّل پارہ الٓمٓ سے شروع ہونا اس کی مناسب توجیہ کرنی ہوگی۔ دیکھئے قرآن کریم میں ہے: اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ اس کو دیکھتے ہوئے ہر قاری ابتداء میں تعوّذ پڑھتا ہے۔ پھر تسمیہ، اس کے بعد اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پڑھا کرتا ہے نماز میں بھی اسی طرح پڑھا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہُوا کہ سورۂ فاتحہ قرآن ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اُمُّ الْقُرْاٰن ھِیَ السبع المثانی والقرآن العظیم (بخاری ص۶۸۳ ج۲) "سورۃ فاتحہ ہی سبع مثانی اور قرآنِ عظیم ہے"۔ غیر مقلدین اگر اس استدلالِ مذکور کو درست کہتے ہیں تو تصحیح ایمان کی فکر کریں کہ وہ اس قول کی وجہ سے قرآن وحدیث کے منکر قرار پاتے ہیں۔ ہم تو ایسے قول پر لعنت بھیجتے ہیں۔ قلیل نفع کے لیے اتنا نقصان کرنا کون سی عقل مندی ہے؟ عموماً حضرات محدثین شافعیہؒ اور خاص طور سے حضرت امام بخاریؒ کا رویہ اس باب میں دانشمندانہ اور پسندیدہ رہا ہے۔ وہ فاتحہ خلف الامام کے اثبات میں قرآنی آیات پیش نہیں کرتے کیونکہ بے محل آیات کا ذکر اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ۔ (الآیۃ) کی وعید کا خطرہ بن جاتا ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے صحیح بخاری ص۱۰۴ ج۱ میں باب "وجوب القرأۃ للامام والمأموم" ذکر کیا۔ اور عام عادت حضرت امام بخاریؒ کی بخاری شریف میں یہی ہے کہ اگر اس باب والے مسئلہ میں قرآنِ کریم کی کوئی آیت موجود ہو تو امام بخاری صاحبؒ اس کو ضرور ذکر فرما جاتے ہیں۔ اس کے بعد احادیث کا سلسلہ شروع کرتے ہیں پھر آثار کا ذکر کرتے ہیں اور یہی طریقہ بہتر بھی ہے لیکن باب وجوب الفاتحہ میں ضرورت کے باوجود کسی ایک آیت کا تذکرہ بھی انھوں نے نہیں کیا۔ انصاف کے راستے پر چلے۔ حدیث بھی عمومی ضابطہ کی لائے لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب جو صحیح تو ہے لیکن صریح بحق مقتدی

Scanned by CamScanner

نہیں۔ اس کو دیکھتے ہُوئے جماعتِ اہلِ حدیث کے علماء کو بھی یہی راستہ اختیار کرنا مناسب تھا کہ اس بارے میں آیات سے استدلال نہ کرتے۔ اسی میں خیر تھی حضرات سلف صالحینؒ کے راستے پر چلنا ہی دین کی سلامتی ہوتی ہے۔

الحاصل ! غور فرمائیں کہ مصنف خیر الکلام فاضل جماعت اہلِ حدیث نے جن تین آیات کو خاص فاتحہ خلف الامام کی دلیل بنایا (اور طرفہ یہ کہ صاحب توضیح الکلام نے تین کی بجائے چار آیات پیش کر کے اپنے استادِ محترم سے بھی سبقت لے لی ہے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنے مدعا کو ثابت کرنے کی سعیٔ لاحاصل کی ہے) کسی اور محدث اور مفسّر نے ان آیات کا امامت اور جماعت کے بارے میں نازل ہونا بیان نہیں کیا نہ انھوں نے ان آیات کو فاتحہ خوانی کی دلیل بنایا۔ ان کو چودہ سو سال بعد اس خاص مقام میں پیش کیا گیا ہے اگر استاد اور شاگرد کے اس استدلال میں کچھ جان ہوتی یا ان آیات کو ان کے مُدعا سے کوئی ادنیٰ مناسبت بھی ہوتی تو حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ تعالےٰ ان سے ضرور استدلال کرتے کیونکہ وہ تو معمولی مناسبت سے بھی آیات سے استدلال کر لیتے ہیں لیکن انھوں نے ان آیاتِ قرآنیہ میں سے کسی کو فاتحہ خلف الامام کی دلیل نہیں بنایا۔ بلکہ خاموش گزر گئے ہیں۔

فائدہ ! ظاہر یہی ہے کہ احکام شرعیہ کی تشریح براہِ راست صاحبِ شرع کی تعلیم سے ہو۔ خواہ فرائض و واجبات کی تشریع ہو یا سنن اور مستحبات کی ہو۔ تشریعِ احکام کی اور خاص کر فرائض عملیہ کی ذمہ داری صاحب شرع کی ہے۔ چنانچہ امام اور مقتدی کے رابطہ کے احکام میں فرمایا: اذا کبر فکبروا واذا قال غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ. فَقُولُوا آمِينَ۔ اسی سلسلہ میں اذا قرأ فانصتوا بھی فرمایا جیسے کہ مسلم شریف ص ۱۷۴ ج ۱ میں آچکا ہے۔

اس سلسلۂ بیان میں مقتدی کا وظیفہ بالقصد بیان کیا گیا ہے۔ اس صورت میں شارع علیہ السّلام کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے کیونکہ مقتدی کا وظیفہ ہی زیادہ اہم ہے۔ ایک امام کے پیچھے ہزاروں، لاکھوں تک لوگ شریک جماعت ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے

Scanned by CamScanner

کہ اگر مقتدی کا وظیفہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا ہی ہے اور اس کے سوا نماز ہوتی ہی نہیں تو بتائیں کہ شارع علیہ السّلام نے اس کو بصورت صریح ضابطہ کہاں بیان فرمایا ہے؟ اس فریضہ کا بیان صاف، صحیح اور صریح عنوان میں کہاں مروی ہے؟ اس کے مطابق فرمان تو یوں ہونا چاہیئے تھا: اذا کبر فکبروا واذا قرأ فاقرؤا الفاتحۃ فانہ لا صلوٰۃ الّا بھا۔ حنفیہ کرامؒ نے تو مقتدی کا معمول شرعی قرآن کریم اور صحیح و صریح حدیث وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا ۔ واذا قرأ فانصتوا دونوں سے بتا دیا ہے۔ اس کے بعد فریق ثانی سے مطالبہ ہے کہ ان کو مقتدی کا قرأۃ کرنا بصورت ضابطہ تشریعیہ صحیح اور صریح عنوان میں پیش کرنا ہوگا۔ کیونکہ فریضہ کا ثبوت اسی سے ہو سکتا ہے۔ فریضہ بھی ایسا کہ ہر روز ہر مسجد میں پنجوقتہ جماعت کی صورت میں نماز پڑھتے ہوئے اس کی حاجت پڑتی ہے اور آپ کے نزدیک اس کے سوا نماز ہی نہیں ہوتی۔ حالانکہ ہم احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ملتا یہ ہے کہ کسی نے امام کے پیچھے غلطی سے کچھ قرأت کر لی تو اس پر بھی جناب نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو ناراضگی ہوئی پھر آپؐ نے انکاری لہجہ میں فرمایا ایکم قرأ یا ھل قرأ احد منکم یا لعلّکم تقرؤن خلف امامکم وغیر ذٰلک ۔ اس کے بعد فلا تفعلوا الّا بفاتحۃ الکتٰب ۔ وغیرہ الفاظ مروی ہیں۔ مگر اس کی کوئی سند صحیح نہیں ہے۔ اگر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ غلطی نہ ہوتی اور وہ یہ غلطی نہ کرتے تو فاتحہ پڑھنے کی تعلیم کہاں سے ہوتی؟ اس کے بارے میں مستقل ضابطہ تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا نقل ہی نہیں کیا جاتا۔ صرف یہ ہے کہ کسی نے قرأت کرنے کی غلطی کی تو اس پر ناراض ہوئے اور پڑھنے سے روکا۔ انصاف کیجئے کہ فرائض کا حق یہی ہے کہ ان کا وجود مرہونِ منت کسی کی غلطی پر ہو۔ شکر کرو کہ کوئی غلطی کر بیٹھا اس میں آپ کا کام نکل آیا۔ اس غلطی کرنے والے کی شکر گزاری بھی کرو کہ اس میں آپ کو ایک فریضہ ہاتھ لگ گیا۔ خاص طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی روایات جن میں مقتدی کے لیے فاتحہ پڑھنے کا ذکر ہے اتنی ضعیف، کمزور اور شاذ ہیں کہ صحیحین میں ان کو اسی لیے لایا ہی نہیں گیا۔ اسی لیے حنفیہؒ کی جانب سے مطالبہ میں کہا جاتا ہے کہ ایسی

Scanned by CamScanner

صحیح اور صریح روایت بحق مقتدی بیان کی جائے کہ اس میں مقتدی کو خاص طور سے حکم قرأۃ فاتحہ کا دیا گیا ہو۔

الحاصل ہم نے مقتدی کے لیے قرآن اور حدیث سے شرعی ضابطہ صحیح اور صریح پیش کر دیا کہ وہ امام کی قرأت کے وقت خاموش رہے اور صرف سنے۔ فریقِ ثانی کو اس کے بالمقابل صریح آیت یا صحیح روایت پیش کرنی ہوگی کہ مقتدی امام کی قرأت کے وقت خود بھی فاتحہ کی قرأت ضرور کرے ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا آپ اس کے لیے ایجابی امر شرعی پیش کیجئے جیسے ہم نے کیا ہے ایسی دلیل کافی نہیں ہو گی جو خیر الکلام ص۵۷ اور توضیح الکلام ص۱۰۳ میں ہے کہ قرآن میں فاتحہ کو سبع مثانی کہا گیا ہے اور سبع مثانی کا معنی یہ ہے کہ ہر نماز میں اس کو اس طرح دہرایا جائے کہ ہر رکعت میں خواہ نماز فرض ہو یا نفل اس کو پڑھا جائے۔ اس آیت میں مقتدی یا امام یا منفرد میں سے کسی کی تخصیص نہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔ آپ اس سے مقتدی پر فاتحہ پڑھنا اور اس کا فرض ہونا ثابت کرتے ہیں۔ آپ کو اس کے لیے صریح امر صاحبِ شرع کا پیش کرنا ہوگا جیسا کہ ہم نے مقتدی کا فریضہ قرآن و حدیث سے استماع و انصات ثابت کیا ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ آپ لوگ وتر کے ایک ہونے کے قائل بھی ہیں اور اسی پر عامل بھی ہیں نماز وتر میں فاتحہ کا دہرانا آپ کے ہاں کیسے ہوگا؟ ایک رکعت میں سورۂ فاتحہ تو ایک ہی دفعہ ہوتی ہے دہرائی تو نہیں جاتی۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک رکعت وتر پڑھنا ہی غلط عمل ہے بلکہ صلوۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ وقال الترمذی ص۹ حدیث حسن صحیح کے بھی خلاف ہے۔ نیز ساتھ ہی اس کا جواب بھی دینا ہوگا کہ مثانی کا لفظ تو پورے قرآن کریم پر بھی بولا گیا ہے۔ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ۔ لہٰذا غیر مقلدین کو چاہیئے کہ امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ بقیہ قرآن بھی پڑھا کریں اور دہرایا کریں تاکہ اس مثانی پر بھی پورا عمل ہو جائے۔ ہمیں آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وجہ تسمیہ صرف نکتہ بعد الوقوع کی حیثیت رکھتی ہے مگر آپ لوگوں نے اس کو تو دلیل ہی بنا لیا۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں وہی معنی لیے

Scanned by CamScanner

جائیں جو دوسری آیت کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ میں لیے گئے ہیں ورنہ ہمیں کہنے کا حق ہے کہ اگر آپ وجہ تسمیہ سبع مثانی سے فرض احکام ثابت کرتے ہیں تو مشکوٰۃ شریف ص۸۳ ج۱ کی حدیث میں ہے: اسوء الناس سرقۃ الذی یسرق من صلوتہ الحدیث۔ بُرا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے یعنی قیام رکوع وسجود اور قومہ اور جلسہ وغیرہ پورا نہیں کرتا یہاں ارکانِ نماز کی کمی کرنے پر سرقہ (چوری) کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کیا آپ لوگ یہاں بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیں گے؟ اگر آپ یہ کہیں کہ قطعِ ید مال کی چوری میں ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ اسی طرح قرأۃ فاتحہ صرف امام یا منفرد کے لیے ہے۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ وتروں کی تخصیص روایات کی وجہ سے کی جائے گی۔ تو ہم کہیں گے کہ اوّلاً کسی صحیح وصریح روایت سے ایک رکعت کا ثبوت ہی نہیں وثانیاً ہم کہیں گے کہ مقتدی کی بھی تخصیص کی جائے گی کیونکہ روایاتِ صحیحہ اس کی مخصص ہیں۔ تعجب ہے کہ مقتدی کے لیے تو نام نہاد اہلِ حدیث یہ حکم محض شارع کے سکوت سے لیتے ہیں (کہتے ہیں کسی کی تخصیص نہیں) حالانکہ بالمقابل مقتدی کو صریحاً منع کیا گیا ہے کہ وہ امام کے پیچھے خاموش رہے اس کی قرأت پوری توجہ سے سُنے۔ مثانی کا معنی دُہرانا تو وجہ تسمیہ ہے اس کو حکم شرعی نہیں کہتے وجہ تسمیہ کے لیے صرف مناسبت کافی ہوتی ہے اور حضراتِ حنفیہؒ صریح حکم شارع علیہ السلام کا پیش کرتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک مسکوت اور منطوق ایک ہی درجے میں رکھے جاتے ہیں؟ اگر آپ کی قوم ان میں تمیز نہیں کرتی یا ان کی خبر نہ ہونے کی وجہ سے فرق نہیں کر پاتی تو دوسرے اہلِ علم تو تمیز کرتے ہیں اور فرقِ مراتب جانتے ہیں اسی لیے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بخاری میں ایسی فرسودہ اور ناکارہ باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے ان کو دلیل نہیں بنایا۔ مقتدی کے لیے فاتحہ پڑھنی کسی صحیح حدیث اور صریح حکم شرعی سے ثابت کرنی ہوگی۔ منع تو فرمانِ خداوندی وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ اور حدیثِ صحیح اذا قرأ فانصتوا سے ثابت ہے اس کے بالمقابل آپ شرعی صریح حجت پیش کریں، پیوند لگانے سے اور پنچروں سے کام نہیں چلے گا۔ یہ باتیں اسی لیے کی جاتی ہیں کہ فریقِ ثانی کے علمأ اور خطبأ لوگوں کو دھوکہ

Scanned by CamScanner

دینے کے لیے کہتے رہتے ہیں کہ احناف کے پاس صرف فقہ کی باتیں ہیں اور وہ محض رائے پر چلتے ہیں۔ ہم اہلِ حدیث، حدیث کی اتباع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ عوام کو تخریب کاری بھی سکھاتے ہیں تاکہ الجھنیں ڈالتے رہیں۔

مزید سنیے! شارع علیہ السّلام کی تعلیم مختلف مقامات میں حسبِ مقام ہوئی کبھی انفرادی نمازوں کی تعلیم کا موقع ہوا تو وہاں فاتحہ کا پڑھنا، ضم سورۃ کرنا، پڑھایا اور سکھایا گیا ہے۔ ابوداؤد میں ہے: امرنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان نقرأ بفاتحۃ الکتاب وماتیسر۔ فتح الباری ص ۱۶۵ ج ۲ میں ہے: اسنادہ جید۔ اس کو اگر مقتدی کے بارے میں بھی لے لیا جائے جیسے ابھی صاحب خیر الکلام وصاحب توضیح الکلام کی تقریر میں گزرا (کہ اس میں منفرد، امام مقتدی کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔) تو مقتدی کو اس حدیث کے پیشِ نظر فاتحہ کے ساتھ سورۃ کے ملانے کا حکم بھی دیا کرو۔ اگر کہو کہ امام کی پڑھی ہوئی سورۃ اس کو بھی مل گئی تو یہ آپ کے استدلال اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى کے خلاف ہوا اور اگر ضم سورۃ اس سے ساقط کرو کہ بحالتِ اقتدار مقتدی سے سورۃ ساقط ہو جاتی ہے تو فاتحہ مقتدی سے بحالتِ اقتدار کیوں ساقط نہیں ہوتی؟ اُمرنا کے تحت تو فاتحۃ الکتاب اور ماتیسر دونوں آرہے ہیں۔ یہ اُلجھنیں سیدھے راستے کو چھوڑنے سے پیدا ہوئیں اگر اس کو انفرادی نماز کی تعلیم کہہ دیا جائے تو کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ اسی طرح لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتٰب کو بھی لے لیجئے۔ اس لیے ابوداؤد میں راوی حدیث حضرت سفیانؒ بن عیینہؒ ھذا لمن یصلی وحدہ فرمارہے ہیں اس کی مزید تشریح اپنے موقع پر انشاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔

اب آئندہ دلائل کا کچھ تذکرہ آرہا ہے۔ الحمد للہ تعالیٰ حنفیہ کرام کثرھم اللہ تعالیٰ کے پاس قرأت خلف الامام کی ممانعت پر کتاب اللہ اور سنّتِ نبویہ کی روشنی میں دلائل کافی ہیں دلائل بھی صحیح اور قطعی۔ منصف مزاج کے لیے تسکین دِہ اور اطمینان بخش ہیں لیکن ابھی اور دلائل کے ذکر کرنے سے پہلے سابق بیان کردہ قرآنی دلیل وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ کے متعلق کچھ اور معروضات تکمیلِ حجّت کے لیے ذکر کرتا ہوں۔ فریق

ثانی نے محض کج روی سے اس میں رخنہ اندازی کی کوشش کی ہے: وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

گذشتہ عرض کیا گیا تھا کہ اس آیتِ کریمہ کا نزول ہی جماعتِ مفروضہ میں ہوا۔ مقتدی کا حکم بیان کرنا اصل مقصد ہے کہ وہ امام کی قرأت کے وقت خاموش رہے اور سُنے قرأت نہ کرے، زبان کو حرکت نہ دے۔ استماع کامل توجہ سے سننے کو کہتے ہیں۔ سُنتے ہُوئے قرأت کرنا پوری توجہ سے مانع بن جاتا ہے۔ عنقریب اس بات کی پوری تشریح اور تفصیل حضرت امام رازیؒ کے کلام سے پیش کی جائے گی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

۱: فریقِ مخالف کے بعض حضرات نے یہ چال چلی کہ استماع کرنا، قرأت کرنے کے منافی نہیں ہے مقتدی قرأت کرتے ہوئے مستمع بھی ہے جیسے صاحب توضیح الکلام نے صـ ۱۱۱-۱۱۲ میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حیلہ سازی حضرت امام رازیؒ کی بیان کردہ تحقیق کے خلاف قابلِ سماعت نہیں بلکہ مردود ہے۔ اس کی تردیدِ مزید بھی انشاء اللہ تعالیٰ اپنے موقع پر آنے والی ہے۔

۲: فریقِ ثانی کے بعض جلد بازوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ آیتِ کریمہ جمعہ اور عیدین کے خطبوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ خطیب کی آواز سننے والوں کو چاہیئے کہ خاموش رہیں۔ اس میں نماز کا مسئلہ ہی نہیں۔ چنانچہ بعض روایات میں فی الخطبۃ آیا ہے۔

۳: بعض تو یہاں تک پہنچے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں ہے ان کو کہا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کو خاموشی سے سُنو اور اس کے لیے انھوں نے قرائن بھی بیان کیے اور اسی میں انھوں نے امام رازیؒ کا سہارا لینے کی کوشش بھی کی۔ اس کی بھی تردید کی جائیگی اور قرائن بیان کردہ کا مناسب حل بھی انشاء اللہ تعالیٰ آنے والا ہے۔

۴: بعض حضرات نے کہا کہ مقتدی کو ممانعت صرف اونچا پڑھنے سے ہے۔ خفیہ قرأت کرنا ممنوع نہیں۔ استماع قرأت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ قالہ البیہقیؒ وصاحب توضیح الکلام۔

۵: بعض غیر مقلدین نے کہا کہ آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ الآیۃ کے بعد والی آیتِ کریمہ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً میں خفیہ

قرأت کی مقتدی کے لیے اجازت آئی ہوئی ہے۔ توضیح الکلام ص۱۱۱ میں بھی اسی آیت سے یہی استدلال کیا گیا ہے مگر یہ سب حیلے بہانے آیتِ کریمہ کی زد سے بچاؤ کے لیے تراشے گئے ہیں تاکہ فاتحہ خلف الامام کی گنجائش نکل سکے۔ لیکن مشہور ہے: لن یصلح العطار ما افسدہ الدھر بگڑی ہوئی چیز کیسے بنے اور اسے کون بنائے؟ اگرچہ فاتحہ خلف الامام کی کوئی صورت بھی صحیح سلامت نہیں بنتی لیکن اس میں مختلف تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ ہر تجویز دوسری کی مخالف ہے اتفاق کسی پر نہیں بنتا۔ لیکن تعجب تو مصنف خیر الکلام فاضل جماعت اہلِ حدیث کے رویے پر ہے کہ وہ سب کو اپنا رہے ہیں۔ اقوالِ مختلفہ متضادہ سب کو تھیلے میں ڈالے ہوئے ہیں کیونکہ ان کا مقصود احناف کی مخالفت ہے اور یہ بات قدرِ مشترک سب میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم نے جس جس رائے کو جن جن وجوہ سے رد کیا وہ تردیدی وجوہ سب کے سب ان کے توشہ دان میں جمع ہو جائیں گے اور وہ ان سب کے جواب دہ اور مسئول ہوں گے۔ خیر سے یہ بار اب تو ان کے کسی شاگرد پر پڑ کر رہے گا۔ بلائے زمانہ برسرِ دیوانہ والی بات بن جاتی ہے۔ دیکھئے (۱) کسی نے قرأت خلف الامام اوّل سکتہ میں کہی۔ (۲) کسی نے دوم سکتہ میں کہی جو ولا الضالین کا ہے۔ (۳) کسی نے آخری سکتہ میں تجویز کی۔ (۴) کسی نے ساتھ ساتھ پڑھنا ہی کہا۔ مصنف خیر الکلام نے ص۳۹۷ میں کہا کہ ہمارے نزدیک سب جائز ہیں۔ اس طرح جتنے اعتراضات ہر ایک پر کیے جائیں گے کل جمع ہو کر ان کے سر میں بھی لگیں گے۔ متعدد اور مختلف بوجھ جب ایک کے سر پر ڈال دیئے جائیں تو دردِ سر بن کر خاصی مصیبت ہی بن جاتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ انھوں نے خود ہی کیا۔ ہر غلط راستے کو اپنایا۔ شاید اپنی قوم جماعت اہلِ حدیث کو خوش کرنا مقصد ہوگا کہ میں نے احناف کے خلاف اتنا مواد جمع کر لیا ہے۔ تم دوسروں پر تیر پھینکتے جاؤ لیکن نہیں جانتے کہ شاید یہ وبالِ جان ہی بن جائے۔ اس کلام سے قارئینِ کرام کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ احنافؒ کے بقیہ دلائل کا بیان اس پہلی دلیل کے متعلقات بیان کرنے کے بعد ہوگا۔ واللہ المستعان۔

انشاء اللہ تعالیٰ ہر ایک کا بیان بقدرِ ضرورت اپنے اپنے موقع پر آجائے گا۔

Scanned by CamScanner

الدلیل الاوّل للانصات عند قرأتہ

بیان شان نزول آیت کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا

حضرت مفسّر کبیر علامہ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر ص ۱۸۲-۱۸۱ ج ۲ میں حضرت ابنِ مسعودؓ اور ابن عباسؓ اور عبداللہؓ بن مغفل سے اس کا شانِ نزول نزلت فی الصلوٰۃ المکتوبۃ اوالمفروضۃ نقل کیا ہے۔ ہاں حضرت ابنِ عباسؓ سے نزلت فی الخطبۃ بھی نقل کیا ہے۔ یعنی جمعہ اور عیدین کے خطبہ کے بارے میں نزول ہوا کہ خطبہ پڑھا جائے تو حاضرین کو واجب ہے کہ نہایت خاموشی سے سُنیں۔ لیکن یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ مکی ہے ہجرت سے پہلے کی نازل شدہ ہے اور نماز جمعہ کی ادائیگی اور عیدین کی مشروعیت بعد الہجرۃ مدینہ منورہ میں ہُوئی۔ ہاں نماز باجماعت کی مشروعیت اوائلِ زمانہ نبوت میں ہوئی جس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ اس لیے حقیقی معنوں میں نزول تو جماعت کے مسئلہ میں ہی کہا جاسکتا ہے اور جماعت میں امام اور مقتدی ہوتے ہیں آیت کریمہ میں امام کو ضمنی طور سے ذکر کیا گیا: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ بصیغہ مجہول ذکر کرنا اسی کی نشان دہی کر رہا ہے کہ اصل مقصد مقتدی کا حکم بیان کرنا ہے، کہ امام کی اقتداء کرنے والوں کو چاہیئے کہ امام کی قرأت کے وقت وہ کامل خاموشی اختیار کریں اور پوری توجہ سے سُنیں۔ اور امام کی طرف متوجہ رہیں خود نہ پڑھیں۔ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کا یہی معنی ہے۔ ہاں جمعہ اور عیدین کے خطبہ سننے والوں کو بھی یہی ہدایت ہے کہ جب خطیب خطبہ میں کلامِ الٰہی پڑھے یا حدیثِ نبوی کا بیان اور تذکرہ کرے تو لوگوں پر واجب ہے کہ ایسے وقت نہ ذکر و اذکار میں مشغول ہوں اور نہ تلاوت کریں۔ ان کا فریضہ وقت استماع وانصات بحکم کلامِ الٰہی یہی ہے۔ شاید اسی مقصد کے لیے صیغہ مجہول وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ لایا گیا ہے تاکہ یہ حکم امام کے علاوہ خطیب کو بھی شامل ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ اس میں ادب واحترام قرآنِ حکیم کی قرأت کا بتایا اور سکھایا گیا ہے۔ حضرت مفسّر ابنِ جریرؒ نے بھی اس آیتِ کریمہ کا شانِ نزول یہی صلوٰۃ مکتوبہ ہونا فرمانا ہے مزید تفصیل بھی کی ہے اسی طرح مفسّر کبیر حضرت ابوالسعودؒ کا قول تفسیر کبیر ص ۳۷۶ ج ۴ کے حواشی میں نقل کیا قال جمہور الصحابۃ علیٰ انہ فی

استماع المؤتم۔ یعنی جمہور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فرمان ہے کہ یہ آیتِ کریمہ مقتدی کے بارے میں ہے اور اس کو استماع وانصات کا حکم دیتی ہے۔ یہی بات حضرت محدث کبیر امام نسائی رحمۃ اللہ تعالیٰ بتا رہے ہیں۔ کتاب نسائی ص۱۰۱ ج۱ میں ہے: باب تأویل قول اللہ عزّ وجلّ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ ذکر فرما کر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ حدیث پیش کی جو عن ابی خالد الاحمر عن محمد بن عجلان کے طریقہ سے مروی ہے۔ اس میں ہے: انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال ولا الضّآلّین ... الخ۔ قال ابن عیینۃ کان محمد بن عجلان ثقۃ مامونا فی الحدیث۔ اور ابوخالد احمر سلیمان بن حیان بخاری شریف کا ثقہ راوی ہے۔ بخاری ص۲۶۴ ج۱ البتہ امام بخاریؒ نے اس کی تدلیس کا شبہ کیا ہے اراہ یُدَلِّس۔ اسی طرح امام ابوداؤدؒ بھی اس میں شبہ کرتے ہیں، لیکن اس کا متابع نسائی شریف کی روایت میں موجود ہے: حدثنا ابوسعید محمد بن سعد الانصاری حدثنی محمد بن عجلان عن زید بن اسلم عن ابی ھریرۃؓ اور محمد بن سعد انصاری کی توثیق محمد بن عبداللہ بن المبارک المعروف بالمخرمی نے کی ہے۔ نسائی میں ہے: قال المخرمی ھو ثقۃ وثقہ ابن معینؒ یہ مخرمی بخاری ص۷۹۵ ج۲ کا راوی ہے۔ یہ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کی نسل میں سے ہے اور محمد بن عجلان کے متعلق ترمذی ص۹۹ اور ص۵۶۱ میں توثیق فرما چکے ہیں۔ اس باب میں اس حدیث کے لانے میں حضرت امام نسائی بتا گئے ہیں کہ آیتِ کریمہ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ کا اصل نزول مسئلہ امامت ہی ہے اور وَاِذَا قُرِئَ فَاَنْصِتُوْا، کا فرمودہ جملہ حدیث میں اسی آیتِ کریمہ سے لیا گیا ہے۔ گویا یہ حدیث شریف اس آیت سے ماخوذ ہے۔ باب تأویل کا یہی معنی ہے۔ تأویل کا معنی مصداق اور تفسیر ہے ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُؤْیَایَ میں بھی یہی معنی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت کے متعلق جس میں اذا قرأ فانصتوا کا جملہ مروی ہے۔ بعض حضرات امام ابوداؤدؒ

Scanned by CamScanner

وغیرہ اس کی صحت میں شک کرتے ہیں لیکن امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ کا فرمان صحیح مسلم ص۱۷۴ میں اس کے متعلق مروی ہے ھوعندی صحیح ۔ مزید تفصیلی بیان حدیث کے موقع پر انشأ اللہ تعالیٰ آنے والا ہے ۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت امام مسلمؒ کا درجہ امام ابوداؤدؒ سے فائق ہے ۔ نخبۃ الفکر میں ہے : لتقدمھما (بخاریؒ و مسلمؒ) فی معرفۃ الصحیح عن غیرھما ۔ تدلیس کا شبہ بھی رفع ہوگیا کہ متابع صحیح موجود ہے ۔

الحاصل : آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کا مقصد نزول جماعت کی نماز میں مقتدی کا وظیفہ بیان کرنا ہے ۔ تفسیر ابنِ کثیر، ابنِ جریر اور ابوالسعود کی شہادت پیش ہوچکی ہے ۔ حضرت امام نسائیؒ کی تائید مزید بھی آچکی ہے ۔ امام مسلمؒ کا فرمان بھی معلوم ہوچکا ہے اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ جس کسی نے جمعہ وعیدین کے بارے میں نزول کہا ہے وہ صرف اس کے لفظی عموم سے مسئلہ لیا گیا ہے کیونکہ جمعہ اور عیدین بوقتِ نزول آیتِ کریمہ یعنی قبل از ہجرت پڑھے نہیں گئے ۔ اس بات کو مصنف خیر الکلام فاضل جماعتِ اہلِ حدیث بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ خیر الکلام ص۳۴۸ (ظاہر ہے کہ جمعہ اور عیدین کا حکم ہجرت کے بعد کا ہے اور آیت مکیّ ہے)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ المتوفی ۱۱۷۶ھ "الفوز الکبیر" ص۲۲ پر فرماتے ہیں :

والذی یظھر من استقرأ الصحابۃ والتابعین انھم لا یستعملون نزلت فی کذا المحض قصۃٍ کانت فی زمنہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وھی سبب نزول الآیۃ بل انما یذکرون بعض ماصدقت علیہ الآیۃ ماکان فی زمنہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اولبعدہ ویقولون نزلت فی کذا ۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ جس کسی نے اسے نزلت فی الخطبۃ کہا ہے وہ مجازی انداز میں کہا ہے کہ جمعہ وعیدین کے خطبوں کے سننے والوں کا حکم بھی اسی آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا سے معلوم ہوجاتا ہے کیونکہ اس کے

Scanned by CamScanner

لفظوں میں قاری کے امام ہونے کی تصریح نہیں کی گئی: افادۃً للتعمیم۔

مقامِ حیرت: مصنف خیر الکلام نے جب اقرار کر لیا کہ آیت مکّی ہے اور جمعہ وعیدین کے خطبے بعد از ہجرۃ کے احکام ہیں۔ تو صاف اقرار کرنا تھا کہ آیتِ کریمہ نماز کے بارے میں نازل ہُوئی ہے اور اس میں حکم دیا گیا ہے کہ مقتدی کو امام کی قرأت کے وقت استماع اور انصات کرنا چاہیئے اور قوم کو بھی یہ سبق پڑھانا مناسب تھا لیکن انھوں نے اس کے باوجود قوم کو اندھیرے میں رکھا ہے۔ بات گول مول کر دی۔ کہتے ہیں کہ (نماز کو جمعہ اور عیدین پر ترجیح نہیں، مزیت نہیں) یہ سب کچھ حنفیہ سے ضد و عناد میں کیا گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ نماز کی جماعت ابتداء زمانہ نبوت سے مشروع چلی آتی ہے۔ اس کا مسئلہ بیان کرنا فریضۂ وقت ہے اس کے احکام سے اطلاع دینا قانونِ حکمت کا تقاضا ہے کہ کلامِ الٰہی پڑھا جائے تو نہایت خاموشی اور پوری توجہ سے اس کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے اور جمعہ وعیدین اس وقت موجود ہی نہ تھے۔ اس وقت ان کے احکام بیان کرنے کا کیا معنی؟ مصنف خیر الکلام کہتے ہیں کہ نماز کو جمعہ وعیدین پر کیا ترجیح ہے؟ فرمائیے کیا موجود اور معدوم برابر ہوتے ہیں؟ لوگ تو النقد خیر من النسیئۃ کہا کرتے ہیں مگر آپ فرق ہی نہیں کرتے۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔ بالفرض مان لیجئے کہ یہ خطبہ کے بارے میں نازل ہے لیکن نزول کا مقصد تو یہی ہے کہ خطیب خطبہ میں قرآن کریم کی آیات تلاوت کرتا ہے، احادیث نبویہ بیان کرتا ہے تو لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ قرآنی آیات کا ادب و احترام کرنا بوقت تلاوت مسلمان کا فریضہ ہے اور ادب یہی ہے کہ نہایت خاموشی اور پوری توجہ سے سُنا جائے اس وقت اور کوئی چیز نہ پڑھی جائے۔ جب خطبہ میں قرآن کے سماع کا یہ فرمودہ ادب ضروری ہوا تو نماز میں جب امام قرأت کرتا ہے وہاں بھی یہی ادب کرنا ضروری ہوگا۔

حضرت حافظ ابنِ تیمیہؒ نے تو فرمایا کہ مقتدیوں کا رالبطہ امام سے، خطیب و قوم کے رالبطہ سے زیادہ قوی ہوتا ہے، مقتدی امام کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ خطبہ سننے والے ایسے نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان پر انصات اور استماع بطریقِ اولیٰ واجب ہوگا بلکہ حافظ ابنِ تیمیہؒ نے تو امام کے پیچھے جہری نمازوں میں قرأت کرنے والوں کو نہایت ہی

تشدّد سے منع کیا ہے۔ فیض الباری ص۴۰۳ ج۲ میں ہے : قال الحافظ ابن تیمیہؒ فی فتاواہ إن الذی یقرأ خلف الامام وھو یجھر بالقرأۃ کمثل الحمار یحمل اسفارًا۔ رہا غیر مقلدین کا یہ کہنا کہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ۔ بخاری شریف کی حدیث ہے ہم اس کو مدّنظر رکھ کر پڑھتے ہیں تو یہ ایک مغالطہ ہے جس میں عوام کو پھنسایا ہُوا ہے۔ کیا علامہ ابنِ تیمیہؒ اس کو نہیں جانتے تھے۔ اس کی پوری بحث اپنے موقع پر آئے گی ۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اصل بیان یہ ہو رہا تھا کہ اس آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ کا شانِ نزول یعنی اصل مقصد صلوٰۃِ مفروضہ کی جماعت کا مسئلہ بیان کرنا ہے۔ مفسّر ابنِ کثیرؒ اور ابنِ جریرؒ نے اس کو حضرت ابنِ مسعودؓ اور ابنِ عباسؓ کے علاوہ حضرت مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ ضحاکؒ، ابراہیم نخعیؒ، زہریؒ، سعید بن المسیبؒ، قتادہؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ اسی طرح امام نسائی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے بھی نقل گزر چکی ہے۔ مفسّر ابنِ کثیرؒ نے مزید حضرت عبیدؒ بن عمیرؒ اور حضرت عطاؒ ابن رباحؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ کسی قاری کی قرأت سنتے ہُوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے کسی نے ان سے کہا تو انھوں نے فرمایا : انما ذٰلک فی الصّلوٰۃ یعنی خاموشی کا حکم وجوبی تو نماز میں ہے۔ خارج میں ضروری باتیں منع نہیں ہیں۔ اسی طرح حضرت امام شعبیؒ سے بھی نقل کیا ہے۔ ان حضرات کے اقوال سے معلوم ہوا کہ نماز اور خطبے کے علاوہ احوال میں انصات کا حکم صرف استحباب کے درجے میں ہے ضروری باتیں منع نہیں ہیں۔

اس کے بعد آپ خیر الکلام اور توضیح الکلام میں پیش کردہ آیات کی طرف نظر کریں جو دونوں صاحبوں نے قرأت خلف الامام کے دلائل میں لکھی ہیں اور ان سے پوچھیں کہ بتائیں کہ کس کس صحابی، تابعی، مفسّر، محدّث نے ان سے فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ نکالا ہے اور ان سے استدلال کیا ہے۔ ہماری پیش کردہ آیات تو ان سب حضرات کا مستدل ہے اور وہ اس کو قرأت خلف الامام کی ممانعت کی دلیل ہی بنا رہے ہیں جب امام جہر سے قرأت کرے تو ان مذکور حضرات میں سے کوئی بھی مقتدی کو قرأت کرنے کی

Scanned by CamScanner

اجازت نہیں دیتا۔

صاحب خیر الکلام کی اُلٹی چال

آپ نے ابھی درجن سے زائد حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ، حضرات محدثینؒ و مفسرینؒ کے نام دیکھے سُنے کہ وہ سب اس آیت کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ کا اصل مصداق اور محلِ جماعت سے نماز پڑھنے کا حکم بیان کرنا بتا رہے ہیں۔ بلکہ حضرت مفسر ابوالسعودؒ تو جمہور الصحابہؓ کا یہی فیصلہ بتا رہے ہیں۔ جمھور الصحابۃ علیٰ انہ فی سماع المؤتم۔ یعنی عام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کا مختار یہی ہے کہ یہ آیتِ کریمہ مقتدی کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس کو یہی حکم دیتی ہے کہ امام کے پیچھے خاموش رہ کر سُنا کرو۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ امام کے ساتھ ساتھ جہری نمازوں میں پڑھنا ممنوع ہے۔ استماع مأمور واجب کے خلاف منہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی صحابی نے مقتدی ہو کر کچھ پڑھا تو اس پر انکار کیا گیا یہ انکار نفسِ قرأت پر کیا گیا ہے کہ وہ ممنوع تھی۔ اسی وجہ سے بقول امام ترمذیؒ حضرت امام زہریؒ نے فرمایا: فانتھیٰ الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی جمھور الصحابۃ علیٰ انہ فی سماع المؤتم کا نتیجہ ہے۔ ان واضح حقائق کو دیکھتے ہوئے جماعت اہل حدیث کے فاضل مصنف خیر الکلام کے رویہ پر افسوس ہوتا ہے کہ علم اور انصاف کی ذمہ داری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جمہور اکابرینِ سلف صالحینؒ مذکورین کے صحیح مسلک کو بلا وجہ پس پشت ڈال کر اس کے خلاف چلنے کو پسند کیا۔ چنانچہ خیر الکلام ص ۳۴ میں لکھتے ہیں: معلوم ہوتا ہے کہ خطاب تو کفار کو ہے (یعنی فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کا) مگر عمومِ علّت کی وجہ سے نمازی بھی داخل ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ۔ اس کو گنگا اُلٹی بہنا کہا جائے تو کیا بعید ہے۔ حنفیہؒ کرام کے خلاف کہیں سے گری پڑی چیز مل جائے آنکھیں بند کر کے تھیلے میں ڈال لیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کثرتِ رائے کس جانب ہے ید اللہ علی الجماعۃ کا فرمان بھی بھول گئے۔ دیکھئے باوجود غیر مقلد ہونے کے

اس بات میں امام رازیؒ کی تقلید کر ہی بیٹھے اور دوسری طرف محدث کبیر امام نسائی اور حضرات مفسرینِ کرام ابنِ کثیر، ابنِ جریر رحمہم اللہ تعالیٰ کی آراء جلیلہ متفقۃ البیان کو چھوڑ گئے۔ اپنے کو اہل حدیث کہتے ہیں اور حقیقت میں تمام محدثین مفسرین سے کٹے ہوئے ہیں۔ قوم کو اندھیرے میں ڈال رہے ہیں۔ قوم بھی سوچتی نہیں۔ پس اپنی جماعت والوں کی تقلید کرتے ہیں خواہ کتنی ہی عقل اور نقل سے بعید بات ہو۔ اگر آپ کو حنفیوں سے چڑ ہے اور انکے خلاف ہی چلنا ہے تو مذکورہ بالا حضرات محدثین مفسرین کے خلاف ایک شخصی رائے کو آپ نے کیوں ترجیح دی؟ یہ حضرات حنفی تو نہیں تھے مگر آپ کی جماعت کا تو اصول ہی یہی ہے کہ اپنی کہے جاؤ اور کسی کی نہ مانو۔ یہ بات میں نے بدگمانی سے نہیں کی بلکہ حقیقتِ حال یوں ہی ہے۔ غیر مقلدین کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ امام کے ساتھ جہری نمازوں میں فاتحہ پڑھا کرو کیونکہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔ حدیث میں آیا ہوا ہے جماعتِ اہلِ حدیث کا یہی معمول ہے۔ فاتحہ خلف الامام کے قائلین کے نام بھی یاد کرا دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ جمہور محدثین کرامؒ کے ارشادات اس کے خلاف ہیں۔ وہ جہری نمازوں میں امام کے ساتھ قرأت کے قائل نہیں بلکہ وہ اس کو گناہ اور بے ادبی سمجھتے ہیں۔ امام بخاریؒ اگرچہ فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں لیکن وہ اس کا پڑھنا سکتات میں بتاتے ہیں جزء قرأت للبخاریؒ ص۱۳ پر دیکھئے۔ فرمایا: انا نستعمل قول اللہ فانصتوا۔ نقول یقرأ خلف الامام فی السکتات۔ یعنی امام کے پڑھتے وقت انصات کرے ہاں اس کے بعد سکتے کے وقت پڑھا کرے۔ امام بخاریؒ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ بھی اس آیت کریمہ کا نزول جماعت کے مسئلہ کے بارے ہی میں کہتے ہیں جیسے جمہور محدثینؒ اور مفسرینؒ کا قول ہے اس بیان سے صاف معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ جماعت اہل حدیث کے رویّہ کے خلاف ہیں۔ امام کے ساتھ ساتھ مقتدی کو پڑھنا نہیں بتاتے۔ حضراتِ شافعیہ بھی عموماً آمین کے سکتہ میں پڑھنا بتاتے ہیں اور بعض اوّل سکتہ میں پڑھنا تجویز کرتے ہیں۔

حافظ ابنِ حجرؒ امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے کو ارتکاب منہی عنہ فرماتے ہیں۔ عنقریب ان کا کلام نقل کیا جائے گا۔ امام ترمذیؒ بھی محدثین شافعیہؒ کا عمل سکتات میں پڑھنا فرماتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

ترمذی ص۶۲ پر ہے : واختار اھل الحدیث ان لا یقرأ الرجل اذا جھر الامام بالقرأۃ وقالوا یتبع سکتات الامام۔ یعنی جب امام جہر سے قرأت کرے تو اس کے ساتھ مقتدی قرأت نہ کرے۔ ہاں سکتہ کے وقت پڑھ لیا کرے۔ سکتہ میں پڑھنے کا مسئلہ عنقریب انشأ اللہ تعالیٰ آئے گا۔ کہ اس میں کتنے اشکال ہیں کہنا تو آسان ہے لیکن عمل مشکل ہے۔ امام ترمذیؒ نے امام زہریؒ کا فرمان بھی اسی طرح نقل کیا ہے : قال الزھری فانتھیٰ الناس عن القرأۃ خلف الامام فیما جھر فیہ الامام حین سمعوا ذٰلک من رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ بہرحال اس سے معلوم ہو گیا کہ غیر مقلدین جو اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہتے ہیں۔ ان کا عمل سب محدثین کرامؒ کے خلاف ہے۔ ان کی غلط چال ہے جو قوم کو سکھائی گئی ہے۔ حافظ ابنِ تیمیہؒ نے تو نہایت سختی سے یہ فرمایا کہ وہ لوگ جو امام کے ساتھ جہری نمازوں میں قرأت کرتے ہیں، وہ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا کا مصداق ہیں۔ حوالہ گزر چکا ہے۔ امام موصوف حنفی نہ تھے۔ لیکن قرآن وحدیث اور تعامل صحابہ کرامؓ کو دیکھ کر حق گوئی فرما گئے۔ لیکن علمائے اہلِ حدیث قوم کو پڑھا گئے کسی کی نہ سنو یہ عمل کرتے جاؤ اگر کسی نے پوچھا تو کہہ دینا کہ ممانعت جہر سے قرأت کرنے کی ہے۔

مصنف خیر الکلام فاضل اہلِ حدیث ص۱۰۴ میں لکھتے ہیں : اگر یہ آیت نماز کے لیے ہے تو کلام مشوش اور شور وغل کی ممانعت اس کا شانِ نزول ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ اور ص۳۴۷ میں لکھا۔ ہو سکتا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے جہر سے روکا گیا ہو یا شور ڈالنے سے یا کلام کرنے سے منع کیا گیا ہو۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ)

جنابِ مَن۔ آپ کی یہ باتیں شاید آپ کی جماعت والے قبول کر لیں۔ باوجود غیر مقلد ہونے کے آپ کی عقیدت کی وجہ سے آپ کی تقلید کریں یا اور کوئی عقل دشمن ان کی تصدیق کرے یہ ممکن ہے۔ مگر ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ زہر آلود لقمہ ہے جو ناواقف لوگوں کو کھلایا گیا ہے۔ فریب کاری کے علاوہ یہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" والی بات بھی ہے۔

ا۔ آپ اُستمعوا لَہٗ وانصتوا کی زد سے بچنے کے لیے یہ حیلہ سازیاں کر رہے

ہیں اور خیر الکلام صـ۳۶ میں ہے: یہ آیت جس میں انصات کا حکم ہے مکی ہے اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ نماز میں کلام کرنا مدینہ میں منع ہوا کیونکہ جس آیت میں کلام کرنے سے ممانعت ہے وہ قُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ ہے جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ اب فرمائیں کہ جب کلام کرنے ممانعت مدینہ میں کی گئی تو انصات والی آیت جو مکی ہے قبل از ہجرت نازل ہوئی اس میں کلام سے ممانعت کا آپ نے ذکر کیسے کر دیا؟ جیسے کہ آپ نے صـ۳۴۷ پر لکھا ہے۔ یا کلام کرنے سے منع کیا گیا اور خیر الکلام صـ۴۰۰ میں لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمخشری اور قاضی بیضاویؒ نے نماز میں کلام کی ممانعت کے متعلق اس کا ذکر کیا۔ علامہ زمخشری کی یہ بات تو آپ کے قول کے خلاف ہے۔ وہ کلام سے ممانعت قبل از ہجرت والی آیت استماع و انصات کے حکم سے بتا رہے ہیں۔ آپ اس سے استدلال کیسے کر رہے ہیں؟ آپ نے تو مدینہ میں کلام سے ممانعت کا حکم بیان کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صاحب کشاف اس کو قیل کے عنوان سے ذکر کر رہے ہیں۔ مجہول کا صیغہ تمریض کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ یہ قول ضعیف ہے اس کو علامہ زمخشری نے اختیار نہیں کیا ان کی عبارت خیر الکلام صـ۴۰۰ میں یہ نقل کی گئی ہے۔ قیل کانوا یتکلمون فی الصلوٰۃ فنزلت۔ ایک ضعیف مردود قول کو آپ نے مطلب سازی کے لیے لے لیا ہے اور اس کا سہارا لے کر آیت میں احتمال پیدا کر دیا ہے اور صـ۳۴۷ میں آپ لکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جہر سے روکا ہو یا کلام کرنے سے منع کیا ہو ابھی گزر چکا۔ آپ کے ہاں کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں جو چیز ملی تھیلے میں ڈال لی۔ آپ کا گواہ آپ کے خلاف بیان دے رہا ہے۔

۲ آپ نے کہا ہو سکتا ہے کہ جہر سے روکا ہو یعنی فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کا حکم جہر سے روکنے کے لیے آیا ہے کہ امام کے پیچھے جہر نہ کیا کرو۔ سبحان اللہ۔ اپنا نام اہلِ حدیث کا رکھتے یا لیتے ہو اور حدیث کی سمجھ نہیں۔ یا سمجھتے ہوئے کج روی اختیار کرتے ہو۔ دیکھئے ترمذی شریف صـ۷۲ میں حدیث ہے: عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انصرف من صلوٰۃ جھر فیھا بالقرأۃ فقال ھل قرأ معی احد منکم آنفا۔ فقال رجل نعم

یارسول اللہ ۔ قال انی اقول مالی انازع القرآن ۔ قال فانتھیٰ الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما یجھر فیہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ۔ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی جہری نماز سے فارغ ہوتے ہی فرمایا: کہ کیا کسی شخص نے میرے ساتھ قرأت کی ہے ایک شخص نے کہا جی ہاں میں نے پڑھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیوں قرأت میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ آپؐ کی اس ناراضگی کو سُن کر لوگ ساتھ پڑھنے سے رُک گئے۔

غور فرمائیں کہ اس شخص نے کیا قرأت جہر سے کی تھی کہ آپؐ ناراض ہوئے۔ اگر جہر سے پڑھا ہوتا تو ھل قرأ معی احد کیوں فرماتے؟ ایسے وقت تو ایکم جھر بالقرأۃ کہا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خفیہ اور سِرًّا پڑھا تھا۔ جب کہ وہ بھی ممنوع فعل تھا اور فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا اور وَاِذَا قُرِئَ فَاسْتَمِعُوْا وَاَنْصِتُوْا کے خلاف تھا اس مکروہ فعل سے ناراضگی ہوئی اسی کو منازعت سے تعبیر فرمایا گیا کہ قرأت کرنا امام کا وظیفہ ہے۔ مقتدی کا کام تو خاموشی سے سُننا ہے اس شخص نے غصبِ منصب کیا۔ یہی جھگڑا بنا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جہر سے روکا گیا، شور وغل سے منع کیا گیا۔ کیا یہاں شور وغل ہوا تھا؟ اور سُنیے! حضرت جبریل علیہ السلام جب وحی لاکر قرآن کریم پڑھا کرتے تھے تو ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی پڑھا کرتے تھے بعد میں اس سے آپؐ کو روک دیا گیا فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ نازل ہوا۔ جس کی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ نے استمع وانصت سے کی ہے آپ نے ساتھ ساتھ پڑھنا ترک کر دیا۔ یہی انصات اور استماع کے الفاظ سورۃ الاعراف کی آیت کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا میں وارد ہیں۔ یہاں بھی یہی معنی ہونگے۔ حضرات صحابہ کرامؓ نے یہی معنی سمجھے تھے جس کے بارہ میں فانتھیٰ الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آیا ہوا ہے۔ مگر صاحبِ خیر الکلام کہتے ہیں کہ جہر کرنے سے روکا گیا ہے۔ شور وغل سے منع کیا گیا ہے۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

ایک جگہ یہ لکھا کہ حضرات صحابہ کرامؓ ساتھ پڑھنے سے رُک گئے۔ لیکن اس میں سکتوں میں پڑھنے کی نفی نہیں نکلتی۔ اوّل تو یہ بات ہی غلط ہے، کیونکہ سکتے فاتحہ پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ سبحٰنک اللّٰھم اور اٰمین پڑھنے کے ہیں۔ مان بھی لیں تو پھر آپ بھی قوم کو یہی تعلیم دیں جو آپ نے سمجھی کہ سکتوں میں پڑھا کرو۔ آپ کی قوم سب ساتھ ساتھ پڑھتی ہے۔ کیا صحابیؓ کے پڑھنے سے تو آپ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ناراض ہوئے اور آپ لوگوں کو رخصت دے گئے؟ روایت لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب تو ان حضرات کے علم میں بھی تھی، پھر وہ کیوں رُک گئے؟ مزید تردید سکتوں کے بیان میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔

جب حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو آپ کی خفیہ قرأت سے روکا گیا اور اسی کو اتباعِ قرآن فرمایا گیا تو اور کسی کو کیسے خفیہ قرأت کی اجازت ہو سکتی ہے؟ خصوصاً حضرت مفسر ابنِ کثیرؒ (تفسیر ص ۲۸۰ ج ۲ میں) اس کی حکمت ادب اور احترام قرآنِ کریم بیان کر رہے ہیں۔ ممانعتِ قرأت کی تعلیل تعظیمًا واجلالاً للقرآن۔ الیٰ قولہٖ۔ ویتأکد ذٰلک فی الصلوٰۃ بیان فرما گئے ہیں اور یہی بات امام رازیؒ کی تفسیر سے مفہوم ہوتی ہے جس کو مصنف خیر الکلام نے نقل نہیں کیا۔ انھوں نے فرمانِ الٰہی فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کی تفسیر میں نہایت محققانہ انداز میں لکھا کہ قاری قرآن کی قرأت کے وقت اپنی قرأت کرنا استماع مامور میں مخل بنتا ہے اور قرآن کریم سے بے توجہی بنتی ہے۔ لہٰذا اس وقت خالص خاموشی اختیار کی جائے۔ نہ زبان کو حرکت دے نہ اور کوئی عمل کرے جس سے التفات الیٰ القرآن میں کمی آتی ہو۔ خفیہ قرأت کرنا بھی عند سماع القرآن، استماع مامور میں نقصان دہ ہے اسی لیے سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس سے روکا گیا چنانچہ آپ رک گئے۔ عنقریب امام رازیؒ کا کلام آپ کے سامنے آنے والا ہے، آپ خود فیصلہ فرمالیں۔ چونکہ مصنف خیر الکلام کو یہ بیان کرنا اپنے گلے پر چھری چلانے کے مترادف تھا، اس لیے اس کو انھوں نے ذکر نہ کیا کہ اس کی روشنی میں قوم کہیں ہمیں غلط کار ہی نہ کہنے لگے کہ تمھارا رویّہ تو قرآن کے اس فرمودہ ارشاد فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کے خلاف ہے۔

Scanned by CamScanner

اس لیے مخالفت چھوڑ دو۔ اس لیے بہتر یہی سمجھا کہ اس کا تذکرہ ہی نہ کیا جائے۔ ہاں ایجاد کردہ اور خود ساختہ دوسرا قول جو مفید مطلب تھا ص ۳۴۸ پر نقل کر دیا ہے کہ خطاب کفار کو ہے لیکن گزشتہ بیان سے آپ کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان کا یہ قول جمہور حضرات محدثینؒ اور مفسرینِ کرامؒ کی تحقیق کے خلاف ہے۔

امام رازیؒ کو اس ایجاد کی مجبوری یہ ہو گئی کہ ان کی تحقیق کے مطابق جو انھوں نے فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا میں فرمائی ہے۔ فاتحہ خلف الامام (جہری نمازوں میں) پڑھنے کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے گنجائش ہی نہیں رہتی۔ جو شافعیہؒ حضرات کے مسلک کے خلاف ہے تو مجبوراً انھوں نے آیتِ کریمہ کا ایسا شانِ نزول بیان کیا کہ یہ آیتِ کریمہ تو کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اپنے لیے دو قرینے اس رُخ کی تبدیلی پر بیان کر دیئے تاکہ بیان میں کچھ جان پڑ جائے۔ لیکن غلط بات کو خواہ کتنا ہی سنوارا جائے وہ غلط ہی رہتی ہے درست نہیں ہو سکتی۔ اگر درست ہوتی تو جمہور مفسرینؒ اور محدثین کرامؒ اس کو کیوں چھوڑتے؟ ان میں سے کسی نے اس کا نزول کفار کے بارے میں ہونا ذکر نہیں کیا۔

ایک قرینہ یہ ذکر کیا کہ پہلے کفار کا تذکرہ ہے: وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا۔ یعنی کفار کو جب ان کی مطلوبہ نشانی پیش نہ کی جائے تو کہتے ہیں کہ تم نشانی پیش کیوں نہیں کرتے۔ اس کے بعد آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ہے لہٰذا اس کا تعلق بھی انھی کفار سے ہے۔

دوسرا قرینہ یہ ذکر کیا کہ اس آیت کے آخر میں لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ کے لفظ ہیں جس میں لعلّ امید پر دال ہے جو کفار کے لیے مناسب ہے، مومنوں کے لیے تو قرآن قطعی رحمت ہے چنانچہ ان کے الفاظ ہیں: لو قلنا الخطاب للمؤمنين لم يحسن ذكر لعل فيه وجزم تعالىٰ قبل هذه الآية بكون القرآن رحمة قطعًا فكيف يقول لعل استماع القرآن يكون رحمةً۔

پہلی بات کا جواب تو خود قرآن کریم میں ہی موجود ہے۔ غور فرمائیں کہ اس آیتِ کریمہ

کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے اوصافِ جمیلہ بیان فرمائے : هٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ یعنی قرآن یقینی ہدایت اور رحمت ہے لیکن اس کا رحمت ہونا صرف مومنوں کے لیے ہے کہ وہ اس کو دل سے مانتے ہیں۔ اس کی ہدایات پر چلتے ہیں۔ جب اس آیت کریمہ کے آخر میں مومنوں کا تذکرہ آگیا تو اس کے بعد آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ۔ انہی کے ساتھ متعلق ہوگی۔ اس قریب کو چھوڑ کر بعید کو کیوں لیا جائے ؟ اس صورت میں معنی یہ ہونگے وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ (ایھا المومنون) کیا عمدہ ارتباط ہے ؟ ربط اور تعلق بخوبی واضح ہوگیا۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا ہدایت اور رحمتِ کاملہ ہونا اس کی ذاتی صفت ہے جیسے کسی دوائی کے ذاتی فوائد بیان کیے جاتے ہیں لیکن ان فوائد کا خارج میں پایا جانا اس کے صحیح استعمال کے بعد ہوتا ہے جب کہ پرہیز بھی ہو۔ نسخہ کا پورا کورس کیا جائے اس کے بعد صحت کی امید کی جاتی ہے دنیوی زندگی میں تو نیک اعمال اور بد اعمال سب کا ایک معجون بنے گا۔ کیا معلوم کیا نتیجہ بنتا ہے ؟ رحمت کی امید ہی کی جاسکتی ہے۔ لعلّ کا لفظ آیت کریمہ میں اس لحاظ سے آیا ہے۔ مومنوں کا حال بھی مظنون الخیر ہی ہے۔ کفار کی تخصیص کی کیا ضرورت ہے ؟ جیسے کہ امام رازیؒ فرما رہے ہیں۔

الحاصل : قرآن کریم بے شک خزانۂ رحمتِ الٰہیہ ہے لیکن اس کے فرمودہ احکام کے مطابق چلنا اور عقیدہ کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ دوا کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو ؟ لیکن صحت اور شفا نسخہ کے صحیح استعمال سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی کو مدّنظر رکھ کر قرآن کریم میں لَعَلَّكُمْ کا لفظ لایا گیا ہے اور اسی کو دیکھتے ہوئے قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا : قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ

مفسر ابنِ جریرؒ نے ان سب باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت جامع اور مستحسن الفاظ میں اس آیت کی تفسیر فرمائی جزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔ اس سے تمام الجھنیں دور ہوجاتی ہیں۔ فرماتے ہیں : یقول اللہ جل ذکرہ للمؤمنین

المصدقین بکتابہ الذین القرآن لھم ھدی ورحمۃ وَاِذَا قُرِئَ
الْقُرْاٰنُ علیکم ایھا المؤمنون فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ یقول اصغوا لہ
سمعکم لتفھموا اٰیاتہ وتعتبروا بمواعظہ وَاَنْصِتُوْا الیہ لتعقلوہ
وتدبروہ ولاتلغوا فیہ فلاتعقلوہ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ہ یقول لیرحمکم
ربکم باتعاظکم بمواعظہ واعتبارکم بعبرہ واستماعکم
مابینہ لکم من فرائضہ ۔ (تفسیر ابن جریر ص ۱۶۲ ج ۹)

آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ ۔ کا مومنوں کے بارے میں نازل ہونا فرما کر لعلّ کے ذکر کرنے کی کیسی صحیح توجیہ کر دی۔ جیسے کہ گزشتہ عرض کیا گیا ہے۔ یہ کیسی واضح اور صحیح باتیں ہیں۔ لیکن مصنف خیر الکلام امام جماعت اہلِ حدیث کو ضد اور عناد نے نہ چھوڑا۔ قوم کو یہی سبق پڑھا گئے کہ آیت کفار کے بارے میں ہے۔ کیونکہ امام رازیؒ نے فرمایا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ امام رازیؒ کی یہ بات جملہ محدثینؒ اور مفسرین کرامؒ کے فرمودہ تفسیر کے خلاف ہے۔ بلکہ یہ حضرت امام نسائیؒ کے بیان کے بھی خلاف ہے گزشتہ گزر چکا ہے کہ وہ اس کا شانِ نزول نماز فریضہ کی جماعت اور مقتدی کا مسئلہ بیان کرتے ہیں۔ امام رازیؒ نے جو دو قرینے اپنی تجویز کی صحت کے پیش کیے۔ ان کی تردید بھی گزر چکی ہے۔ اگر ان کے اس بیان میں کچھ جان ہوتی تو اور محدثین کرامؒ مفسرین عظامؒ اس کو ضرور لیتے۔ مزید سنیے کہ امام رازیؒ کے باوجود وسیع النظر ہونے کے، ان کی نظر سے قرآنِ کریم کی آیات کیسے اوجھل ہو گئیں؟ یہ کیسے فرما دیا کہ مومنوں کے بارے میں لعلّ کا لفظ کیسے آسکتا ہے؟ مومنوں کے پاس جب قرآن کریم ہے جو یقیناً رحمت ہے تو مومنوں کو لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ ملاحظہ فرمائیں کہ صریحاً قرآن کریم میں ہے،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا
اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ہ (حجرات)

امام رازیؒ نے فرمایا: لو قلنا الخطاب للمومنین لم یحسن ذکر

لعلّ فیہ۔ کیا اس آیت میں لعلّ کا لفظ مومنوں کے بارے میں استعمال نہیں ہوا؟ قرآن کریم کی ایک شہادت بھی کافی ہے۔ لیکن دوسری بھی دیکھ لیجئے۔ فرمایا: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً۔ اِلیٰ قولہ تعالیٰ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (آل عمران) اس کے بعد تیسری آیت کو بھی دیکھ لیں تاکہ جمع اصطلاحی کا عدد پورا ہو جائے۔ فرمانِ الٰہی ہے وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (سورۃ نور) ان تمام مقامات میں مومنوں کے لیے لَعَلَّکُمْ بولا گیا ہے۔ غرضیکہ اگر غلط چال چلی جائے تو ٹھوکریں لگتی ہی ہیں۔

مصنف خیر الکلام کو کھرے کھوٹے کی تمیز ہی نہیں جو چیز مل گئی جس میں حنفیہ کے خلاف کوئی بات بنتی ہو، دکان میں رکھ لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ امام رازیؒ کی یہ بات جھاگ تھی جو اڑ گئی۔ سراب کو پانی سمجھا گیا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ خیر الکلام کے بورڈ والی دکان کے اکثر سودے اسی طرح کھوٹے ہی ہیں۔ معیاری نہیں۔

اس کے بعد حضرت امام رازیؒ کے دوسرے بیان کو بھی دیکھیں جو انھوں نے آیت کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کی تفسیر میں ذکر کیا ہے لیکن مصنف خیر الکلام فاضل جماعت اہل حدیث نے اس کو قوم کے سامنے ذکر ہی نہیں کیا کیونکہ اس میں ان کے رویّہ کی جڑ کٹتی ہے یہ لوگ تو فاتحہ امام کے پیچھے ساتھ ساتھ ہی جہری نمازوں میں پڑھا کرتے ہیں اور امام رازیؒ کی تحقیق اس کے بالکل خلاف ہے اس لیے اس کو مصنف خیر الکلام نے مضر سمجھتے ہوئے قوم کے سامنے لانا ہی پسند نہ کیا۔ بائیں جانب کی بات نقل کر دی کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور دائیں جانب کی انکی تحقیق جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اس کو چھوڑ ہی دیا۔ تفسیر کبیر ص ۳۴۱ ج ۴ میں فرمایا: امرہ اللہ تعالیٰ بالاستماع واشتغالہ بالقرأۃ یمنعہ من الاستماع لان السماع غیر والاستماع غیر۔ یعنی قرآن کریم کی قرأت کے وقت سامعین کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ استماع کریں ایسے وقت سامع کا اپنی قرأت

Scanned by CamScanner

میں مشغول ہونا استماع مامور کے مخالف اور ممنوع ہے۔ سماع صرف سننے کو کہتے ہیں اور استماع کامل توجہ سے سننے کو کہتے ہیں کہ سننے کے سوا کسی اور چیز سے اشتغال نہ ہو۔ سنتے وقت اپنی قرأت کرنے سے تو توجہ میں ضرور فرق آجاتا ہے۔ پوری توجہ سے سننا نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرماتے ہیں فالاستماع عبارۃ عن کونہ بحیث یحیط بذلک الکلام المسموع علی الوجہ الاکمل۔ قال تعالیٰ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی۔ والمراد ما ذکرنا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: اذا ثبت ھذا ظھر ان الاشتغال بالقرأۃ یمنع عن الاستماع وعلمنا ان الامر بالاستماع یفید النھی عن القرأۃ۔ یعنی قرآن سنتے وقت اپنی قرأت کے ساتھ مشغول ہو جانا استماع واجب کا مانع بنتا ہے اور صاف فرماتے ہیں کہ اس کا حاصل یہ نکلا کہ استماع کا امر قرأت کی نہی کے معنوں میں ہے اس وقت معنی یہ ہو جائیں گے۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ لَا تَقْرَؤُا البتہ عند ذٰلک! یہی وجہ ہے کہ عام محدثین کرامؒ کا مسلک امام ترمذیؒ نے ترمذی ص۷۲ پر یہی نقل کیا ہے: واختار اھل الحدیث ان لا یقرأ الرجل اذا جھر الامام بالقرأۃ بل یتبع سکتات الامام اس کے علاوہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت جبریل علیہ السلام کے پڑھنے کے ساتھ ابتداء میں خفیہ انداز کی قرأت کرتے تھے اس کی ممانعت کے لیے فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ نازل ہوا۔ جس کی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ نے استماع والنصت سے کی ہے۔ اس کے بعد آپؐ خفیہ قرأت سے بھی رک گئے۔ خاموشی سے سنتے تھے۔ آپ کے خیر الکلام ص۳۴۷ کے قول کے مطابق تو انصات کا حکم شور وغل سے منع کے لیے آیا ہے اور یہ جہر سے قرأت کی ممانعت کرتا ہے۔ تو پھر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے ایسے موقع پر یہ لفظ کیسے آیا؟ کیونکہ نہ تو آپؐ جہر کرتے تھے اور نہ شور وغل مچاتے تھے۔ حضراتِ شافعیہؒ کے محتاط طبقہ کا مختار بھی یہی ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی امام کے ساتھ نہ پڑھے۔ بلکہ وہ فاتحہ سے قبل یا بعد سکتہ میں پڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔ ساتھ پڑھنے کو یہ سب مکروہ کہتے ہیں۔ جیسے ابھی حضرت امام رازیؒ سے نقل ہوا۔ الامر بالاستماع

Scanned by CamScanner

یفید النھی عن القرأۃ۔ اسی وجہ سے حافظ ابنِ حجرؒ امام کو حکم دیتے ہیں کہ وہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ کے بعد اتنا ٹھہرے کہ مقتدی فاتحہ پڑھ لے ورنہ وہ منہی عنہ کا مرتکب ہوگا، جبکہ وہ امام کی قرأت کے وقت پڑھے گا۔ فتح الباری ص ۱۶۴ ج ۲ میں ہے فعلیٰ ھذا یتعین علی الامام ان یسکت فی الجھریۃ (ای بعد الفاتحۃ) لتقرء المأموم لئلا یوقعہ فی ارتکاب المنھی حیث لا ینصت۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب حضرات محدثین کرامؒ مقتدی کی نفس قرأت کرنے کو خلف الامام مع الامام مکروہ جانتے ہیں۔ غالباً اسی کراہت کی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر گرانی ہوئی جبکہ کسی نے آپؐ کے پیچھے نماز میں قرأت کی۔ کیونکہ اس طرح قرأت کرنا مخل استماع بنتا ہے۔ فرمانِ نبویؐ ھل قرأ معی احد منکم وغیرہ تعبیرات میں بھی انکار نفس قرأت پر ہی کیا گیا۔ لیکن افسوس صد افسوس جماعت اہل حدیث کے رویے پر کہ وہ خلف الامام مع الامام ہی قرأت کرتے رہتے ہیں۔ افسوس عوام الناس کے طرزِ عمل پر نہیں ہے ان کو تو جیسے پڑھایا گیا وہ صحیح سمجھ کر اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ مشکوٰۃ ص ۳۵ پر حدیث ہے: عن ابی ھریرۃؓ من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ۔ (رواہ ابوداؤد) یعنی جس شخص کو غلط فتویٰ دیا گیا اور اس نے اس پر عمل کیا تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔ ہاں افسوس ان کے پیش رو علمائے دین حضرات پر ہے کہ وہ جانتے ہوئے بھی قوم کے اس غلط عمل کی اصلاح نہیں کرتے بلکہ الٹا ان کو دھوکہ دیتے ہیں کہ ممانعت تو اونچا پڑھنے سے ہے۔ قرأت مشوشہ نہ کی جائے۔ یا کہتے ہیں کہ منع کلام کرنے سے ہے نفسِ قرأت سے منع نہیں کیا گیا۔ آپ نے ابھی امام رازیؒ کے کلام کو دیکھا: اشتغالہ بالقرأۃ یمنعہ من الاستماع وغیر ذٰلک۔

مصنف خیر الکلام ص ۳۴۷ میں آیت کریمہ انصات کا جواب تحریر کرتے ہیں اس میں کوئی ذکر نہیں کہ مقتدی کو کس بات کا حکم دیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جہر سے روکا گیا ہو یا امام کے پیچھے کلام کرنے سے منع کیا گیا ہو یا شور ڈالنے سے (نعوذ باللہ تعالےٰ

من شر الشیطان وہمزہ) اوّل تو ان کے کلام میں تناقض ہے۔ خیر الکلام ص۳۶۰-۳۶۱ میں لکھتے ہیں۔ جس آیت میں انصات کا حکم ہے وہ مکّی ہے اور نماز میں کلام کرنا مدینہ میں منع ہوا۔ کیونکہ جس آیت میں امام کے پیچھے کلام کرنا منع ہوا وہ قُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ ہے اور یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی۔ جب کلام کی ممانعت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی تو آیتِ کریمہ انصات والی جو مکی ہے اس میں کلام کی ممانعت کے لیے نازل ہونا کیسے کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ خیر الکلام ص۳۴۷ پر لکھتے ہیں یا امام کے پیچھے کلام کرنے سے منع کیا گیا ہو۔ یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے۔

دوم وجہ یہ ہے: کہ جس موقع میں آپؐ کے پیچھے کسی نے قرأت کی تھی اور آپؐ کو اس کے پڑھنے سے ناگواری اور گرانی محسوس ہوئی تھی۔ کیا اس پڑھنے والے نے شور مچایا تھا؟ آپ کے نزدیک ممنوع تو یہی شور وغل کرنا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بصیغہ استفہام ھل قرأ معی احد منکم؟ کیوں فرمایا لعلّ کے لفظ سے انکار کیوں فرمایا؟ لعلّکم تقرؤن فرمایا ہے۔ یہ تو گمان کے موقع میں بولا جاتا ہے۔ آپ کا قول تو خیر الکلام ص۳۴۷ پر یہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شور ڈالنے سے منع کیا گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہر سے روکا گیا ہو۔ کیا ان لوگوں نے جہر کیا تھا، شور وغل کیا تھا؟ ایسے وقت تو لا ترفعوا اصواتکم بالقرأۃ یا لا تجھروا بالقرأۃ کے لفظوں سے انکار کرنا مناسب تھا۔ ھل قرأ معی احد تو مناسب مقام ہی نہیں بنتا۔

اس کے علاوہ ترمذی ص۷۲ میں ہے: فانتھی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما جھر فیہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہ نفس قرأت کرنے سے لوگ رک گئے آپ کے قول کے مطابق تو لوگوں نے جہر کیا ہوگا۔ فانتھی الناس عن الجھر بالقرأۃ مروی ہونا چاہیئے تھا۔

دوسری جگہ خود مصنف خیر الکلام نے بھی لوگوں کا نفس قرأت سے رک جانا ہی سمجھا ہے،

Scanned by CamScanner

لکھتے ہیں ـــــــــ ساتھ قرأت کرنے سے رُک گئے لیکن سکتہ میں پڑھنا اس کی نفی نہیں کی گئی۔ (جس کی تردید ہم نے دوسری جگہ کر دی ہے) اس سے معلوم ہو گیا کہ ان کا خیر الکلام ص۳۴۷ والا یہ قول کہ ہو سکتا ہے جہر سے روکا گیا ہو، غلط ہے اور یہ خود ان کے اپنے بیان کے بھی مخالف ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی قابل غور بات ہے کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام حضرت جبریل علیہ السّلام کے پڑھنے کے ساتھ ابتداء میں خفیہ انداز کی قرأت کرتے تھے۔ اس کی ممانعت کے لیے فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ نازل ہُوا جس کی تفسیر حضرت ابن عباس رض نے استمع وانصت سے کی ہے۔ اس کے بعد آپ خفیہ قرأت سے بھی رُک گئے۔ خاموشی سے سُنتے تھے۔ آپ کے خیر الکلام ص۳۴۷ کے قول کے مطابق انصات کا حکم تو شور و غل سے منع کے لیے آیا ہے اور یہ جہر سے قرأت کی ممانعت کرتا ہے تو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے لیے اس موقعہ میں یہ لفظ کیسے آیا؟ اس سے معلوم ہُوا کہ اس جگہ انصات کا لفظ نفسِ قرأت (یعنی زبان سے حروف کی ادائیگی) سے ممانعت کے لیے استعمال ہُوا ہے۔ آیتِ کریمہ: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا میں بھی یہی مراد ہے۔ یہی فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ میں مُراد ہے۔ اسی کی حضرت ابنِ عباس رض نے استمع وانصت سے تفسیر فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی یہی مراد سمجھی۔ اس لیے قرأت مع جبریل علیہ السّلام سے رُک گئے۔ یہی قرآن کریم کی ہدایت تھی لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ۔ اسی کا امام کی نماز میں امام کی قرأت کے وقت مقتدیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قرأت نہ کریں۔ انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قراء فانصتوا صحیح مسلم کی روایت میں آیا ہُوا ہے بلکہ امام رازی رح کے کلام میں لفظ استماع کا معنی بھی یہی بتایا گیا ہے۔ فرمایا: اشتغالہ بالقرأۃ یمنع من الاستماع۔ کیونکہ استماع پوری توجہ سے سننے کو کہتے ہیں اور اپنے پڑھنے میں جب مقتدی مشغول ہو جائے تو لازمی طور سے توجہ الی القرآن میں رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ یہی نکتہ انھوں نے

Scanned by CamScanner

بیان فرمایا کہ امر استماع کا نہی عن القرأۃ کے معنوں میں بن جاتا ہے جو گزشتہ گزر چکا ہے مزید ان کا فرمان سنیے:

تفسیر کبیر ص ۱۰۳ ج ۱۵ میں فرماتے ہیں: تحصل قرأۃ المأموم مع قرأۃ الامام یفضی الی ترک الاستماع المامور والی ترک السکوت عند قرأۃ الامام وذلک خلاف النص۔ یعنی مقتدی کا امام کی قرأت کے ساتھ قرأت کرنا استماع مامور (استمعوا) کے خلاف ہے۔ پڑھنے سے استماع نہیں رہتا۔ اسی طرح سکوت واجب عند قرأۃ الامام (انصتوا) کے بھی منافی ہے مقتدی کے قرأت کرنے سے سکوت مامور بہ نہیں رہتا بلکہ فوت ہو جاتا ہے۔

الحاصل، مقتدی کا امام کی قرأت کے زمانہ میں پڑھنا نص قرآنی کے خلاف ممنوع اور مکروہ ہے اور امر شرعی کی خلاف ورزی بظاہر مکروہ تحریمی ہی ہے۔ یہی بات حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ امام پر واجب ہے کہ ولا الضالین کے بعد اتنا وقفہ کرے کہ مقتدی اس میں اپنی قرأت کر لے۔ ورنہ امام مقتدی کو منہی عنہ کے ارتکاب میں واقع کرے گا اگر مقتدی نے سکوت نہ کیا۔ ان کے الفاظ پہلے بھی گزر چکے ہیں فعلیٰ ھذا یتعین علی الامام ان یسکت فی الجھریۃ .... الخ۔ یہ دونوں حضرات امام رازیؒ اور حافظ ابن حجرؒ حنفی نہیں ہیں، لیکن آج کے زمانے کے اہل حدیث کی طرح اتنے بے لگام بھی نہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک پر چلنے والے ہیں۔ محتاط حضرات شافعیہؒ امام کی معیت میں پڑھنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ سکتوں میں پڑھنا بتاتے ہیں۔ یہی بات ترمذی ص ۷۲ کے حوالے سے گزر چکی ہے۔ واختار اھل الحدیث ان لا یقرأ الرجل مع الامام ... الخ۔

میں اس وقت اہل حدیث بننے والوں سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے ہم مشرب ائمہ محدثین کرامؒ میں سے کون کون ہیں جو جہری نمازوں میں مع الامام پڑھتے ہوں؟ صرف فاتحہ خلف الامام کہنے والوں کے نام نہ لیں۔ اس جگہ حضرت مکحولؒ کا فتویٰ بھی پیش نہ کیجئے۔ اس کا جواب عنقریب حدیث کے بیان میں آجائے گا۔

Scanned by CamScanner

غایۃ المرام وخلاصۃ الکلام

مصنف خیر الکلام امام اہلِ حدیث نے امام رازیؒ کی ایک بات مفید مطلب نقل کردی کہ وہ فرماتے ہیں: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ کا خطاب کفار کو ہے پھر ضمیمہ ملا دیا کہ ہاں عموم علت سے مقتدی بھی اس میں آسکتے ہیں۔ گزشتہ گزر چکا کہ یہ الٹی چال ہے جو جمہور محدثینؒ اور مفسرینؒ کے خلاف ہے اور امام رازیؒ کی دوسری مفصل بات قوم کے سامنے پیش نہ کی۔ اگر یہ طریقہ کار خیانت نہیں تو کوتاہ نظری تو ضرور ہے۔ قوم کو اندھیرے میں ڈالا گیا۔ قوم کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو بہر حال دیانت کے خلاف ہے۔ اس کے بعد مصنف خیر الکلام کا یہ کہنا ص ۳۶۷ میں کہ قرأت مشوشہ منع ہے۔ خفیہ قرأت ہو سکتی ہے، کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ امام رازیؒ کے کلام کو دیکھیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ مقتدی کا اشتغال بالقرأۃ استماع مأمور میں نقصان پیدا کرتا ہے ان کا قول یفضی الی ترک الاستماع المأمور اور الیٰ ترک السکوت عند قرأۃ الامام وذلک خلاف النص گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ مفسر ابنِ جریرؒ کے کلام کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ امام زہریؒ کا فرمان نقل کر کے فرماتے ہیں: لا یصلح لاحد ان یقرأ معہ فیما یجھر فیہ سرا ولا علانیہ۔ فان اللہ یقول وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ پہلے بھی گزر چکا ہے اور غیر مقلدین سب مع الامام ہی پڑھا کرتے ہیں۔ ان کو ان کے علمأ نے غلط سکھایا ہے کہ قرأت مشوشہ منع ہے یا جہر پر انکار کیا گیا ہے۔ گزشتہ گزر چکا ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خفیہ پڑھنے سے بھی مع قرأۃ جبریل علیہ السلام منع کیا گیا۔ اس سابق مفصل اور مدلّل بیان سے معلوم ہو گیا کہ قرأۃ فاتحہ خلف الامام کے نام کی دکان جس کا نام خیر الکلام ہے اس کے نسخہ جات معیاری نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں بعض قیمتی اجزاء شامل نہیں کیے گئے۔

خیر الکلام کی دکان کا ایک اور نسخہ بھی دیکھ لیجئے کہ اس میں کیسی فریب کاری کی گئی ہے۔ خیر الکلام ص ۲۸۰ میں صحابہ کرامؓ سے بالعموم فاتحہ خوانی کا ثبوت کے جلی

عنوان سے دعویٰ کیا گیا ہے اور بعد میں اس کی دلیل دیتے ہیں: عن جابرؓ بن عبدؓ اللہ قال کان یقرأ فی الرکعتین الاولیین بفاتحة الکتاب وسورة ویقرأ فی الاخریین بفاتحة الکتاب۔ یعنی نماز کی پہلی دو رکعتوں میں وہ فاتحہ اور ساتھ کوئی اور سورۃ دونوں پڑھا کرتے تھے اور پچھلی دو رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ ہی پڑھا کرتے تھے۔ پھر فرمایا: کنا نتحدث انه لا تجوز صلوة الا بفاتحة الکتاب وشئی معها۔ وفی روایة ابن لبشر فما فوق ذٰلك او قال فما اکثر من ذلك۔ یعنی ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ نماز فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور ملانے کے سوا نہیں ہوتی۔ اس کے بعد امام بیہقیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔ منفرد، امام اور مقتدی سب کو شامل ہے۔ فرماتے ہیں: قال البیهقی هذا لفظ عام یجمع المنفرد والمأموم والامام (کتاب القرأة)۔ یہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ بالعموم حضرات صحابہ کرامؓ کا یہ عمل (یعنی فاتحہ خلف الامام) بلاشک و شبہ ثابت ہو جائے اور کسی کو تردد کی گنجائش نہ رہے۔

الجواب وباللہ التوفیق:

اوّل: فرمانِ خداوندی ہے: عَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ۔ اسی طرح یہ ایک عربی مشہور مقولہ ہے: عَسَی الغویر ابؤسًا۔ یعنی کبھی غار میں گھسنا جان کا خطرہ بن جاتا ہے۔ (بخاری ص ۳۶۶ ج ۱) آپ کا نقل کردہ حضرت جابرؓ کا یہ فرمان بسر و چشم قبول اور منظور ہے۔ ہمارے حضراتِ حنفیہ کا تو یہی معمول ہے۔ مگر سوچیے کہ یہ حدیث تو بتاتی ہے کہ اوّل دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ سورۃ یا قرآن کا کچھ حصہ ملانا بھی ضروری ہے اس کے سوا نماز نہیں ہوتی۔ لیکن غیر مقلدین اس میں حنفیہ کرامؒ کے خلاف چلتے ہیں۔ سورۃ کا ملانا ضروری نہیں کہتے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ استحباب کے قائل ہیں۔ اور وہ بھی دفع الوقتی کے لیے۔ ملاحظہ ہو توضیح الکلام ص ۵۰۱۔

جنابِ من ہوش سے کام لیجیے۔ حضرتِ جابرؓ کا یہ اثر تو آپ کے مسلک کی تردید

کیا ہے۔ اس میں تو یہ فرمایا ہے: کنا نتحدث انہ لا تجزئ صلاۃ الا بفاتحۃ
الکتاب او شیئ معہا۔ یعنی ہم یہ بات کیا کرتے تھے کہ نماز میں فاتحہ کے ساتھ کوئی اور
سورت یا آیات قرآنیہ کا ملانا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر نماز درست نہیں ہوگی۔ اس
سے تو صاف معلوم ہوا کہ نماز میں حسب ذیل آیات کا ملانا بھی فاتحہ کے ساتھ ضروری اور واجب
ہے۔ آپ ہی کی بیان کردہ دلیل آپ پر حجت بن گئی، جواب دیجئے کیا فرمائیں گے۔ ہم تو اسی
کے قائل ہیں کہ فاتحہ کے ساتھ اور کوئی سورت ملانی بھی ضروری ہے مگر یہ حکم منفرد یا امام کا ہے
مقتدی کا نہیں۔ اور آپ بھی منفرد کے لیے سورت کا ملانا واجب اور ضروری نہیں سمجھتے تو اس
اثر کا مصداق مقتدی کیسے ہوگا؟

دوم: جواب یہ ہے کہ یہ اثر تو فاتحہ خلف الامام کے بالکل خلاف ہے۔ آپ نے اس کو
اپنی دلیل کیسے بنایا ہے؟ ایک آنکھ سے دیکھا اور دوسری کو بند کر دیا۔ ذرا دونوں آنکھیں
کھول کر دیکھیں۔ اس اثر میں تو یہ ہے کہ ہم فاتحہ کے ساتھ سورت بھی ملایا کرتے تھے اور ملاتے
اس لیے ہیں کہ ہمارے بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ اس کے سوا نماز نہیں ہوتی۔ کنا نتحدث
۔۔۔الخ۔ آپ اس اثر کو مقتدی کے لیے بھی شامل کرتے ہیں اور قوم کو بتاتے ہیں کہ حضرت
جابرؓ سب حضرات صحابہ کرامؓ کی طرف اس کو منسوب کرتے ہیں اور کنا نتحدث کا معنی
یہ کیسے ہو گیا کہ ہمارے بزرگ یہ فرماتے ہیں؟ عجیب تماشا ہے کہ آپ نے آدھی بات تو
نقل کر دی کہ فاتحہ کا پڑھنا سب صحابہ کرامؓ کا معمول تھا اور اس پر [illegible] قائم کیا، لیکن جو بات
اس میں سورت ملانے کا تذکرہ بھی ہے یا نہیں؟ آپ نے قوم کے سامنے غیر مکمل بات
رکھ دیا کہ فاتحہ ضروری ہے اور باقی چھوڑ دیا۔ یہ بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے؟ جو لوگ عربی
واقف نہیں وہ تو آپ کی بات پر اعتماد کرتے ہوں گے کہ آپ نے اثر کا صحیح معنی بیان کیا
ہے کہ حضرت جابرؓ صرف فاتحہ کا ضروری ہونا فرماتے ہیں حالانکہ اس میں خیانت کی گئی
ہے۔ اپنے مطلب کی بات کہہ دی باقی کو چھپا لیا۔ جیسے آیت کریمہ [illegible] نے بچانے کی کوشش کی
تھی۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ) لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ کو پڑھا اور وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی کو چھپا
دینا۔ کیا اسلام یہی سکھاتا ہے؟ اسی کو میں نے عرض کیا تھا کہ اہل حدیث عوام تو [illegible]

Scanned by CamScanner

سمجھے جائیں، خرابی کی جڑ ان کے راہنماؤں کی کج روی ہے۔ چنانچہ خیر الکلام ص۲۸۲ پر لکھتے ہیں: اس حدیث کے ظاہر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہؓ فاتحہ کو ہر نماز کے لیے لازم قرار دیتے تھے۔ کیا اس اثر میں وشئ معھا نہیں ہے۔ یعنی فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی ملانا ضروری ہے۔ مگر مؤلف خیر الکلام نے ترجمہ یہ کیا۔ فاتحہ یا زیادہ نہ ہو نماز جائز نہیں۔ یا زیادہ کا لفظ ترجمہ میں غلط بیانی ہیں۔ یا کس لفظ کا مدلول ہے؟

مزید سُنئے: حضرت امام بیہقیؒ جب اس کو امام اور مأموم دونوں کے لیے کہتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ مقتدیوں کو سورۃ ملانے کی بھی تعلیم اور تلقین کریں۔ کیونکہ بقول ان کے یہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے۔ سبحان اللہ! امام بیہقیؒ نے تو مأموم کو امام سے بھی پہلے ذکر فرمادیا لیکن یہ خیال نہ کیا کہ مأموم کے لیے صرف فاتحہ کا پڑھنا ہی کافی نہیں فرمایا گیا بلکہ وشئ معھا بھی ضروری بتایا گیا ہے۔ یعنی کہ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی ملانا ہوگا۔ سورت ہو یا آیات، اس کے سوا نماز نہیں ہوتی۔

تیسری بات قابلِ غور یہ بھی ہے کہ حضرت جابرؓ کے اثر سے فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ نکالنا توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کے باب کی چیز ہے کیونکہ وہ تو لا صلوٰۃ الّا بفاتحۃ الکتاب جس میں سورۃ کے ملانے کا تذکرہ ہی نہیں اس کو بھی وہ منفرد کے بارے میں فرمارہے ہیں، مقتدی کو اس حکم میں داخل ہی نہیں کرتے تو وہ اس اثر کو جس میں وسورۃ معھا بھی آیا ہے۔ اس کو مقتدی کے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہیں۔ حضرت امام بیہقیؒ نے مأموم کا لفظ صرف مطلب سازی کے لیے لگایا ہے تاکہ حضرت جابرؓ کو بھی فاتحہ خلف الامام کا قائل بنا سکیں: یعم المأموم والامام میں مأموم کا لفظ غلط محض ہے۔ دیکھئے ترمذی ص۷۲ میں ہے: اما احمدؒ بن حنبلؒ فقال معنی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اذا کان وحدہ۔ واحتج بحدیث جابرؓ بن عبد اللہؓ حیث قال من صلی صلوۃ لم یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب فلم یصل الّا ان یکون وراء الامام۔ قال احمدؒ

فهٰذا رجل من اصحاب النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تاوّل قول النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ان ھٰذا اِذا کان وحدہ ۔ یعنی یہ حکم اس وقت ہے جب شخص اکیلے نماز پڑھے ۔ غور فرمائیں کہ اس روایت میں فاتحۃ الکتاب کے بعد سورۃ کا لفظ نہیں ہے مگر اس کو بھی وہ منفرد پر محمول کرتے ہیں کہ یہ منفرد شخص کا حکم ہے ۔ مقتدی کے لیے اس کو نہیں لیتے ۔ تو جب وسورۃ معھا کا لفظ بھی یہاں اثر میں مذکور ہے اس کو وہ مقتدی کے لیے کیسے کہہ سکتے ہیں ؟

ادھر ہم صاحب توضیح الکلام کی بھی بے بسی کی طرف توجہ کرتے جائیں کہ توضیح الکلام صـ ۵۰۱ سے صـ ۵۰۷ تک حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ کے اثر سے فاتحہ خلف الامام ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود بھی مقصد برآری میں ناکام رہے ہیں ۔ اصل اعتراض کے جواب میں پھنس جانے کے بعد لاعلمی کی وجہ سے بڑے مختصر انداز میں دفع الوقتی کی کوشش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ (حضرت جابرؓ کا) مؤطا اور ترمذی کا اثر ان مرفوع اور صحیح احادیث کے خلاف ہے جو بابِ ثانی میں گزر چکی ہیں اور یہ اثر (مفید مطلب) ان کے موافق ہے ۔ اس لیے یہی راجح ہے ۔ جان چھڑانے کی کوشش تو کی لیکن اپنی پریشانی چھپا نہ سکے ۔ صاحب توضیح الکلام کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت جابرؓ کا ترمذی کا اثر مرفوع اور صحیح احادیث کے ذخیرہ کے بالکل موافق ہے اور اسی معنی کو ملحوظ رکھنے سے تمام احادیث اور آثار ایک دوسرے کے موافق اور اپنی جگہ فِٹ بیٹھتے ہیں ۔ صرف آپ کے کہنے سے یہ اثر احادیث کے خلاف نہیں ہو جاتا ۔ بلکہ اس کے لیے کوئی وزنی اور معقول دلیل چاہیئے مگر یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے ۔

الانتباہ : گزشتہ حضرت امام احمدؒ کے بیان سے معلوم ہو گیا کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ کے اثر میں جو فرمان ہے کہ ہم اوّل دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ سورۃ ملاتے ہیں اور پچھلی رکعتوں میں صرف فاتحہ شریف پڑھا کرتے ہیں ۔ یہ منفردانہ نماز کا تذکرہ تھا ۔ فرمایا : ھٰذا اذا کان وحدہٗ ۔ لیکن مصنف خیر الکلام نے عوام کو دھوکہ دینے اور مغالطہ میں

ڈالنے کے لیے اس کو فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ بنا ڈالا کہ امام کے پیچھے بھی ہم فاتحہ پڑھتے تھے کیونکہ اس کے سوا نماز نہیں ہوتی اس کو دیکھتے ہُوئے آپ کو تصدیق ہوگئی ہوگی کہ اس خیر الکلام والی دکان کے سودے اکثر کھوٹے ہیں۔ لیبل فاتحہ خوانی خلف الامام کا لگا دیا اور اندر دیکھنے سے پتہ چلا کہ یہ تو انفرادی نماز کا بیان ہے۔ حضرت امام احمدؒ کا مذکورہ فرمان بیان حق ہے۔ حق گوئی اسی کا نام ہے اور اس سے بات یہ بھی معلوم ہُوئی کہ حضرت امام بیہقیؒ نے اس میں جو اپنی طرف سے پیوند لگائے۔ ھٰذا عام للمنفرد والمأموم والامام۔ یہ ان کا مذہبی تعصب اور خلاف واقعہ کارروائی ہے آپ کو معلوم ہو چکا کہ صاحبِ حدیث راوی حضرت جابرؓ اس کو مخصوص بحق منفرد ہونا بتا رہے ہیں اور امام بیہقیؒ اس کو عام بنا کر فاتحہ خلف الامام (جماعت) کا مسئلہ بنا رہے ہیں۔

ببین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا!

غالباً اسی تعصب کی وجہ سے مأموم کا لفظ امام پر مقدم کر دیا ہے عام للمأموم والامام۔ ورنہ مأموم تابع ہوتا ہے۔ تابع کا حق پیچھے ہی ہوتا ہے۔ یہ لغزش نہیں بلکہ ناانصافی ہے۔ اللہ تعالےٰ مغفرت فرمائے۔

الغرض مصنف خیر الکلام کو حضرت امام بیہقیؒ کا یہ کرم خوردہ لقمہ مل گیا اور وہ خوش ہو گئے لیکن اس لقمے کا ہضم کرنا بہت مشکل ہے اس کے چبانے کے لیے تو لوہے کے دانت چاہئیں۔ دیکھئے حضرت امام سفیانؒ بن عیینہؒ استاذ امام شافعیؒ راوی حدیث وہ بھی اسی جگہ ھٰذا اذا کان وحدہٗ۔ فرما رہے ہیں۔ ابو داؤد ص۱۱۹ کو دیکھیں جیسے کہ حضرت جابرؓ نے اس کو بحق منفرد مخصوص کیا بلکہ یہی حضرت ابنِ عمرؓ کا فرمان بھی ہے۔ مؤطا مالک ص۲۹ بلکہ خود راوی حدیث حضرت امام زہریؒ کا فرمان بھی یہی ہے: فانتھی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کا قول ترمذی میں مروی ہے۔ مقتدی کے بارے میں تکفیھم قرأۃ الامام بھی وہ فرما رہے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت زیدؓ بن ثابت کا فتوٰی لا قرأۃ مع الامام فی شئ بھی صحیح مسلم ص۲۱۵ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا فتوٰی بظاہر سری، جہری دونوں میں ترک

Scanned by CamScanner

القرأۃ خلف الامام کا ہے۔ فی شئ سے مراد بظاہر سری اور جہری کی تعمیم ہے۔
انصاف کیجئے۔ ان حضرات صحابہ کرامؓ کا یہ فتوٰی حضرت مکحول تابعیؒ کے فتوٰی سے یقیناً راجح و مقدم ہے جس کو مصنف خیر الکلام نے کتاب میں جلی عنوان سے لکھا کہ وہ فرماتے ہیں: اقرأ قبله وبعده ومعه۔ مزید بیان اپنے موقعہ پر انشاء اللہ تعالےٰ آنے والا ہے۔ حضرت مکحولؒ کا یہ فتوٰی ابوداؤد (ص ۱۲۰ ج ۱) میں بروایت ولیدؒ بن مسلمؒ مذکور ہے لیکن ولیدؒ بن مسلمؒ مدلس ہے اور روایت مذکورہ معنعن طریقہ سے نقل کر رہا ہے۔ بقیہ باتیں تو وہیں آئندہ اس اثر کے بیان میں دیکھیں۔ فی الحال آیت کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کے متعلقات کا بیان مقصد ہے۔ مفسر کبیر حضرت ابن جریرؒ نے ابن جریر ص ۱۶۳ ج ۹ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ کسی موقع میں کوئی واعظ قرآن و حدیث کا وعظ لوگوں کو سنا رہا تھا اور حضرت عطاؒ اور حضرت عبیدؒ بن عمیرؒ کچھ فاصلہ پر اس وقت آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے ان کو ٹوکا کہ آپ باتیں کر رہے ہیں، خاموش نہیں ہوتے الانتستمعان الیٰ الذکر۔ تو انھوں نے جواب دیا۔ انما ذٰلك فی الصّلوٰة کہ خاموشی کا حکم تو نماز میں ہے۔ یہ نہ فرمایا کہ یہ آیت تو کفار کے بارے میں ہے کہ وہ قرآن سننے کے وقت شور و غل مچاتے تھے اور ان کو اس حرکت سے منع کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ کفار کے بارے میں نازل ہونا یہ بعد کے زمانے کی ایجاد ہے۔ جیسے مصنف خیر الکلام اس کو اصل شان نزول بتا رہے ہیں۔ حضرت عطاؒ اور حضرت عبیدؒ بن عمیرؒ انما ذٰلك فی الصّلوٰة فرما کر یہ بتا رہے ہیں کہ ہم تو خارج از نماز باتیں کر رہے ہیں اور یہ ممانعت خارج میں نہیں ہے بلکہ نماز میں امام کے پیچھے خاموشی کا حکم ہے۔ یعنی استماع اور انصات کا حکم مقتدی کو ہے۔ انما ذٰلك فی الصّلوٰة۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل شانِ نزول آیتِ کریمہ کا جماعت کا مسئلہ ہے۔

مولانا عبدالصمد پشاوریؒ غیر مقلد نقل کرتے ہیں: والاصح کونها فی الصّلوٰة لما روی البیهقیؒ عن الامام احمدؒ قال اجمعوا علیٰ انها فی الصّلوٰة (اعلام الاعلام فی قرأۃ خلف الامام ص ۱۹۰) اور امام احمدؒ کا یہ فرمان حافظ ابنِ تیمیہؒ نے بھی نقل کیا

Scanned by CamScanner

ہے۔ (فتاوٰی ابنِ تیمیہؒ ص ۱۴۳ ج ۲) ۔یعنی صحیح ترین بات یہی ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول ہی نماز ہے۔ امام بیہقیؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نماز کے بارے میں نازل ہونے پر اجماع ہے۔ اور اس میں مقتدیوں کا حکم بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ امام کی قرأت کے وقت خاموش ہو کر سُنیں اور زبان کو حرکت تک نہ دیں اور قرأت نہ کریں۔

غور فرمائیں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ استماع کا لفظ نفسِ قرأت سے روکنے کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ قرأت کرنا استماع میں نقص پیدا کرتا ہے۔ اگر شور وغل کے روکنے کے لیے استعمال ہوتا ہو جیسے مصنف خیر الکلام کہہ رہے ہیں کہ قرأتِ مشوشہ سے منع کیا گیا ہے۔ نفس قرأت سے منع نہیں کرتا۔ اس کو بار بار انھوں نے ص ۳۶۸، ص ۳۷۳، ص ۳۷۶، ص ۳۸۸، ص ۳۹۶ میں دُہرایا ہے تاکہ قرأت خلف الامام کی تجویز درست بن جائے۔ لیکن معاملہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت عطاؒ اور حضرت عبیدؒ بن عمیرؓ جواباً یہ فرماتے کہ ہم شور وغل تو نہیں کر رہے کہ واعظ کو اس سے تشویش ہوتی ہو۔ ہم تو فاصلے پر آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ ہماری باتوں کی آواز واعظ کو تو نہیں پہنچتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ فاضل اہل حدیث کا یہ کہنا غلط ہے کہ ممنوع شور وغل کرنا اور قرأتِ مشوشہ کرنا ہے۔ حوالے گزر چکے ہیں۔

امام رازیؒ تفسیر کبیر ص ۱۰۳ ج ۱۵ میں بھی یہی فرما چکے ہیں۔ اذا ثبت ھٰذا ظھر ان الاشتغال بالقرأۃ مما یمنع من الاستماع اور حضرت عطاؒ اور عبیدؒ بن عمیرؓ نے یہ جواب نہیں دیا کہ یہ آیت تو کفار کے بارے میں ہے ہم پر کیسے چسپاں کرتے ہو؟ ہم تو بحمد اللہ تعالیٰ مسلمان ہیں۔ جیسے مصنف خیر الکلام نے حیلہ سازی کی ہے ہاں جواب دیا تو یہ دیا: انما ذٰلک فی الصّلٰوۃ۔ یہی شانِ نزول کا حوالہ ہے۔

مزید سنئے اور خداوند تعالیٰ سے توفیق ہدایت کی دعا بھی کیجئے: اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ ــــ بخاری ص ۴۵۶ ج ۱ میں ہے کہ جمعہ کے دن کچھ فرشتے مسجد کے دروازے پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ آنے والوں کی آمد کے درجات لکھتے ہیں، لیکن جب خطبہ شروع ہو جاتا ہے تو فرشتے لکھنا بند کر دیتے ہیں اور خطبہ سننے لگتے ہیں: اذا جلس الامام علی المنبر طووا الصحف وجاؤ لیستمعوا الذکر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ کے وقت کتابت میں اشتغال بھی استماع قرآن کے مخالف سمجھا گیا ہے۔ اس حدیث کے پیش نظر وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ کا فرمان یہ چاہتا ہے کہ قرآن کی قرأت کے وقت سننے والے کو لکھنا پڑھنا بھی منع ہے اور یہ استماع کے خلاف ہے۔ **الحاصل** : یہ کہنا کہ اونچا پڑھنا منع ہے خفیہ پڑھنا منع نہیں، عقلاً و نقلاً غلط ہے۔ یہ قرآن کریم سے بے توجہی کا سبب بنتا ہے۔ جب فرشتوں نے تلاوت کے وقت لکھنا بند کر دیا تو آپ لوگوں کو بھی مناسب ہے کہ قرآن کی تلاوت کے وقت امام کے پیچھے پڑھنا بند کر دیں۔ قرآن کا ادب یہی ہے۔

حضرت عطاؒ اور عبیدؒ بن عمیرؒ کے واقعہ کو جو مفسر ابنِ جریرؒ نے لکھا پھر غور سے پڑھیں۔ اس سے مصنف خیر الکلام کی ایک اور غلط بیانی بھی معلوم ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ اس غلط بیانی پر قوم نے انھیں خراج تحسین بھی دیا ہو کیونکہ وہ اپنوں کی باتیں بلا تحقیق مان لیتے ہیں اور باوجود غیر مقلد کہلانے کے اپنے مولویوں کے پکّے مقلد ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کیسی ہی بات کہہ دیں۔

دیکھئے مصنف خیر الکلام نے بیان کیا کہ اگر یہ آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ۔ قرآن کی قرأت کے وقت لوگوں کو خاموشی کا حکم دیتی ہے اور پڑھنے سے روکتی ہے تو لازم ہے کہ قرآن مجید کا درس ہو وہاں ایک ہی شخص پڑھے، باقی سب خاموش رہیں بلکہ مزید یہ بھی لکھا کہ لازم ہے کہ جو شخص امام کی قرأت کے وقت آئے وہ اللہ اکبر کہہ کر نماز میں بھی شریک نہ ہو سکے کیونکہ اس کا اللہ اکبر کہنا استماع مأمور کے خلاف ہے اور نیز لکھا ہے کہ تکبیر تحریمہ کا جواب مشکل ہے۔

الجواب : آپ جانتے ہیں کہ بعض دفعہ بولنا انسان کے مرتبہ کو گھٹا دیتا ہے بولنے سے پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ شخص کتنا ذی علم ہے اور ایسی ادنیٰ گفتگو سے فاضل ہونے کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔ دیکھئے جب خارج نماز میں قرآن کی قرأت اور سماعت کے وقت ضروری باتیں کرنا جائز ہیں۔ جیسے کہ روایت میں ہے کہ حضرت عطاؒ اور عبیدؒ بن عمیرؒ کانا یتکلمان اور انھوں نے معترض کا وہ سوال سن کر انما ذلك فی

Scanned by CamScanner

الصلوٰۃ فرمادیا تھا۔ تو معلوم ہُوا کہ انھوں نے کلام کرنا بند نہ کیا ہوگا۔ ورنہ کہہ دیتے ہمیں خیال نہیں آیا۔ آپ کے توجہ دلانے سے اب کلام ہم نے بند کر دیا ہے۔ جب آپ نے سمجھا تو غور فرمائیں کہ قرآن مجید کے درسوں میں ہر شخص منفرد طور پر پڑھا کرتا ہے اور یہ خارج نماز کا معاملہ ہے اس میں ہر شخص اپنا اپنا کام کرتا ہے تو ایسے وقت دوسرے کے پڑھنے سے اس پر خاموش رہ کر سننا واجب نہیں ہوگا بلکہ صرف مستحب ہے لیکن مقتدی تو نمازوں میں امام کی متابعت کا عہد کرتا ہے اور اتباعِ قرآن بحکم فرمانِ الٰہی فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ خاموشی کو چاہتا ہے۔ جیسے حضرت ابنِ عباسؓ نے استمع وانصت سے تفسیر کی ہے۔ تو درس والے لوگ اس حکم کے کیسے پابند ہوں گے؟ جب کہ وہ کسی کی متابعت کا عہد نہیں کرتے۔ اسی طرح تکبیر افتتاح کہنے والا شخص تکبیر کہنے کے زمانہ میں داخلِ نماز نہیں ہوتا تو وہ کس طرح خاموشی کا پابند کیا جاسکتا ہے؟ وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی۔ کو غور سے پڑھیں۔ مزید بیان طول کا باعث بنے گا۔ اسی پر بس کرتا ہوں۔

الغرض معترض کی بیان کردہ دونوں صورتیں خارج نماز کی ہیں اور خارج از نماز استماع واجب نہیں ہوتا۔ ہاں استحسان کے درجہ میں مستحب ہوتا ہے جیسے حضرت عطاؒ اور عبیدؒ کے مذکورہ قصّہ سے معلوم ہوتا ہے۔ ضروری گفتگو منع نہیں۔ اس سے معلوم ہُوا کہ مصنف خیر الکلام کے مذکورہ دونوں اعتراض بے محل اور لغو ہیں۔ اصل مسئلہ کو نہ سمجھنے سے یہ اشکال ہُوا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم۔

ایک اور بات بھی مزیدار سُنتے جائیے، کہ مصنف خیر الکلام جگہ جگہ کہتے ہیں، کہ مقتدی کو نفسِ قرأت سے منع نہیں کیا ہاں قرأتِ مشوشہ سے منع کیا ہے جس میں امام تشویش میں پڑ جائے انکار قرأت پر نہیں کیا گیا ان کے اونچے پڑھنے پر انکار کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دیکھئے فرشتوں نے خطبہ کے وقت کتابت چھوڑ دی۔ کیا ان کی یہ کتابت خطیب کے خطبہ میں تشویش پیدا کرتی تھی؟ ہرگز نہیں۔ معلوم ہُوا کہ خطبہ کے وقت لکھنا استماع واجب میں مخل بنتا ہے پوری توجہ الی القرآن سے رکاوٹ بنتا ہے۔ اس لیے انھوں

نے لکھنا بند کر دیا۔ کیا مقتدی کا اپنی قرأت کرنا اس میں یہ بات نہیں پائی جاتی ؟ اسی طرح مناسب ہے کہ آپ بھی قرأت کرنا عند قرأۃ الامام چھوڑ دیں۔ بہانے نہ بنائیں کہ ممنوع قرأت مشوشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھ نصیب کرے اور عمل کی توفیق بھی دے حضرت امام رازیؒ نے نہایت صحیح فرمایا : وظہر ان الامر بالاستماع یفید النہی عن القرأۃ ۔ آپ اس کے ساتھ وعن الکتابۃ بھی لگا دیں۔ جیسے ملائکہ کے مذکورہ عمل سے معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا پڑھنا اور لکھنا دونوں استماع کے لیے مُخل ہیں۔

فائدہ : حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے : من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین ۔ فاضل اہل حدیث مصنف خیر الکلام کی تحریر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کو بے تمیز یا بد تمیز سمجھ رکھا ہے کہ جو کچھ لکھا جائے گا قوم آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لے گی۔ بلا شعور اندھی تقلید اسی کو کہتے ہیں۔ جو نام نہاد غیر مقلدین کا خاصہ ہے وہ حضرات ائمہ دین رحمہم اللہ تعالیٰ جن کے فضل و کمال زہد و تقویٰ کو دیکھ کر جو علوم عقلیہ و نقلیہ کے جبال العلم والخزائن تھے بالخصوص علوم قرآن و حدیث کے سمندر تھے۔ مثلاً امام غزالیؒ ، امام رازیؒ اور حافظ ابنِ تیمیہؒ وغیرہ اس جلالتِ شان کے باوجود وہ ائمہ دین مشہود لھم بالخیر کی تقلید کو فخر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو ان کا مقلد کہتے ہیں اور یہ جماعتِ اہلِ حدیث ان سے بیزار ہو کر اپنی جماعت کے ادنیٰ لوگوں کی تقلید کر رہی ہے۔ جن میں سوائے تعصّب کے اور کوئی کمال نہیں پایا جاتا۔

دیکھئے ! خیر الکلام ص۱۷ میں کیسی غلط بیانی کی گئی ہے لکھا ہے کہ اَنْصِتُوْا میں خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ جہر سے خاموش ہو۔ قرآن کے آداب میں یہ داخل نہیں کہ سنتے وقت تصدیقی کلمات سے بھی خاموش رہے۔ سبحان اللہ۔ شاید ان کی قوم نے آمنّا و صدقنا کہہ دیا ہوگا۔ کیونکہ آج تک اس کے خلاف آواز نہیں اُٹھائی گئی۔ گزارش ہے کہ ہماری باتوں کو تعصب کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ کل قیامت میں باز پُرس ہوگی قوم نے نہیں چھڑانا۔ اَللّٰہُ یَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ آیا ہُوا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھیں اور دل سے سوچیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

جب کہ حضرت جبریل علیہ السّلام وحی کلام الٰہی کی تلاوت کرتے تھے۔ کیا آپ اس کو جہر سے دہراتے تھے؟ اونچی آواز سے پڑھا کرتے تھے کہ آپؐ کو اس سے منع کیا گیا۔ آپ تو صرف زبان اور ہونٹ مبارک ہی ہلاتے تھے جس سے صرف حروف کی ادائیگی زبان سے ہو جائے لیکن حکم آیا فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ۔ یعنی ہمارے بھیجے ہوئے حضرت جبریل علیہ السّلام کے پڑھنے کے وقت آپؐ زبان نہ ہلایا کریں خاموشی سے سُنا کریں۔ اس کی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ کے فرمان میں آئی ہے۔ اتبع قُرْاٰنَهٗ ای استمع وانصت۔ کیا یہ انصات کا حکم جہر سے روکنے کے لیے کہو گے؟ یہ آیتِ کریمہ تو نفسِ قرأت کی بندش کے لیے آئی ہے اسی لیے بعد میں آپ نے ساتھ ساتھ پڑھنا چھوڑ دیا۔ آپ لوگوں کو بھی عند قرأۃ الامام خاموشی کرنی چاہیئے۔ اس کو دیکھتے ہوئے انصاف سے کہیں کہ قرآن پڑھتے ہوئے تصدیقی کلمات کا جواز کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ امام رازیؒ کا فرمان گزشتہ بارہا گزر چکا ہے۔ فراجع ان شئت۔

مصنف خیر الکلام کو دراصل قرأت فاتحہ خلف الامام کا جواز بیان کرنا مقصد ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جب تصدیقی کلمات پڑھنے جائز ہیں تو فاتحہ کا پڑھنا بھی جائز ہوگا۔ یہ سراسر دھوکہ ہے۔ قوم کو مغالطہ میں ڈال رہے ہیں۔ تصدیقی کلمات آیت کے اختتام کے بعد کہے جاتے ہیں عین تلاوت کے وقت نہیں پڑھے جاتے۔ دیکھئے: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کے خاتمہ کے بعد ہی لا بشیٔ من نعمك ربّنا نکذب فلك الحمد سے جواب دیا جائے گا۔ جیسے اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی کا جواب بلی اللّٰہ قادر۔ بعد آیت کے تمام ہونے کے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ کا جواب بھی بعد کو دیا جاتا ہے۔ وغیر ذٰلک۔ مگر خارج از نماز کیونکہ نماز میں جواب دینے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حنفیہ کرامؓ نے استماع وانصات کا وجوب نماز میں مقتدی کے بارے میں کہا ہے اور آیتِ کریمہ کا شانِ نزول ہی یہی ہے۔ تفصیل گزر چکی ہے۔ اور مصنف خیر الکلام نے قرآن پڑھتے ہوئے تصدیقی کلمات کے جواز کا دعویٰ کیا ہے اور آیات

Scanned by CamScanner

جتنی بھی پیش کی ہیں وہ سب خارج از نماز کی ہیں یہ جوڑ تو وہ اور ان کی جماعت والے ہی بتائیں گے۔ ہم تو اس کو بے تمیزی کہیں گے۔ اس سے انّ من العلم لجھلا کا مصداق منظر نظر آرہا ہے۔ موقع شناسی انسان کا فریضہ ہے۔ بے محل بات کون مانتا ہے؟ خدا جانے یہ کج روی نافہمی سے کی گئی ہے کہ بات تو نماز میں مقتدی کی قرأت بوقتِ قرأتِ امام کی ہو رہی ہے اور دلیل میں خارج از نماز کی جواب دہی پیش کی گئی ہے۔ یا فرق جانتے ہوئے قوم کو بدتمیز بنا رہے ہیں کہ قوم کو کیا خبر۔ میری لکھی ہُوئی بات کو بلا سوچے سمجھے ہی قبول کرلیں گے۔ جہاں اہلِ علم کا یہ حال ہو تو وہاں عوام سے کیا گلہ وشکوہ۔

مزید اہلِ علم محققین کثرھم اللہ تعالیٰ کی باتوں کو سُنیں اور دین وایمان کی اصلاح بھی کریں اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضیٰ واجعل اٰخرتنا خیر من الاولیٰ۔ حضرت مفسر ابنِ جریرؒ نے ص ۱۶۴ ج ۹ میں حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا: انہ کرہ اذ قرأ الامام اٰیۃ خوف اواٰیۃ رحمۃ ان یقول احدٌ من خلفہ شیئًا۔ یعنی حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ مکروہ ہے کہ کوئی شخص نماز میں امام کے پیچھے خوف کی آیت سُن کر یا رحمت کی آیت سن کر کچھ مناسب بات کہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں تصدیقی کلمات کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں نماز سے خارج ایسے کلمات کہنے کی گنجائش ہے۔ بلکہ مطلوب ہے۔ اس کے بعد حضرت مجاہدؒ کا یہ قول نقل کیا: کہ لا بأس اذا قرأ الرجل فی غیر الصلوٰۃ ان یتکلم بہٖ۔ یعنی نماز کے علاوہ اگر قرأت کے وقت مناسب مقام پر ایسے کلمات کہے تو کچھ حرج نہیں۔ اس سے بھی معلوم ہُوا کہ نماز کے اندر ایسے کلمات نہیں کہے جا سکتے۔

الحمد للہ تعالیٰ بات روشن ہوگئی کہ مصنف خیر الکلام مکروہ عمل کی قوم کو تلقین و تعلیم کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز کے اندر امام کی قرأت کے وقت تصدیقی کلمات کی اجازت نکالنا صریح آیتِ کریمہ کے حکم کے خلاف ہے۔ انصات اور استماع حکم الٰہی ہے اس کی خلاف ورزی مردود ہے۔ اس سے فاتحہ خلف الامام پڑھنے کی تجویز نکالنا سعی نامشکور ہے۔ اس سے کسی صورت اور کسی حالت میں فاتحہ خلف الامام کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا۔ مفسر ابنِ جریرؒ نے حضرت عطاؒ بن ابی رباحؒ سے نقل کیا: وجب الصمت فی اثنین عند

الرجل یقرأ القرآن وھو یصلی وعند الامام وھو یخطب۔ یعنی دو صورتوں میں خاموش رہنا واجب ہے۔ اوّل: امام کی قرأت کے وقت مقتدیوں کا خاموش ہو کر سننا واجب ہے۔ دوم: جمعہ یا عیدین کا خطبہ جب پڑھا جا رہا ہو تو اس وقت بھی خاموشی سے سننا واجب ہے۔

اس سے معلوم ہُوا کہ مصنف خیر الکلام کا صفحہ ۱۷۰ پر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ انصتوا میں خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ جہر سے خاموش ہو۔ یعنی آہستہ پڑھنا انصات کے منافی نہیں۔ یہ محض طفل تسلی ہے۔ خطبہ میں یہ لوگ بھی اجازت نہیں دیتے کہ سننے والے خفیہ طور پر ذکر اذکار پڑھیں۔ محض خاموشی کا حکم دیتے ہیں۔ امام ابنِ تیمیہؒ نے فرمایا کہ مقتدی اور امام کا رابطہ، سامعِ خطبہ اور خطیب کے رابطہ سے زیادہ قوی ہے۔ پھر نماز میں وہ کیسے اجازت دیتے ہیں کہ مقتدی قرأت امام کے سُنتے ہوئے قرأت کرے جبکہ خطبہ سنتے ہُوئے قرأت کی وہ سامعین کو اجازت نہیں دیتے؟

ضروری تشریح گزشتہ کلام میں کچھ اجمال سے کام لیا گیا ہے شاید کہ بعض لوگ پوری مراد نہ سمجھے ہوں۔ اس لیے کچھ مزید عرض کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جنّات کی تبلیغ اور تعلیم کے لیے کئی دفعہ رات کے وقت باہر تشریف لے گئے۔ بعض دفعہ حضرت ابنِ مسعودؓ کو ساتھ لے گئے اور بعض دفعہ کسی اور صحابی کو اسی تبلیغی سلسلے میں کسی موقع پر جنات پر آپؐ نے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت فرمائی اس میں اللہ تعالیٰ جلّ جلالہٗ کی نعمتوں کا تذکرہ ہے مثلاً اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ ۝ اس میں چار نعمتوں کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے سورج اور چاند پیدا کیے جو حساب سے چلتے ہیں اور درخت اور انگوریاں (جو زمین پر پھیلتی ہیں) پیدا کیں۔ تم خداوند تعالیٰ کی کس کس نعمتِ حقہ کا انکار کر سکتے ہو؟ جواباً جنّات نے کہا: لا بشیٔ من نعمك ربنا نکذب فلك الحمد۔ ہم آپ کی کسی نعمت کا انکار نہیں کرتے بلکہ آپ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ پھر کسی وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر بھی اسی طرح

سورۃ الرحمٰن کی تلاوت فرمائی تو انھوں نے خاموشی سے سورۃ سُنی اور درمیان میں نعمتوں کے تذکرہ کے وقت وہ جواب نہ دیا جو جِنّات نے دیا تھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تم سے تو جِنّات ہی اچھے رہے کہ انھوں نے ہر آیت پر جس میں نعمتِ الٰہیہ کا تذکرہ ہے لا بشیٔ من نعمک ربنا نکذب فلک الحمد کہا تھا۔ اس واقعہ سے ایک[1] تو یہ بات ظاہر ہے کہ جِنّات نے آیت کے خاتمہ پر جب کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وقفہ کیا ہوگا، انھوں نے جواب دیا ہوگا۔ درمیان میں جواب دینے کا تو کوئی معنی ہی نہیں۔ اور دوسری[2] یہ بات ظاہر ہے کہ یہ تلاوت نماز میں نہ تھی یہ خارج از نماز کا قصّہ ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ مصنف خیر الکلام کا امام کی قرأت کرتے ہوئے مقتدیوں کا قرأت کرنا اور اس کا جواز ثابت کرنا دو وجہ سے بے جا ہے۔ ۱ یہ تلاوت کے خاتمہ پر جواب دینا ہوا۔ ۲ اور خارج از نماز جواب دینا ہوا۔ اس سے مقتدی کو امام کی قرأت کے زمانے میں اجازت دینا یقیناً بے جا اور بے محل ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھ کی توفیق عطا فرمائیں۔

دنیوی سلسلہ کی باتیں سُن کر آخرت کے احوال کی طرف بھی دھیان فرمائیں۔ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز جب کہ جلالِ خداوندی کا ظہور ہوگا تو لوگ حضرات انبیاء علیہم السّلام کے پاس جائیں گے کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں ان کے لیے سفارش کریں کہ حساب شروع ہو جائے لیکن سب کے سب عذر داری کریں گے کہ آج ہمارا بس نہیں ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں گفتگو کریں۔ اس کے بعد لوگ سردارِ انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوں گے اور سوال سفارش کا کریں گے۔ آپ تیار ہو جائیں گے۔ روایت میں ہے: انا خطیبھم اذا انصتوا۔ جب سب خاموش ہو جائیں گے تو مَیں ان کی طرف سے خطاب اور سفارش کروں گا۔ حاشیہ مشکوٰۃ ص ۵۱۴ میں ہے: اشارۃ إلیٰ سکوت الانبیاء[3] عن الشفاعۃ وعدم قدرتھم علی التکلم۔ یہ لفظ انصات کا معنی کیا کہ جب جملہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسّلام شفاعت کرنے سے عذر اور سکوت فرمائیں گے اور بولنے پر قدرت نہیں پائیں گے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں سفارش کروں گا۔

Scanned by CamScanner

فاضل اہلِ حدیث مصنف خیر الکلام فرماتے ہیں کہ انصتوا کا معنی جو وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا ۔ میں آیا ہے "اونچا نہ پڑھیں" ہے ۔ اس تجویز کے مطابق حدیث مذکور کے معنی یہ ہو جائیں گے: انا خطیبهم اذا انصتوا ۔ جب اور حضرات اونچا نہ بولیں گے میں اونچی آواز سے چلاؤں گا ۔ سبحان اللہ ۔ کوئی بیوقوف ہی یہ ترجمہ کرے گا ۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارادہ ہوا کہ لوگوں سے کچھ مسائل بیان فرمائیں ۔ آپؐ نے حضرت جریرؓ سے فرمایا کہ لوگوں کو چپ کراؤ کہ وہ خاموش ہو جائیں استنصت الناس یا جریر ! بخاری ص ۲۳ ج ۱ ۔ کیا اس کا معنی یہ ہے کہ اونچا نہ بولیں آہستہ آہستہ باتیں کرنا منع نہیں ہے اور وہ بے شک کرتے رہیں ؟ جیسے مصنف خیر الکلام نے کہا ہے مقتدی اونچا نہ پڑھے ۔ آہستہ پڑھنے کی ممانعت نہیں ہے ہاں قرأتِ مشوشہ نہ کریں اس کا مزید بیان آگے آنے والا ہے ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ چُپ ہو جاؤ کا یہ لفظ اَنْصِتُوْا جب جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں لیتے ہیں تو اس کا یہی مطلب لیتے ہیں کہ خطبہ کے وقت خاموش ہو جاؤ ۔ نہ ورد و وظیفہ پڑھا جائے ، نہ قرآن کریم کی تلاوت کی جائے ۔ چنانچہ فتح الباری ص ۲۸۱ ج ۲ میں ہے کہ امام ابنِ خزیمہؒ جو متأخرین شافعیہؒ میں سے ہیں ۔ انھوں نے فرمایا کہ المراد من الانصات السکوت عن مکالمة الناس دون ذکر الله تعالیٰ یعنی استمعوا وانصتوا میں انصات سے مراد یہ ہے کہ باتیں نہ کریں ۔ اللہ کے ذکر سے روکنا مقصود نہیں ہے مصنف خیر الکلام فاضل اہلِ حدیث کو جہاں سے کوئی چیز مل جائے نقل کر دیتے ہیں قوم کو سبق دے دیتے ہیں مگر کھری کھوٹی کی تمیز نہیں کرتے ۔ قوم کو اس کی باطنی بیماری کی اطلاع نہیں دیتے ۔ یہاں بھی وہ حسبِ عادت اسی غلط چال پر چلے ہیں ۔ لیکن حافظ ابنِ حجرؒ نے اس بیان کو مضر سمجھتے ہوئے رد کر دیا ہے کیونکہ امام ابنِ خزیمہؒ کی یہ بات ایک جگہ تو مفید بنتی ہے لیکن دوسری جگہ مضر بھی ہے ۔ یہی انصات کا لفظ جمعہ اور عیدین میں بھی لیا جاتا ہے اگر مراد یہی سکوت عن مکالمة الناس لیا جائے تو خطبہ کے وقت تلاوت قرآن ، ذکر اذکار سب جائز بن جاتے ہیں حالانکہ یہ سب ممنوع ہیں ۔ چنانچہ حافظ

ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں: وتعقب بانہ یلزم منہ جواز قرأۃ القران حال الخطبۃ فالظاھر السکوت مطلقاً۔ یعنی امام ابنِ خزیمہؒ کی بات سے لازم آتا ہے کہ قرآنِ کریم کی قرأت خطبہ کے وقت جائز ہو۔ حالانکہ یہ ممنوع ہے۔ پس ظاہر انصات سے مطلقاً سکوت مُراد ہے نہ قرأتِ قرآن خطبہ کے وقت کی جائے اور نہ ذکر اذکار پڑھے جائیں۔ جب خطبہ میں انصات کا لفظ قرأتِ قرآن سے روکتا ہے تو نماز میں بھی یہی حکم ہونا چاہیئے۔ باقی بہانے ہیں کہ جبر سے روکا گیا ہے اور قرأتِ مشوشہ سے روکا گیا ہے اور باتوں سے منع کیا گیا ہے۔ مصنف خیر الکلام کی دکان میں ان کھوٹے سودوں پر خیر الکلام کا لیبل لگایا ہوا ہے۔ ان کو حنفیہ کے خلاف میں مزا آتا ہے۔ خواہ تیر اپنا سینہ ہی چھلنی کر جائے جیسے آپ نے ابھی دیکھا۔ ڈبیہ میں سم الفار بھری ہے لیکن اوپر چٹ خیر الکلام کی لگائی ہوئی ہے۔

مسئلہ قرأتِ خلف الامام میں علامہ واحدیؒ کی سرد مہری اور امام رازیؒ کی حمایتِ حق میں باطل کی سرکوبی

خالق کائنات جلّ جلالہٗ وعم نوالہ نے عالمِ جسمانی میں نور اور ظلمت کا نظام اور اس کے اسباب بنا رکھے ہیں اسی طرح عالم روحانی میں بھی اس نے یہ دونوں تقسیم کیے ہیں۔ قرآن کریم میں اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بھی فرمایا اور اس کے مدّمقابل کا اَوْلِیَآءُھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ سے شکوہ بھی کیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت براہِ راست اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے۔ اور بالمقابل گمراہی خارجی اسباب سے جو قانون ابتلاء کے نتیجہ میں ظہور میں آتے ہیں، پیدا ہوتی ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہ تعالیٰ من ذٰلک۔ یہ اسباب حائل ہو جاتے ہیں۔ مرضیاتِ خداوندی تک پہنچنے نہیں دیتے۔ یہ اسباب کبھی دنیوی مفادات ہوتے ہیں اور کبھی مذہبی تعصّب اور بُغض وعناد ہوتا ہے۔ شیطان اس کو دین کا رنگ دے کر شخص کو بدراہ کر دیتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے: اَفَمَنْ زُیِّنَ لَہٗ سُوْٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا۔

دیکھئے علامہ واحدیؒ امام کے پیچھے قرأت کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن لفظ انصات جو قرآن و حدیث میں آچکا ہے ان کے نظریہ کے لیے رکاوٹ بن رہا ہے کیونکہ اس کا معنی تو خاموش رہنا

Scanned by CamScanner

ہے۔ معنی یہ ہوجاتا ہے کہ جب قرآن مجید پڑھا جائے۔ خواہ امام پڑھے، خواہ کوئی خطیب پڑھے۔ سننے والوں کو خالص خاموش رہنا چاہیئے۔ زبان سے کچھ نہ پڑھیں تو اس سے علامہ واحدیؒ کو سردردی ہوگئی سرگردانی محسوس کی اس سے چھٹکارا اور مخلص یہ سوچا کہ انصات کا معنی ہی بدل دیا جائے۔ یہ نہ سوچا کہ لغت کے خلاف معنی کون مانے گا؟ لوگ شاید اس کو تحریف قرآن کا لقب دیں گے۔ مؤلف خیر الکلام کو بھی اس کی ضرورت تھی اور انہی کی تقلید میں صاحب توضیح الکلام کو بھی اشد ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے بہانے انھوں نے بنائے جن کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ اب یہ لوگ علامہ واحدیؒ کی بات کو قبول کرکے قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ خیر الکلام ص۳۹۶ میں لکھتے ہیں:

(انصات کا معنیٰ جو علامہ واحدیؒ نے لکھا ہے) یعنی جہر نہ کرے اگرچہ آہستہ پڑھتا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ استماع اور انصات مقتدی کو قرأت سے نہیں روکتا۔ مؤلف خیر الکلام سمجھے کہ اب رکاوٹ ختم ہوگئی اور قلعہ فتح ہوگیا۔ قوم سے شاید مبارک باد بھی مل گئی ہو، لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس کی حقیقت کَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً سے زائد نہیں ہے آدمی جب جنگل میں شکار کے لیے جائے تو دونوں آنکھیں کھول کر جائے جنگل میں شیر، چیتے اور بھیڑیئے بھی ہوتے ہیں صرف خرگوش اور ہرن وغیرہ ہی نہیں ہوتے، کہیں خود ان کا شکار نہ ہوجائے۔ مصنف خیر الکلام نے ایک آنکھ سے دیکھا اور دوسری کو بند کر دیا ہے یہ نہ سمجھے کہ لوگ تو دونوں آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہیں مجھے غلط کار ہی نہ کہہ دیں۔ ایک آنکھ سے دیکھنے والا ٹھوکریں کھایا کرتا ہے۔ بعض لوگ اسے اندھا نابینا بھی کہہ دیتے ہیں اعاذنا اللہ تعالیٰ من الغوایۃ والضلالۃ والحور بعد الکور۔ انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ حضرت امام رازیؒ، علامہ واحدیؒ کے قول کی تردید بھی کر چکے ہیں اور وہ حنفی المذہب بھی نہ تھے کہ مخالف سمجھ کر تردید کر دی، بلکہ کمال دیانت اور علمی روشنی میں حق گوئی کر رہے ہیں۔ وَاَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ کی ذمہ داری پوری کر گئے۔ (وللہ درہٗ) جیسے حضرت حافظ ابنِ حجرؒ نے ابنِ خزیمہؒ کی بات کی تردید کر دی ہے جس کا بیان گزر چکا ہے۔

Scanned by CamScanner

امام رازیؒ نے فرمایا: قال الواحدی الانصات ھو ترک الجھر والعرب تسمی تارک الجھر منصتاً وان کان یقرأ فی نفسہ اذا لم یسمع احداً یعنی واحدیؒ نے کہا کہ انصات کا معنی جہر نہ کرنا ہے۔ جہر نہ کرنے والے کو بھی اہل عرب کے محاورہ میں منصت کہا جاتا ہے۔ اگرچہ آہستہ پڑھتا بھی ہو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں لقائل ان یقول امرہٗ اللہ تعالیٰ اولاً بالاستماع واشتغالہ بالقرأۃ یمنعہ من الاستماع۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کو قرآن کی قرأت کے وقت استماع کا حکم دیا ہے اور اپنی قرأت کے ساتھ مشغول ہونا استماع سے روکتا ہے۔ والاستماع عبارۃ عن کونہ بحیث یحیط بذلک الکلام المسموع علی الوجہ الاکمل (الیٰ) فظھر ان الاشتغال بالقرأۃ ما یمنعہ من الاستماع۔ یعنی استماع کامل توجہ سے سننے کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنی قرأۃ کرنے کی صورت میں کلام مسموع کی طرف پوری توجہ نہیں رہتی تو مقتدی کا قرأت کرنا خواہ آہستہ ہی ہو استماع کے منافی ہے جب استماع کا لفظ پہلے آیت کریمہ میں آچکا ہے تو اس کے بعد انصات کے لفظ میں قرأت کرنے کی گنجائش کیسے کہی جاسکتی ہے؟ عنقریب بیان آنے والا ہے کہ علامہ واحدیؒ نے اس قول میں ابو سلمہؒ تابعی کے فتویٰ کا سہارا لیا ہے۔ امام رازیؒ نے اس کی بھی تردید کردی ہے۔

مزید سنئے کہ حافظ ابنِ حجرؒ نے بعض روایات کے مطابق کہ استماع کا لفظ خطبہ میں بھی آیا ہے تو وہاں یہی معنی انھوں نے بھی کیے اور اس کو تکلم کے منافی سمجھا۔ تکلم کا معنی کچھ پڑھنا خواہ وِرد وظیفہ ہو یا قرآن کی تلاوت ہو۔ قرأت کرنا بھی تکلم ہے۔ فتح الباری ص ۵۸/۲ باب الاستماع الی الخطبۃ یوم الجمعۃ کے بیان میں لکھتے ہیں: اشارۃ الی منع الکلام من ابتداء الخطبۃ لان الاستماع لا یتجہ اذا تکلم۔ یعنی تکلم آہستہ ہو یا کچھ اونچی آواز سے ہو۔ استماع مأمور کے مخالف ہے۔ یہی بات امام رازیؒ نے بھی فرمائی ہے تحصل قرأۃ المأموم مع قرأۃ الامام یفضی الی ترک الاستماع والی ترک السکوت عند قرأۃ الامام وذلک خلاف النص ۔ پہلے بھی یہ بیان آچکا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہو گیا کہ علامہ واحدیؒ کا انصات

Scanned by CamScanner

کے بارے یہ قول یعنی جہر نہ کرے اگرچہ آہستہ پڑھے، بالکل باطل ہے۔ اسی طرح مصنف خیر الکلام کا یہ کہنا بھی غلط اور لغو ہے قابلِ التفات نہیں۔ (پس ثابت ہوا کہ استماع اور انصات مقتدی کو قرأت سے نہیں روکتے) اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ خیر الکلام نامی دکان کے اکثر سودے خرید کے قابل نہیں ہیں کھوٹے اور ردّی ہیں۔ اپنی جماعت کے لوگ خریدیں تو ان کی مرضی۔ غبن فاحش ضرور پائیں گے۔ خسارہ ضرور ہو گا لیکن اور لوگوں کو خریداری سے بچنا ہی چاہیئے۔ مزید سنئے اور گزشتہ بات کی طرف پھر دھیان کیجئے کہ حضرت جبریل امین علیہ السّلام کے پڑھنے کے ساتھ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خفیہ پڑھا کرتے تھے اس سے آپ کو منع کیا گیا اور لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ فرمایا گیا اور نیز فَاِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ بھی حکمِ خداوندی نازل ہُوا اس کی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ نے استمع وانصت سے کی ہے تو یہ استمع وانصت اسی خفیہ قرأت کی بندش کے لیے ہی فرمایا گیا تھا اگر علامہ واحدیؒ اور مصنف خیر الکلام کی بات کو صحیح کہا جائے کہ یہ لفظ خفیہ قرأت سے منع نہیں کرتا تو حضرت ابنِ عباسؓ کی تفسیر بے محل بن جائے گی۔ فَاتَّبِعْ تو رکاوٹ کے لیے ہی آیا ہے۔ حضور علیہ السّلام اس کے نزول کے بعد خفیہ قرأت سے بھی رُک گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے بھی استمع وانصت کے فرمان کا معنی خفیہ قرأت سے ممانعت ثابت ہونا ہی سمجھا ہے۔ علامہ واحدیؒ اور ان کے تابعدار مصنف خیر الکلام نے یہاں جو کچھ لکھا ہے سراسر خلاف واقع ہے اور ظاہر ہی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے یہ دونوں لفظ سورۃ الاعراف کی آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ الآیۃ سے ہی لیے ہیں۔ اس طرح اس آیت کریمہ کا مقصد صریح طور پر مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے سے ممانعت کے لیے نازل ہونا ہی کہا جائے گا۔ (خواہ سرّاً اور خفیہ قرأت ہی ہو) وہ استماع اور انصات کے مخالف اور منافی کہی جائے گی۔

مصنف خیر الکلام کا ص ۳۹۶ پر یہ کہنا بھی غلط ہو گیا کہ آیت الاعراف میں انصات شور وغل اور کلام اور قرأت مشوشہ سے سکوت کرنے سے عبارت ہے۔ مصنف کتاب یہاں استماع کا لفظ کھا پی گئے ہیں تاکہ امام رازیؒ کے کلام کا چپت منہ پر نہ لگ جائے

صرف انصات کو لے لیا اور مطلب سازی کر دی۔ حالانکہ میں نے گزشتہ عرض کیا ہے کہ انصات کا لفظ بھی مطلق خاموشی کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اور امام رازیؒ نے بھی بتایا کہ استماع کے بعد انصات کے لفظ میں خفیہ قرأت کا جواز کہنا قطعاً باطل ہے۔ کما مرّ لہٰذا امام کے ساتھ خفیہ پڑھنے کا قول مذکورہ دلائل کے خلاف اور مردود ہے۔ غور فرمائیں کہ اگر یہ مانع نہ ہوتا تو اکثر محدثین حضرات اس کو چھوڑ کر سکتات میں پڑھنے کا راستہ کیوں اختیار کرتے؟ ہمارے زمانے کے اہل حدیث تو نام کے اہل حدیث ہیں۔ یہ حضرات جملہ ائمہ دینؒ محدثین کرامؒ کے خلاف چل رہے ہیں۔ حضرت امام ترمذیؒ کا فرمان گزر چکا ہے۔ واختار اھل الحدیث ان لا یقرأ الرجل مع الامام اور یہ نام کے اہلِ حدیث اس کو دیکھتے ہوئے سب مع الامام ہی پڑھتے ہیں۔ ان کو ان کے علماء نے دھوکہ دیا ہے۔

مصنف خیر الکلام ص۳۹۷ میں لکھتے ہیں۔ امام سے پہلے پیچھے اس کے ساتھ بھی پڑھنا جائز ہے ان کا یہ ساتھ ساتھ پڑھنے کا فتویٰ قرآن وحدیث اور جمہور محدثین کرامؒ کے خلاف ہے وہ سب اس سے بیزار ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا دھوکہ ہے۔ اسکی مفصل تردید احادیث کے بیان میں آنے والی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

فائدہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ (الآیۃ) کے بعد والی آیت کریمہ کا تذکرہ

اور اس پر فریقِ ثانی کے بعض حضرات کا شکوہ اور ان کے بیانات پر تبصرہ۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نماز عبادات میں سب سے اہم فریضہ ہے اور جماعت سے ادائیگی مأمور اور مطلوب ہے۔ جماعت کے لیے اذان بھی دی جاتی ہے۔ جماعت میں امام اور مأموم بھی ہوتے ہیں۔ امام ایک اور مقتدی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اور لاکھوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے قرآن کریم نے اذان کا تذکرہ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا الآیۃ میں کر دیا ہے۔ امام اور مقتدی دونوں کے بعض ضروری احکام بھی بیان فرما دیئے ہیں۔ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا۔ الآیۃ میں امام کی قرأت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ صلوٰۃ سے مراد قرأت ہے اور وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا

Scanned by CamScanner

لَہٗ وَاَنْصِتُوْا میں مقتدیوں کا وظیفہ بیان فرمایا ہے کہ امام کی قرأت کے وقت وُہ نہایت ہی خاموشی اور سکونِ قلبی سے سُنا کریں اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز باجماعت کے بعد کچھ اوراد و اذکار کا پڑھنا، تکبیر، تحمید اور تسبیح کا ورد کرنا بھی بتایا ہے۔ درود شریف دعا حاجات کرنے کی بھی تعلیم دی ہے۔ قرآن کریم نے جماعت سے فراغت کے بعد (جو فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا۔ الآیۃ سے مفہوم ہوتی ہے)۔ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً۔ الآیۃ۔ سے مقتدیوں کو مذکورہ وظائف کے پڑھنے کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی تعلیم حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے ترغیبی انداز میں تفصیلی طور پر دی ہے جس سے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا صحیح منظر سامنے آجاتا ہے۔ حضرت علامہ مفسر ابنِ کثیرؒ نے یہی بات فرمائی ہے کہ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ ... الخ۔ کی آیت کریمہ جماعت کی ادائیگی کے بعد والے اوراد و اذکار کے بیان کے لیے لائی گئی ہے اور قرینہ بھی یہی چاہتا ہے کیونکہ گزشتہ آیت کریمہ میں چونکہ جماعت کا مسئلہ تھا۔ ضمیریں اور صیغے سب جمع کے لائے گئے ہیں فَاسْتَمِعُوْا، وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ اور تُرْحَمُوْنَ۔ لیکن اس کی بعد والی آیتِ کریمہ میں صیغے اور ضمیریں سب مفرد کی صورت میں لائی گئی ہیں کیونکہ اوراد، اذکار، ادعیہ سب منفردانہ انداز میں ہی ہر شخص اپنی خواہش اور پسند کے مطابق پڑھا کرتا ہے۔ فرمایا: وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِیْنَ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوّل آیتِ کریمہ میں داخلِ جماعت لوگوں کو خطاب ہے اور جمع کے صیغے اس پر دال ہیں اور دوسری آیتِ کریمہ میں خارجین از جماعت کا ذکر ہے یعنی بصیغہ مفرد ذاکرین اور حامدین کو خطاب کیا گیا ہے کیونکہ ہر شخص انفرادی طور سے اذکار و اوراد پڑھا کرتا ہے۔ اوّل وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ میں ذکرِ خفی کا بیان ہے جس کو ذکرِ قلبی کہتے ہیں یا وہ لسانی ذکر جس میں آواز پیدا ہو اور دُوْنَ الْجَھْرِ میں ذکر بالجہر کا تذکرہ ہے جیسے کہ بعض صوفیائے کرامؒ کے کلام میں اپنی شرائط کے ساتھ پایا جاتا ہے اور دُوْنَ الْجَھْرِ سے جہرِ لغوی

Scanned by CamScanner

سے کم ہونا مراد ہے، جیسے لَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ میں کہا گیا ہے۔ کسی موقع میں جب حضرات صحابہ کرامؓ نے زیادہ اونچے انداز سے جہر کیا تو آپؐ نے فرمایا: اربعوا علی انفسکم انکم لا تدعون اصم ولا غائبا۔ (بخاری ص۴۲۰ ج۱)، یعنی زیادہ چلّا کر نہ پڑھو بہر حال مغرب، عشا اور فجر کی نمازوں میں جو جہر کیا جاتا ہے وہ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ کے مخالف نہیں بنتا۔ یہ خفتی جہر ہے اسی کو دُوْنَ الْجَهْرِ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا تذکرہ اگرچہ گزر چکا لیکن اس وقت ایک مقصد کے لیے اس کو لایا گیا۔ تاکہ یاد دہانی ہو جائے قاضی بیضاویؒ نے بھی آیت کریمہ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ کا مقصد وہی بتایا ہے جو حافظ ابنِ کثیرؒ نے بیان کیا ہے کہ اس میں نماز کے بعد اوراد و اذکار کے وظائف پڑھنے کا تذکرہ ہے۔ لیکن بعد میں مذہبی پاسداری کرتے ہوئے ایک احتمال یہ بیان کر دیا کہ یا مقتدی کو حکم ہے کہ امام کی قرأت سے فارغ ہو جانے کے بعد وہ قرأت کرے۔

او امر للمأموم بالقرأة سرًّا بعد فراغ الامام من قرأته کما هو مذهب الشافعیؒ اس کو پہلی آیت سے بلا وجہ ملا دیا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اَيُّهَا الْمُسْتَمِعُ اور اس میں ان ضمیروں کے مفرد لانے کی توجیہہ کی لیکن اس طرح آیت کے ظاہر سیاق کے خلاف کرنا اس کے لیے کوئی معقول نکتہ بیان کرنا ہوگا جیسے وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ میں کہا جاتا ہے ورنہ بظاہر انسب یہی تھا کہ واذکروا ربکم فی نفوسکم وَلَا تكونوا من الغافلين کہا جاتا تاکہ پہلی آیت کریمہ کی جمع کی ضمیروں سے مطابقت ہو جاتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی پیش نظر رہے کہ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ سے صرف فاتحہ کا پڑھنا کیسے مراد لی جائے گی جب کہ آپ حضرات نے القرأة سرًّا سے فاتحہ کا پڑھنا ہی مراد لی ہے نیز یہ بھی بتانا ہوگا کہ بعض روایات میں اسی فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کے بارے نزلت فی الخطبة بھی آیا ہے۔ اس تقدیر پر وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ کا کیا معنی اور مصداق ہوگا؟ کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ آہستہ آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھا کریں؟ یہ باتیں ضمنی طور سے ذکر گئی ہیں۔ اس وقت بات چیت اہل حدیث حضرات سے ہو رہی ہے جو آگے آ رہی ہے۔

Scanned by CamScanner

پہلی بات تو یہ ہے کہ فاضل اہل حدیث مؤلف خیر الکلام کی باتیں مَیں نے کئی دفعہ نقل کیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ انصات کا لفظ آہستہ پڑھنے سے منع نہیں کرتا۔ مراد یہ ہے کہ جہر نہ کیا جائے۔ قرأتِ مشوشہ نہ کی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مراد باتوں سے ممانعت ہو۔ آپ نے قاضی بیضاویؒ کے کلام کو بھی دیکھا اور پڑھا وہ فرماتے ہیں: اوامر للمأموم بالقرأۃ سرًّا بعد فراغ الامام من قرأتہ۔ اگر امام کے ساتھ ساتھ پڑھنا ہو سکتا تو قاضی بیضاویؒ بعد فراغ الامام من قرأتہ کیوں فرماتے؟ آپ لوگ تو امام کے ساتھ ہی پڑھا کرتے ہیں۔ آپ بتائیں کہ اس میں آپ کے ساتھ محدثین کرامؒ میں کون کون ہے۔ محدثینِ کرامؒ کا مذہب بھی ترمذی ص۷۲ سے کئی بار نقل ہو چکا ہے کہ وہ بھی مع الامام قرأت منع کرتے ہیں۔ آپ کو امام کے پیچھے صرف فاتحہ کا پڑھنا ثابت کرنا کافی نہیں ہوگا۔ آپ اپنی چال کی درستی کریں۔ فانتہی النّاس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ حضرت امام زہریؒ کا قول یا حضرت ابوہریرہؓ کا فرمان بھی ثابت ہو چکا ہے اس سے معلوم ہوا کہ چودھویں صدی کے نام نہاد اہلِ حدیث اکثر حضراتِ محدثین کرامؒ کے امام کے پیچھے فاتحہ خوانی کے عمل میں مخالف چل رہے ہیں۔

آمدم برسرِ مطلب مَیں نے بعض غیر مقلدین کا رسالہ دیکھا جس کا نام فتاوٰی اولیاءِ کرامؒ رکھا گیا ہے اور اس کے شائع کرنے والے اوکاڑہ کے بعض اہلِ حدیث ہیں۔ اس میں حنفیہ پر الزام لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ فاتحہ خلف الامام نہ پڑھنے کے دلائل میں آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا پیش کرتے ہیں اور آگے نہیں دیکھتے کہ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ... الخ بھی آرہا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امام کے پیچھے خفیہ طور سے قرأت کی جا سکتی ہے ہاں اونچا نہ پڑھیں۔ یہ تو اس طرح ہُوا کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ پڑھ کر وَاَنْتُمْ سُکَارٰی کو چھوڑ دیا جائے۔ اس پر بڑی خوشی منائی گئی۔ شاید قوم نے شاباش بھی کہی ہوگی۔ ان کو کہیں سے کوئی گری پڑی بات حنفیہ کے خلاف مِل جائے، لے اُڑتے ہیں۔ مالِ غنیمت سمجھ لیتے ہیں، اور رسائل کی شکل میں اُسے آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ بات کو سوچتے نہیں۔ تحقیق نہیں

Scanned by CamScanner

کرتے کہ کھرا اور کھوٹا ہونا معلوم کریں ۔ اس کو جلد بازی کہتے ہیں اس میں کبھی پچتانے کی نوبت بھی آجاتی ہے لیکن جس کی عادت ہی تخریب کاری ہو وہ اس کو ہنر سمجھتا ہے اور ایسے لوگ ہُنر سمجھنے کی وجہ سے یکے بعد دیگرے اپنی کتابوں میں اسی آیت کریمہ سے احنافؒ کے خلاف استدلال کرتے ہُوئے بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں اور پھولے نہیں سماتے ۔ چنانچہ صاحب توضیح الکلام نے بھی صـ۱۱۱ سے صـ۱۱۸ تک اسی آیت کریمہ سے احنافؒ کے خلاف نام نہاد گلہائے تحقیق بکھیرنے کی اپنی بساط سے کہیں بڑھ کر کوشش کی ہے اور بحث و استدلال کا حجم بڑھانے کے لیے دُور از کار باتیں بھی بنائی ہیں لیکن خلافِ واقعہ بات کو ثابت کرنے کے لیے کتنی بھی کوشش کی جائے ثابت نہیں ہوسکتی اور اس سے سلیم الفطرت آدمی کی باوجود لبیارگوئی کے تسلی بھی نہیں ہوتی ۔ ہاں البتہ جہلاً پیروکاروں سے دادِ تحقیق ضرور مل جاتی ہے اور شہرت خواہ مصنفین کو مطلوبہ شہرت بھی حاصل ہوجاتی ہے ۔ طُرفہ یہ کہ صاحبِ توضیح الکلام اپنی تصنیف میں جا بجا اپنے مخصوص انداز میں احناف کے خلاف بحث کرتے ہوئے اپنی محدُود علمیّت کی بنا پر جب چند سطور لکھ کر مزید بحث کرنے سے عاجز آجاتے ہیں تو اپنے پیروکاروں کو اپنی علمی مزیت باور کرانے کے لیے اور قارئین کا ذہنی رُخ اپنی قابلیت کی طرف موڑنے کے لیے جلدی سے اپنی جان چھڑانے اور محدود علمی قابلیت کے بھرم کُھلنے کے خدشہ کی بنا پر جھٹ لکھ دیتے ہیں کہ انشاء اللہ اس کی مزید تفصیل آئندہ کسی موقع پر آئے گی ۔ لیکن قارئین دیانت داری سے ساری کتاب اوّل سے آخر تک پڑھ کر دیکھ لیں کہ ان کی کافی ابحاث کے متعلق موعودہ تفصیل شاید ہی کسی جگہ ملے ۔ ان کے اس رویّہ پر جتنی بھی دادِ عیاری دی جائے کم ہے لیکن بے چارے ایک حد تک معذور بھی ہیں کیونکہ ان کے اسلاف نے ان کو طریقہ ہی یہی سکھایا ہے اور پوری جماعتِ اہلِ حدیث ہی اس طریقے کی حامل ہے لیکن ان کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ جعل سازی وبالِ جان بلکہ نقصانِ ایمان بھی بن سکتی ہے کیونکہ اس میں فریب کاری کے علاوہ تحریفِ قرآن بھی ہے ۔ جو الزام دوسروں پر لگانا چاہتے تھے اسی میں وہ خود مبتلا ہیں ۔ من حفر بئرا لاخیہ فقد وقع فیہ ۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ من ذٰلک ۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے (ومن

Scanned by CamScanner

سیّد محمد ذاکر علی
شاہ حسنی

اللہ التوفیق والھدایۃ) کہ آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کا نماز کی جماعت کے بارے میں نازل ہونا تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ جو بالاجماع ثابت ہے۔ ہاں خطبہ جمعہ اور عیدین کو بھی لفظی عموم سے اس میں لیا جا سکتا ہے۔ کما مرّ۔ بہرحال اس میں سامعینِ خطبہ اور حاضرینِ جماعت دونوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا وظیفہ وقت کامل خاموشی اور سکونِ قلبی سے مسموع ہدایات میں تدبّر و تفکّر کرنا ہے اور سرّی نمازوں میں انصات کرنا ہے یہ حکم مقتدی کو قرأت خلف الامام سے مانع بنتا ہے۔ امام رازیؒ کا فرمان گزر چکا ہے کہ وہ استماع کے حکم کو نہی عن القرأت کے معنوں میں کہتے ہیں۔ مخالفین حضرات نے آیتِ کریمہ کی زد سے بچنے کے لیے مختلف حیلے اور بہانے بنائے ہیں بعض کا تذکرہ مع مالہٗ وما علیہ گزر چکا ہے۔ فی الحال اس کے بعد والی آیتِ کریمہ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ الآیۃ۔ کی طرف توجہ کرنی کرانی ہے۔ فریقِ ثانی کا خیال ہے کہ اس آیت میں مقتدی کو حکم دیا گیا ہے کہ امام کے پیچھے خفیہ انداز کی قرأت کی جائے، اونچا نہ پڑھا جائے جیسے ابھی مذکور ہو چکا۔

فیصلہ: آیت کے مفہوم اور مصداق متعین کرنے میں سب سے اوّل حضراتِ صحابہ کرامؓ کے ارشادات کو دیکھنا چاہیئے اس کے بعد وہ قول جو نظمِ قرآنی کے قریب تر ہو اس کو لیا جائے جو معنی بعید مناسبت اور پیوند کاری سے بنایا جائے اس کو نظر انداز ہی کرنا چاہیئے۔ اصول کے مطابق سب سے مقدم حضرت ابنِ عباسؓ مفسّرِ قرآن کا قول دیکھئے۔ جلالین ص۱۴۷ کے حاشیہ میں ہے: عن ابن عباسؓ المراد بالذکر القرأۃ یعنی وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ میں ذکرِ رب سے مُراد قرآن کریم کی قرأت کرنا ہے پھر فرمایا: اُمِروا بالسّر فِی الصّلٰوۃ السرّیۃ وَدُوْنَ الْجَھْرِ فی الجھریۃ یعنی اس آیتِ کریمہ میں حکم دیا گیا ہے کہ سرّی (یعنی دن کی نمازوں) میں قرأت خفیہ کی جائے اور (رات کی) جہری نمازوں میں قرأت ما دُون الجہر کے انداز کی کی جائے۔ اس جگہ حاشیہ میں لکھا ہے:۔

الجھر ما یسمعہ البعید۔ وما یسمعہ القریب فھو متوسط یعنی جہر کا لفظ قرآن کریم میں چلّانے کے لیے مستعمل ہُوا ہے جو دُور تک آواز کے پہنچانے کے لیے کیا

Scanned by CamScanner

جاتا ہے۔ یہی لغوی معنی ہیں۔ اسی لحاظ سے فرمانِ الٰہی: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ اے بِقِرأتك آیا ہے یعنی زیادہ بلند آواز سے نہ پڑھا کریں۔ یہ امام کی قرأت کی مقدار کے بارے میں آیا ہے۔ اس سے مراد مغرب، عشاء، فجر کی نمازوں کی قرأت کی مقدار بتانا ہے اس میں منفی جہر لغوی جہر ہے اور فقہاء کرامؒ ان کی نمازوں کو جہری کہا کرتے ہیں وہ فقہی، شرعی اصطلاحی جہر ہے۔ اسی کو وما یسمعه القریب فهو متوسط کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا کے فرمان میں یہی معنی بتائے گئے ہیں۔ دیکھئے اس مذکورہ آیتِ کریمہ میں معطوف یعنی وَدُوْنَ الْجَهْرِ سے بھی یہی معنی ارادہ کیے گئے ہیں۔ یعنی ایسے انداز کی قرأت کی جائے کہ قریب والے لوگ سُن لیں اور دُور تک آواز پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے۔ لَا تَجْهَرْ میں اسی کی نفی کی گئی ہے اس کا تذکرہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

الحاصل: آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا میں چونکہ مقتدی کا امام کے پیچھے وظیفہ وقت بیان کیا گیا ہے اسی لیے اس میں سب صیغے جمع کے لائے گئے ہیں۔ اس لیے کہ امام کے پیچھے مقتدی کثیر تعداد میں ہوتے ہیں۔ ان کا حکم استماع وانصات ہی بیان کیا گیا ہے اور اس کے متصل بعد والی آیت کریمہ یعنی وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ ... الخ میں امام کا وظیفہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ دن کی نمازوں میں خفیہ قرأت کیا کرے جس کو سرّاً پڑھنا کہتے ہیں اور قسمِ ثانی یعنی معطوف وَدُوْنَ الْجَهْرِ میں رات کی نمازوں کی قرأت کا حال بیان کیا گیا ہے کہ ان میں قرأت جہر سے کی جائے لیکن اتنا اونچا نہ پڑھا جائے جو چلّانے کی حد ہوتی ہے۔ اس کے بعد غور فرمائیں کہ اس آیتِ کریمہ میں یہ قرأت کرنے والا سرّی ہو یا جہری امام ہی ہو گا اسی لیے اس کے بیان میں وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ اور آخر میں فرمایا وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ہے اس میں دو صیغے مفرد کے اور دو ضمیریں مفرد کی لائی گئی ہیں کہ پڑھنے والا ایک امام ہی ہوتا ہے اور گزشتہ آیتِ کریمہ میں چونکہ مقتدیوں کا حکم تھا وہاں تین صیغے اور ایک ضمیر جمع کی ذکر کیے گئے۔ فَاسْتَمِعُوْا[1] لَهٗ، وَاَنْصِتُوْا[2]، لَعَلَّكُمْ[3]، تُرْحَمُوْنَ[4]۔

Scanned by CamScanner

یہ حضرت ابنِ عباسؓ کے فرمان کے مطابق باتیں ذکر کی گئی ہیں کہ انھوں نے فرمایا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ میں ذکر سے قرأت کرنا مُراد ہے بحوالہ حاشیہ جلالین ص۱۴۱ اور اسی فرمان کو صاحب توضیح الکلام نے بھی ص۱۱۵ پر علامہ قرطبیؒ کے الفاظ قدروی سے ذکر کیا ہے اور ذکر کر کے بڑی خوش فہمی سے فتح کے خواب وخیال دیکھے ہیں۔ لیکن وہ بگوش ہوش سُن لیں کہ حضرت ابنِ عباسؓ کے فرمان کا یہی مطلب ہے جو اُوپر بیان ہُوا۔ وہ مطلب نہیں جو آپ کشید کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ یہ کہہ دیں۔ ؎

بہار آئی ہے غنچے کھِل رہے ہیں مرے دل! تو بھی دو دن مُسکرا لے

لیکن حضرت ابنِ عباسؓ کے فرمان کے برعکس حافظ ابنِ کثیرؒ اور بعض اور مفسرین کرامؒ کے فرمان کے مطابق اس آیت کریمہ کا محل اور اس کے حکم کا مصداق وہ حضرات ہیں جو نماز کے بعد یا مختلف اوقات میں تسبیح، تہلیل، درود شریف، ادعیہ اور اذکار پڑھا کرتے ہیں اذکار واوراد کے پڑھنے والے ہر ایک اپنے اپنے مناسب حال انفرادی طور سے اوراد و اذکار پڑھا کرتے ہیں اس لیے آیت کریمہ میں مفرد صیغے لائے گئے ہیں اور ضمیریں بھی۔ بہر حال یہ آیت پہلی آیت کا تتمہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کو فَاسْتَمِعُوْا وَاَنْصِتُوْا کا خطاب کیا گیا۔ انہی کو اس میں بھی خطاب کیا گیا ہو؟ اگر حضرت ابنِ عباسؓ کی تفسیر کو دیکھا جائے تو اوّل مخاطب مقتدی ہیں اور اس ثانی میں امام کو ہدایت کی گئی ہے کہ دن کی نمازوں میں خفیہ سرّاً قرأت کرے اور رات کی نمازوں میں جہر سے قرأت کرے لیکن زیادہ اونچا نہ پڑھے۔ اس تقدیر پر یہ کہنا درست نہیں کہ حنفیہ اوّل آیت کو پڑھتے ہیں اور دوسری کو نہیں دیکھتے کہ حکم دیا گیا ہے کہ استماع کرنے والو خفیہ قرأت کر سکتے ہو اور اگر بقیہ مفسرین حضرات کے فرمان کو دیکھا جائے تو اوّل میں جماعت والے لوگ مخاطب ہیں اور دوسری میں ادعیہ واذکار پڑھنے والے حضرات مُراد ہیں کہ تم خفیہ پڑھو تو پڑھ سکتے ہو اور جہر متوسط بھی کر سکتے ہو۔ ان کو پہلے لوگوں کا حکم نہیں دیا گیا کہ تم سُنتے ہوئے بھی خفیہ قرأت کر سکتے ہو۔ جیسے کہ صاحب خیر الکلام وصاحب توضیح الکلام اس بات پر مُصر ہیں کہ انصات اور خفیہ قرأت آپس میں منافی نہیں۔ جیسے کہ ان کا قول بار بار گزر چکا ہے۔ ان کا اعتراض بہر حال لغو ہے۔

اسی لیے مفسّر کبیر حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر ابنِ کثیر ص۴۶۳ میں ان لوگوں کے قول کی تردید کی جو اس ثانی آیت کو پہلی کا تتمّہ بناتے ہیں۔ فرماتے ہیں: قد زعم ابن جریر وقبله عبد الرحمن بن زيد بن اسلم ان المراد بها امر السامع للقران فی حال استماعه بالذکر علی هذه الصفة وهذا بعيد مناف لِلانصات المأمور۔ آخر میں فرمایا: فهذا الذی قالا لا يتابعا عليه۔ یعنی امام ابن جریرؒ اور عبدالرحمٰنؒ بن زیدؒ نے اس آیت وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ کی تفسیر میں فرمایا کہ اس خطاب سے وہی لوگ مراد ہیں جو اوّل آیت فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَاَنْصِتُوا میں مخاطب تھے۔ یعنی اے قرآن کو سُننے والو استماع کرتے ہُوئے خداوند تعالیٰ کا ذکر آہستہ کرتے رہا کرو۔ غافل نہ بننا۔ جب ذکر کر سکتے ہیں تو قرآن بھی مخفی طور سے پڑھ سکتے ہیں۔ اس طرح فاتحہ خلف الامام کی گنجائش انھوں نے بزور نکالی۔ لیکن اس کے بعد مفسّر ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا انصات مأمور کے منافی ہے۔ جو گزشتہ آیت میں مذکور ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے اور کسی مفسّر نے ان دونوں کی اس بات میں موافقت نہیں کی اور اس کو نہیں لیا بلکہ یہ کہنا استماع مأمور کے بھی مخالف ہے جیسے امام رازیؒ کے کلام میں مفصل گزر چکا ہے۔ مزید غور فرمائیں تو یہ معنیٰ سیاق وسباق کے بھی مخالف ہے اس کا تعلق اگر ان سابق لوگوں سے ہوتا تو سابق کی طرح اس آیت کریمہ میں بھی صیغے اور ضمیریں جمع کی لانی مناسب تھیں وَاذْكُرُوا رَبَّكُمْ فی نفوسكم تضرعا وخيفة ودون الجهر (الیٰ) ولا تكونوا من الغافلين۔ جیسے گزشتہ آیت میں مذکور ہے۔ آیت میں سیاق کا بدلنا عاقل و فہیم کے لیے قوی حجّت ہے کہ دوسری آیت کریمہ یعنی وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ میں مخاطب وہ لوگ نہیں ہیں جو اوّل میں ہیں۔ یہی حضرت ابنِ عباسؓ نے سمجھا جیسے ان کا فرمان گزرا۔ یہی مفسّر حافظ ابنِ کثیرؒ اور تمام دیگر مفسّرین کی رائے ہے۔ جیسے ابھی معلوم ہُوا۔ زمانہ حال کے اہلِ حدیث شیشہ لے کر اپنے منہ کو دیکھ لیں کہ ان کے مروّج عمل فاتحہ خلف الامام کا جہری نمازوں میں ساتھ ساتھ پڑھنے پر کسی مفسّر و محدّث کا عمل نہیں ہے محض غلط کاری ہے، جو کر رہے ہیں۔ ابھی آپ نے حضرت حافظ ابنِ کثیرؒ کے کلام میں دیکھا پڑھا کہ اس طرح کہنے

Scanned by CamScanner

والے صرف ابنِ جریرؒ اور عبدالرحمٰنؒ بن زیدؒ ہی ہیں اور کوئی بھی مفسّر اور محدّث ان کی موافقت کرنے والا نہیں ہے۔ ھٰذا الذی قالا لا یتابعا علیہ۔ ہم نے پہلے امام بخاریؒ کا فرمان نقل کیا کہ وہ سکتات میں پڑھنا کہتے ہیں۔ حافظ ابنِ حجرؒ امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے کو ارتکاب منہی کہتے ہیں۔ حوالہ گزر چکا ہے انہ یوقعہ فی ارتکاب المنہی اور حافظ ابنِ تیمیہؒ کا قول بھی کہ وہ ایسے لوگوں کے بارے میں کَمَثَلِ الْحِمَارِ فرماتے ہیں گزر چکا ہے امام ترمذیؒ کا فرمان بحوالہ ص۷۲ بھی گزر چکا ہے کہ اکثر محدثینؒ سکتات میں پڑھنے کے قائل ہیں یہ بتائیں کہ معیت امام کی پڑھنے میں کس کس نے کہا ہے؟ بے چارے نام نہاد اہلِ حدیث عوام کو دھوکہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ خدا کے لیے ان پر رحم کریں ان کو سچ سچ بتائیں ورنہ اس غلط چال کی ذمہ داری علماء اہلِ حدیث پر ہوگی۔

خیر الکلام والے کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ سب صورتیں جائز ہیں۔ آگے پڑھے، پیچھے پڑھے، ساتھ ساتھ پڑھے مگر سلف صالحینؒ کا عمل معیت میں پڑھنے کا بتائیں جس کے وہ مدّعی ہیں۔ قاضی بیضاویؒ نے بھی جمہور مفسرینؒ کرام کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے کہ آیتِ کریمہ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ میں تسبیح، تحمید، ادعیہ، اذکار کا بیان کرنا مقصود ہے کہ معمولی جہر اور اخفاء دونوں پڑھے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایک احتمال یہ بھی بیان کیا گیا ہے: اوامر للمأموم بالقرأۃ سرّا بعد فراغ الامام من قرأۃ الفاتحہ کما ھو مذھب الشافعیؒ یعنی اس کو پہلی آیت کا تتمّہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کی اس میں اجازت دی گئی ہے لیکن امام کے فاتحہ پڑھنے سے فارغ ہو جانے کے بعد جیسے کہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ اس میں امام بیضاویؒ نے مذہبی پاسداری کرتے ہوئے خلافِ ظاہر آیتِ کریمہ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ کو ماقبل والی آیت کا تتمّہ بنا کر فاتحہ خلف الامام کی گنجائش نکالی مگر امام کے قرأت سے فارغ ہونے کے بعد جس کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن غیر مقلدوں کی طرح ساتھ ساتھ پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ امام کے فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد فاتحہ خوانی کا ارشاد فرمایا۔ وہ جانتے ہیں کہ مقتدی کا امام کے ساتھ فاتحہ خوانی کرنا گناہ ہے،

Scanned by CamScanner

قبیح ہے۔اس لیے بعد فراغ الامام من الفاتحۃ پڑھنا کہا اسی لیے ہم نے عرض کیا تھا کہ حضرات محدثینؒ ومفسرینؒ عامۃً اس کے خلاف ہیں۔حضراتِ اہلِ حدیث کو فاتحہ خوانی ہی کرنی ہے تو ان حضراتِ شافعیہؒ کے موافق چلیں مقلدین کی ایک جماعت کا سہارا تو حاصل ہو جائے گا اب تو وہ متفرد ہیں۔ہیں صرف خلف الامام فاتحہ خوانی میں تفرد نہیں کہتا بلکہ انھوں نے جو جگہ پڑھنے کی تجویز کی ہے اس میں تفرد کہتا ہوں۔مفسّر حافظ ابنِ کثیرؒ نے صرف دو کا نام لیا ہے کہ وہ مع الامام پڑھنا کہتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کی تردید بھی انھوں نے کر دی ہے اور تردید نہایت صحیح کی ہے،قوانینِ کتاب وسنّت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی ہے اور وہ حنفی بھی نہیں ہیں کہ اس کو ضد پر محمول کیا جائے۔

گزشتہ باتوں کو دیکھ لیا جائے۔اس کے بعد قاضی بیضاویؒ کے تجویزی احتمال کو بھی دیکھ لیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ بھی بے جان ہے آپ جانتے ہیں کہ احتمالات سے دلیل نہیں بنتی۔خاص کر جب کہ وہ احتمال خلاف ظاہر بھی ہوں دیکھیے قرآنِ کریم نے وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ عام ذکر رب فی النفس فرمایا ہے۔اقراء فی نفسك نہیں فرمایا کہ آپ خفیہ قرأت خلف الامام اور پھر مع الامام کی اجازت اس سے نکالیں عام ذکر رب فی ایِّ وقت کی تفسیر یہ بیان کی گئی ہے ھو عام فی الاذکار من قراۃ القراٰن والدّعاء والتّسبیح والتھلیل۔(تفسیر مدارک)

دوسری بات کو بھی دیکھیں کہ ماقبل کی آیت میں خطاب اور طرح بصیغہ جمع ہے۔ اور اس آیتِ کریمہ میں اور طرح بصیغہ مفرد ہے۔تفصیل گزر چکی ہے۔اس لیے ان کا بیان کردہ احتمال اوامر للمأموم بالکل خلاف ظاہر ہی ہوا۔اسی کو ایجادِ بندہ کہتے ہیں۔

قاضی بیضاویؒ نے بھی اوّل میں عام مفسرینؒ کے موافق آیت کا محمل عام ذکر،تسبیح اور تحمید وغیرہ بتا کر پھر فرمایا: اوامر للماموم بالقرأۃ سرّا۔یہ احتمال ہی کے درجے میں فرمایا۔البتہ قرأت سرّا کو بعد فراغ الامام من الفاتحۃ سے مقید کر دیا اور کما ھو مذھب الشافعیؒ فرما کر یہ واضح کر دیا کہ حضرت امام شافعیؒ بھی ساتھ ساتھ پڑھنے کے قائل نہیں ہیں تاکہ انصات مأمور اور استماع مذکور کے خلاف نہ بنے۔

Scanned by CamScanner

حضرت عبدالرحمٰنؒ بن زیدؒ نے اگرچہ حین الاستماع ہی قرأت کرنا کہا تھا جیسے کہ گزر چکا ہے اور اس کی تردید بھی اسی وجہ سے کی گئی ہے کہ یہ انصات مأمور کے خلاف ہے لیکن قاضی بیضاویؒ نے اس سے بچاؤ کر لیا اور بعد فراغ الامام من الفاتحۃ فرمادیا۔ لیکن اس میں یہ احتمال ہی کہ مقتدیوں کو حکم ہے کہ سرّاً قرأت کریں، نظمِ قرآنی کے خلاف ہے اسی لیے بعض مفسّرین حضرات نے اس کا مصداق امام کی قرأت سرّاً اور ما دُون الجهر ہونا فرمایا۔ جیسے کہ حضرت ابنِ عباسؓ کے کلام میں گزرا ہے اور بعض حضرات نے اس کا مصداق عام اذکار و اوراد جو انفرادی طور سے پڑھے جاتے ہیں قرار دیا کہ اس میں ذکر بالسّر و بالجہر کا بیان ہے جیسے کہ بعض حضرات صوفیائے کرامؒ کے کلام میں بشرائط اس کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد میں اہلِ حدیث حضرات سے (جو دوسری آیت کو مقتدیوں کا مسئلہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں مقتدیوں کو کہا گیا کہ وہ امام کے پیچھے قرأت کریں لیکن سرّاً پڑھا کریں۔ یعنی وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ سے یہی مُراد ہے ہے۔) کہتا ہوں کہ اس کے بعد آیت میں اس کا معطوف وَدُوْنَ الْجَهْرِ واؤ عاطفہ سے مذکور ہے اس کو بھی ساتھ ملانا ہوگا کہ امام کے پیچھے خفیہ یعنی سرّاً پڑھا کرو۔ اور دُوْنَ الْجَهْرِ یعنی مغرب، عشاء اور فجر جیسی قرأت بھی کر سکتے ہو کہ جہر تو ہو مگر زیادہ نہ ہو اس میں تو آہستہ اور کم درجے کا جہر دونوں جمع ہو گئے۔ معطوف علیہ کو لے لینا اور معطوف سے نظر ہٹا لینا وہی لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ کو پڑھنا اور وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى سے خاموش رہنا ہی بنتا ہے۔ کیا امام کے پیچھے اس کے پڑھتے ہوئے یا بعد الفراغ من الفاتحۃ اس طرح کی قرأت کرنا جائز ہے؟ یہ سوال قاضی بیضاویؒ کے احتمال او امر للمأموم بالقرأۃ سرّاً پر بھی وارد ہوتا ہے کیونکہ بالقرأۃ سرّاً کے بعد دُوْنَ الْجَهْرِ بھی مذکور ہے۔ جس کا معنی یہ ہو جائے گا کہ مقتدیوں کو جہر سے کم درجہ کی قرأت بھی جائز ہے اسی لیے جلالین ص۱۴۵ میں فرمایا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ سرّاً وفوق السّرّ وَدُوْنَ الْجَهْرِ یعنی ذکر دونوں طرح جائز اور درست ہے۔ آپ لوگوں نے تو اس کو مقتدی کا حکم بنا دیا۔ فاضل اہلِ حدیث اوکاڑوی نے رسالہ میں جو معنی

کیے ہیں۔ آہستہ قرأت کیا کرو، اونچا نہ پڑھا کرو۔ یہ تحریف ہے۔ واؤ عاطفہ کا معنی چھوڑ ہی گئے دو قسموں کی بجائے ان کو ایک ہی بنا دیا ہے یہ سب چالاکی ہے جو مطلب سازی کے لیے کی گئی ہے۔ (اعاذنا اللہ من ذٰلک) اسی لیے میں عرض کرتا ہوں کہ اے حضرات! معطوف یعنی وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ کو بھی ساتھ ملا کر مسئلہ بیان کیا کیجئے۔ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ۔ اسی آیت کے آخر میں آیا ہوا ہے۔ فاضل اوکاڑہ مصنف رسالہ فتاوٰی اولیائے کرام کی طرح فاضل مصنف خیر الکلام بھی اسی راستے پر چلے ہیں۔ شاید آپس میں اُستاد شاگرد ہی ہوں۔ خیر الکلام ص۶۸ کو دیکھ لیں مصنف فاضل نے آیتِ کریمہ لکھی اور ترجمہ صرف اوّل حصّے معطوف علیہ کا کر دیا اور وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ کا ترجمہ ہی چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس میں گلے پر چھری چلتی ہے اوّل حصّہ مطلب سازی کے لیے قوم کے سامنے پیش کر دیا اور دوسرے حصّے کو کھا پی گئے۔ جو چال یہودی عالم نے آیتِ رجم میں چلی تھی۔ یہ تحریف اسی کی طرح ہے یا نہیں؟ صاحب خیر الکلام نے حیا کے مارے آیت تو پوری لکھ دی۔ ترجمہ آدھی کا اُڑا گئے اور ان کے شاگردِ رشید صاحب توضیح الکلام نے تو ذرا قوی چال چلی اور آیتِ کریمہ بھی وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً تک لکھ کر مطلب سازی کی۔ مگر وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ کے الفاظ لکھنے کی ہمّت ہی نہ ہوئی کہ شاید جہلاء پیروکاروں میں سے کوئی بے چارہ معمولی سمجھ کی بنا پر جرأت کر کے اس لفظ کا ترجمہ ہی پوچھ بیٹھے اور راز فاش ہونے پر کہیں شرمندگی ہی نہ اُٹھانی پڑے اس لیے انھوں نے ذرا چالاکی کر کے آدھے لفظ ہی اُڑا دیئے۔ اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اسی توضیح الکلام ص۱۱۱ پر اسی آیت کی من مانی اور پسندیدہ تفسیر جن کر امام ابنِ جریرؒ کا حوالے دیتے ہوئے ان کے جو الفاظ نقل کیے ہیں اس کے آخر میں وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ کے الفاظ تو نقل کر دیئے ہیں لیکن ان الفاظ کے معنیٰ سے بالکل آنکھیں بند کر گئے ہیں۔ کاش کہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب لست" کی طرح ایک مقولہ "ایں خانہ ہمہ چالبازاست" بھی ہوتا جو ان جیسے استادوں اور شاگردوں پر صادق آتا۔ مگر بایں ہمہ وہ موردِ الزام احنافؒ کو قرار دیتے ہیں جن کا دامن دلائل اور صبر و وفا سے لبریز ہے۔

؎ ہے سُنّت اربابِ وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ خدا دیکھ

جو الزام فاضل اوکاڑوی نے ہم پر لگایا تھا کہ حنفیہ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ پڑھتے ہیں آگے نہیں جاتے حالانکہ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ بھی آیا ہوا ہے یعنی آہستہ سے قرأت کرلیا کرو۔ یہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ کا پڑھنا اور وَاَنْتُمْ سُكَارٰى سے خاموشی ہے۔ یہی بات آپ حضرات پر چسپاں ہو رہی ہے آپ آیت کریمہ کا صدر حصّہ تو پڑھتے ہیں اور آگے نہیں جاتے۔ وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ معطوف کو کھا پی جاتے ہیں۔ مجرم ہم کو کہتے تھے مگر قصور اپنا نکل آیا۔ یہ حضرات من حفر بئرًا لاخیہ فقد وقع فیہ کا کیسا صحیح مصداق ہیں؟ کیا یہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ پر عمل نہیں ہو رہا ہے؟

ہم احناف تو بحمداللہ تعالیٰ سب پر عمل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرأت امام کا کام ہے اور استماع و انصات مقتدی کا کام ہے۔ ہم حضرت ابنِ عباس رضؓ کے فرمان (کہ اس آیت میں امام کی قرأت کا بیان ہے) قرأت سرًّا اور مادون الجھر دونوں امام کرتا ہے، کے بھی قائل ہیں اور بقول عامہ مفسرین (کہ اس آیت میں ذکر و اذکار کا بیان ہے) ذکرِ الٰہی جس طرح بھی ہو سرًّا اور مادون الجھر لوگ کیا ہی کرتے ہیں ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کیا کرتا ہے اس کو بھی مانتے ہیں لیکن آپ غیر مقلدین امام کے ساتھ ساتھ فاتحہ خوانی کرتے ہیں یہ فَاسْتَمِعُوْا وَاَنْصِتُوْا کے بالکل خلاف ہے۔ اور عام مفسرینؒ و محدثینؒ حضرات کے عمل کے بھی مخالف ہے اور تم امام کے پیچھے سرًّا پڑھتے ہوئے معطوف علیہ پر عمل کرنے کے مدعی تو ہو لیکن معطوف وَدُوْنَ الْجَهْرِ کے منکر ہو تم جب اس کو مقتدی کے ساتھ لگاتے ہو اور اس کو اس کی قرأت کا بیان کہتے ہو تو مقتدی کو امام کے ساتھ ساتھ وَدُوْنَ الْجَهْرِ یعنی فجر، مغرب اور عشاء جیسی قرأت کی اجازت بھی دو یا بقول حضرت علامہ بیضاویؒ، امام شافعیؒ کے مذہب کے موافق امام کے سکتۂ آمین میں فاتحہ خوانی کرو اور معطوف وَدُوْنَ الْجَهْرِ کے انداز کی قرأت کیا کرو۔ اس معطوف پر

Scanned by CamScanner

کون عمل کرے گا؟ غلط چال پر ہمیشہ ٹھوکریں ہی لگتی ہیں۔ اگر حنفیہؒ کے ساتھ جُڑنا پسند نہیں کرتے تو حضراتِ شافعیہؒ کے ساتھ ہی جڑ جاؤ۔ انفرادی چال اور وہ بھی بارہ سو سال بعد والی تصورِ علم اور نقصانِ عقل کی دلیل بنتی ہے نام سلفی ہے اور عمل سب کے خلاف خَلَفی ہے اسی لیے ہم نے پوچھا کہ امام کی معیت میں قرأت کے عمل میں آپ کے پیش رَو کون کون سے اسلاف ہیں۔ فاتحہ خوانی تو کئی کرتے ہیں لیکن وہ سکتات میں کرتے ہیں۔ آپ اپنا ساتھی بتائیں۔ جس راستے کو سب نے خطرناک سمجھ کر چھوڑ دیا ہے اس کو آپ نے اپنا لیا اور اپنا معمول بنا لیا ہے۔ صرف قول سے ان سے ملنے کا دعویٰ کیا کہ ہم سب جائز سمجھتے ہیں لیکن عمل میں سب کے مخالف چلتے ہیں۔ اللّٰھم اھدنا فیمن ھدیت۔

آخر آپ حضرات کو سوچنا چاہیئے کہ واختار اھل الحدیث ان لا یقرأ الرجل مع الامام اِذا جھر بالقرأۃ کے قاعدہ سے اختلاف کیوں کیا گیا؟ اگر انھوں نے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی ناراضگی کو دیکھتے اور سُنتے ہوئے اس سے بچاؤ کے لیے ساتھ ساتھ پڑھنے کا عمل ترک کیا تو آپ کیوں دلیری کر کے اسی متروک کو معمول بناتے ہیں؟ آخر یہ حضرات سلف صالحینؒ نہ تو بد دین تھے اور نہ کم علم تھے لہٰذا قوم کو اس متروکِ جمہور عمل کی تعلیم نہ دیں۔ فاتحہ کی پہلی دلیل کا نتیجہ میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم۔ یہ جو میں نے لکھا ہے اپنے خیال کے مطابق لکھا اور بعد میں حضرت شیخ علامہ وحید العصر مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب کاشمیری نور اللہ مرقدہٗ کی کتاب مشکلات القرآن کو دیکھا اس میں یہ سب کچھ پایا جو عرض کیا گیا ہے۔ وللہ الحمد والمنۃ۔ ہاں حضرت کی عبارت نہایت مختصر انداز کی ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ آیت وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ میں مراد واللہ تعالیٰ اعلم ذکر قلبی اور تدبّر فی آیات اللہ کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد اس کا معطوف بھی وَدُوْنَ الْجَھْرِ آرہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قرأۃ کلامِ الٰہی کی دو قسموں کو بیان کرنا مقصود ہے۔ معطوف علیہ فِیْ نَفْسِکَ میں قرأت سرّیہ ہے اور معطوف وَدُوْنَ الْجَھْرِ میں قرأتِ جہریہ ہے۔ جس کو فقہاء کرامؒ جہری قرأت کہا کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اسی کو وَدُوْنَ

الْجَهْرِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ مشکلات القرآن ص۱۸۷ میں ہے: ان الذکر فی النفس لیس ھو التذکر (الیٰ)، بل المراد بہ الاجراء علی اللسان سرًّا ومُخافتۃً کالصلوٰۃ السریۃ وقولہ وَدُوْنَ الْجَھْرِ ھو الجھر فی عرف الفقھاء وذٰلک انہ لو اکتفیٰ بقولہ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ بدون القید اے فِیْ نَفْسِکَ لاحتمل التذکر فلمّا ذکرہ علم اِن المراد بقولہ فِیْ نَفْسِکَ معادلۃ وَدُوْنَ الْجَھْرِ وان فی نَفْسِکَ طرف ودون الجھر طرفہ الاٰخر (الیٰ)، وقولہ وَدُوْنَ الْجَھْرِ اِذًا عطف علیٰ قولہ فی نَفْسِکَ عطف الظرف علی الظرف لا علیٰ قولہ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً ولیس دون بمعنی سِوٰی و اِلَّا لکان الاظھر حذف واو العطف انتھیٰ ۔ اور مشکلات ص۱۸۸ میں ہے: ثم انہ ذکر بصیغۃ المفرد لانہ لم یراع فیہ الجماعۃ بخلاف وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فھو للمقتدین فی الصّلوٰۃ ولیس فی توبیخ الکافرین کآخر سورۃ الانشقاق ونحوہٖ انتھیٰ کلامہ الشریف رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ترجمہ: یعنی فرمانِ الٰہی وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ سے مراد دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو یاد کرنا مُراد نہیں۔ بلکہ اس کے کلام کو زبان سے پڑھنا مُراد ہے۔ پڑھنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ سرًّا یعنی مخفی طور سے جیسے دن کی نمازوں میں قرأت کی جاتی ہے یا جہر سے پڑھنا جیسے رات کی نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کو فقہاءؒ کی اصطلاح میں جہری قرأت بھی کہتے ہیں اور یہی وَدُوْنَ الْجَھْرِ میں مُراد ہے۔ یہ وَدُوْنَ الْجَھْرِ قسم ثانی ہے اور معطوف ہے۔ قسم اوّل پر (یعنی فِیْ نَفْسِکَ پر) جیسے ظرف کو ظرف پر معطوف کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اگر اس سے صرف قلبی ذکر ہی مراد ہوتی تو وَاذْکُرْ رَّبَّکَ کافی ہو جاتا۔ جب اس کے بعد فِیْ نَفْسِکَ اور اس کا معطوف وَدُوْنَ الْجَھْرِ کو بھی لایا گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ دو قسمیں بیان کرنا مقصود ہیں۔ صرف ذکر قلبی ہی مراد نہیں، اور وَدُوْنَ الْجَھْرِ میں دُوْنَ سِوٰی کے معنی میں نہیں ہے کہ ذکر خفیہ لیا جائے

اونچا نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس صورت میں داؤ عاطفہ کا معنی ہی نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ واو موجود ہے۔ (یہی طریق فاضل اوکاڑوی نے اختیار کیا جس کو ہم نے تحریف کہا) بلکہ دُوْنَ کا معنی وَرے اور نیچے کے ہے۔ اور مراد ان دونوں قسموں سے قرأت کرنا ہے یعنی خفیہ قرأت بھی کر سکتے ہو جیسے رات کی نمازوں میں اور جہری قرأت بھی کر سکتے ہو جیسے دن کی نمازوں میں۔ اوّل کو فِیْ نَفْسِكَ سے تعبیر کیا گیا اور دوسری قسم کو وَدُوْنَ الْجَهْرِ کا معنی اونچے چلانے کے اندازے سے کم درجے کا پڑھنا کر سکتے ہیں۔ زیادہ اونچا منع کیا گیا ہے، اور انکم لاتدعون اصم ولا غائبًا سے اس کی تردید کی گئی ہے پھر یہ بھی فرمایا کہ پہلی آیت میں صیغے جمع کے لائے گئے کہ وہاں خطاب نماز کے مقتدیوں کو ہے اور دوسری آیت میں مفرد کا صیغہ لایا گیا کہ اس سے مُراد خارج از نماز قاری کا پڑھنا یا امام کا پڑھنا ہے جو دو طرح سے بیان کیا گیا ہے اور یہ دونوں دُرست ہیں۔

الدّلیل الثّانی للانصات عند قرأته

اگرچہ انصات کا تذکرہ پہلی دلیل میں گزر چکا ہے لیکن وہاں ضمنی طور پر کچھ مزید معروضات پیش کی گئی تھیں اصل مقصود اس جگہ استماع للقرآن کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ استماع کان کا کام ہے اور انصات زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ سمع اور استماع میں بھی فرق ہے۔ سمع سننے کو کہتے ہیں اور استماع کامل توجّہ سے سننے اور گوش داشتن کو کہتے ہیں۔ یہ پہلے امام رازیؒ کے کلام میں گزر چکا ہے۔ مدار فرق یہ ہے کہ زیادتی حروف کی معنیٰ کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے جیسے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ میں ہے۔ کہ معمولی سا خیال نیکی کا کیا جائے جس کو ہم کما جائے تو اس پر ثواب مل جاتا ہے اور گناہ اس درجہ میں مأخوذ نہیں ہوتا جب تک عزمِ مصمم نہ پایا جائے۔ مختصر اشارہ کر دیا ہے تفصیل کا موقع نہیں۔ استماع میں حروف زائد ہیں اس لیے اس میں کامل توجہ سے سُننے کا معنی کیا جاتا ہے کہ جس میں دوسری کسی چیز کی طرف دھیان نہ کیا جائے۔ اسی لیے کہا گیا کہ استماع کرنا قرأت کے منافی ہے اور انصات زبان کا سکوت اور سکون ہے اسی لیے قرآنِ کریم میں جب لَا تُحَرِّكْ بِهٖ

Scanned by CamScanner

لِسَانَكَ فرمایا گیا اور نیز فَاِذَا قَرَأْنٰهُ... الخ فرمایا گیا تو حضرت ابن عباسؓ نے اس موقع پر استمع وَانصت فرمایا تاکہ کان اور زبان دونوں پابند ہو جائیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرامؓ کو نصیحت فرمائی۔ مشکوٰۃ ص۳۶ وقال رواہ البخاری: لا الفینّک تاتی القوم وھم فی حدیث من حدیثھم فتقص علیھم فتقطع علیھم حدیثھم فتملھم لکن انصت فاذا امروک فحدثھم وھم یشتھونہ۔ الحدیث یعنی میں تمھیں ایسا نہ پاؤں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنی کسی بات میں لگے ہوئے ہوں اور تم جاتے ہی ان کو اپنی حدیثیں سنانے لگو کیونکہ اس سے وہ نالاں ہوں گے کہ تم نے ان کی باتیں پوری نہ ہونے دیں اور کاٹ دیں۔ ہاں جاؤ تو خاموش بیٹھ جاؤ۔ جب وہ تمھیں فرمائش کریں تب ان کو مسائل سناؤ۔"

دیکھیے کہ انصت کا لفظ اس حدیث میں محض خاموشی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ فریقِ ثانی اَنْصِتُوْا کا معنی جو اونچی آواز سے نہ پڑھو، کرتے ہیں۔ یہ صرف غرض پوری کرنے کی بات ہے اور عربی محاورات کے خلاف ہے۔ گزشتہ بھی انصات کے چند مواقع استعمال بیان کیے گئے ہیں کہ یہ لفظ خالص خاموشی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ وَاِذَا قَرَأَ فَانْصِتُوا حدیث نبوی مسلم شریف میں آچکی ہے۔ یہ مقتدی کو قرأت کرنے سے منع کرتی ہے۔ خواہ سرّا ہی قرأت کرے اور یہ حدیث شریف اسی آیت کریمہ سے لی گئی ہے۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ جس کا بیان گزر چکا ہے۔

حضرت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالےٰ کے تساہل کا شکوہ

اس مقام میں حافظ ابنِ حجرؒ نے لفظ انصات اور اسکات میں فرق نہ کیا دونوں کو ایک ہی بنا دیا اور ایک حدیث بخاری ص۱۰۳ کی نقل کی جس میں ہے کہ کسی نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ تکبیر افتتاح اور قرأت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں جو سکوت فرمایا کرتے ہیں اس میں آپ کیا پڑھا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا میں اس میں

دُعاوثنا پڑھا کرتا ہوں۔ الفاظ یہ ہیں : یارسول اسکاتك بین التکبیر والقرأۃ ماتقول فیہ قال اللّٰھُمَّ باعد بینی وبین خطایای .... الخ فرماتے ہیں کہ سکوت اور پڑھنا اس میں دونوں جمع ہو رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی انصات کرتے ہُوئے خفیہ قرأت بھی کر سکتا ہے۔ یہی بات مصنف خیر الکلام کو مل گئی اور خوشی کی کہ مقتدی کو امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی گنجائش نکل آئی۔ لیکن یہ خیال نہ کیا کہ قرآنِ کریم و حدیث میں اَنْصِتُوْا کا لفظ ہے۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ واسکتوا نہیں فرمایا اور حدیث میں بھی اذا قرأ فاسکتوا نہیں فرمایا۔ بات جب صحیح ہوگی کہ حُکمِ انصات کے موقع میں کلام کرنا اور قرأت کرنا ثابت کیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچیں کہ اگر انصات سکوت کے معنوں میں ہے اور اس میں خفیہ پڑھنے کی گنجائش ہے، اور ممانعت نہیں اور اس لیے امام کی قرأت کے وقت خفیہ طور سے مقتدی کا پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسے کہ اہلِ حدیث حضرات پڑھا کرتے ہیں تو حضرت امام شافعیؒ نے یہ راستہ کیوں چھوڑا ہے؟ وہ تو فاتحہ کے بعد وَلَا الضَّآلِّیْنَ والے سکتے میں فاتحہ خوانی کا حکم دیتے ہیں اور حافظ ابنِ حجرؒ نے خود ان کی تقلید کرتے ہُوئے فرمایا ہے کہ امام پر لازم ہے کہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے بعد اتنا سکتہ کرے کہ ان کے مقتدی اس میں فاتحہ پڑھ لیں ورنہ وہ قرأت کے وقت فاتحہ پڑھیں گے تو اس میں وہ مجرم اور گنہگار ہوں گے۔ کہ یہ منھی عنہ کا ارتکاب بن جاتا ہے۔ فتح الباری ص ۱۶۴ ج ۲ میں ہے: فعلیٰ ھٰذا یتعین علی الامام ان یسکت فی الجھریۃ لیقرأ الماموم لئلا یُوقعہ فی ارتکاب المنھی حیث لاینصت اِذا قرأ الامام۔ اس جگہ تو امام کی قرأت کے زمانے میں مقتدی کا پڑھنا ارتکاب منہی اور جرم فرما رہے ہیں اور صحیح بھی یہی ہے اور اسی لیے حضرت امام شافعیؒ نے مقتدی کو امام کے سکتے میں پڑھنے کا حکم دیا ہے کما مَرَّ مگر اس جگہ فرما رہے ہیں کہ اسکات پڑھنے سے مانع نہیں بنتا۔ دیکھیے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اسکات بین التکبیر وبین القرأۃ کے زمانے میں دعا پڑھا کرتے تھے: اللّٰھم باعد بینی وبین خطایای .... الخ اسی طرح انصات

کے زمانہ میں بھی مقتدی آہستہ قرأت کرسکتا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر انصات کے زمانے میں پڑھنا درست ہے تو پھر تو یہ صاف طور پر ارتکاب منہی عنہ ہے۔ حالانکہ وہ خود فرمارہے ہیں: لئلا یوقعہ فی ارتکاب المنھی .... الخ تو ان کے کلام میں تضاد ہے۔

حافظ ابنِ حجرؒ کے کلام میں ایک اور تسابل بھی ہے کہ ممنوع تو قرآن کریم کی قرأت کے وقت مقتدی کا قرأت کرنا ہے اور یہی وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا سے معلوم ہوتا ہے اور وجہ بھی گزر چکی ہے کہ اس سے قرآن کریم سے بے التفاتی بنتی ہے اور یہ احترامِ قرآن کے خلاف ہے جیسے کہ مفسّر ابنِ کثیرؒ نے فرمایا اور حافظ ابنِ حجرؒ نے جو دُعائیہ کلمات بین التکبیر وبین القرأۃ پڑھنے کا ذکر کیا ہے کہ سکوت کے زمانہ میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پڑھے تو وہ زمانۂ قرأت قرآن میں نہیں پڑھے گئے۔ بلکہ وہ فاتحہ کی قرأت سے پہلے پڑھے گئے ہیں اور یہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کے نیچے نہیں آتے اور یہ پڑھنا ممنوع نہیں بنتا۔ اور اگر صرف سکتے میں پڑھنا کہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سکتے میں پڑھا جاسکتا ہے تو ہم مطلق سکتے میں پڑھنے کا انکار نہیں کرتے نماز میں تلاوتِ قرآن کریم کے وقت سکتہ میں پڑھنے کو ممنوع کہتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے سکتہ کی شرعاً کوئی ثبوت نہیں ہے۔ فرق کو سمجھیں اور اندھے کی طرح لاٹھی نہ چلائیں۔

علامہ بیہقیؒ کے رویّہ کی شکایت ان کا مذہبی تعصّب اور بیجا حمایت

حضرات حنفیہ کرام کثرھم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن اور حدیث میں مقتدی کو امام کی قرأت کے وقت انصات کا حکم کیا گیا ہے۔ انصتوا اور انصات خالص خاموشی کو کہتے ہیں۔ نہ زبان ہلے نہ آواز پیدا ہو۔ اس لیے مقتدی کو اس وقت قرأت نہیں کرنی چاہیئے۔ امام کی قرأت اس کے لیے کافی ہے۔ اس کا خود پڑھنا قرآن کریم کے سُننے میں نقصان دہ اور خلل انداز بنتا ہے اور بے توجہی بنتی ہے اور یہ ادبِ قرآن کے خلاف ہے اس لیے حضرت شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس وقت خاموشی کا حکم دیا ہے اور

فرمایا ہے: اذا قرأ فانصتوا۔ اس کا بیان کئی دفعہ گزر چکا ہے لیکن بعض لوگوں کو اختلاف میں مزہ آتا ہے معمولی سہارا لے کر مخالف آواز بلند کر دیتے ہیں۔ دامنِ انصاف کو چھوڑ جاتے ہیں۔

علامہ بیہقیؒ کا رویّہ اس مقام میں اسی انداز کا ہے۔ فرمایا کہ انصات کا معنی یہ ہے کہ اونچا نہ پڑھا جائے۔ لوگ امام کے پیچھے اونچا پڑھتے تھے۔ اس سے ممانعت کی گئی ہے خفیہ قرأت کی جا سکتی ہے۔ اس پر عبداللہ بن عامر کی روایت بھی نقل کر دی۔ کانوا یرفعون اصواتھم خلف رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فنزلت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔

حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحب نے بھی یہ روایت حاشیہ شرح وقایہ ص۱۷۳ میں نقل کی ہے اور متعدد کتابوں کا حوالہ بھی دیا ہے کہ دارقطنیؒ، بیہقیؒ، ابن جریرؒ سب نے یہ روایت نقل کی ہے۔ لیکن علامہ جمال الدین زیلعیؒ نے فرمایا کہ اس روایت کا راوی عبداللہ بن عامر ضعیف ہے۔ نصب الرأیہ ص۱۷ ج۲۔ ایسی روایت متعدد کتابوں میں آجانے سے صحیح نہیں بن جاتی۔ صحت بیماری کے علاج کو چاہتی ہے کسی بیمار کے نام کا بڑے ڈاکٹروں کے رجسٹروں میں آجانا اس کی صحت کا مثبت نہیں۔ استدلال رجال کے احوال کو دیکھ کر جرح سے سلامتی کے بعد ہوا کرتا ہے۔ فریقِ ثانی صحت کا ثبوت پیش کرے۔ مولانا عبدالحیؒ نے بھی رجال پر نظر نہیں ڈالی اور اس کو ذکر کر دیا ہے۔

صاحبِ خیر الکلام کو بھی موقع مل گیا ہے۔ ان کتابوں کا یہ حوالہ دے کر لوگوں کو منواتے ہیں اور کہتے ہیں اونچا پڑھنا منع ہے۔ قرأتِ مشوشہ منع ہے۔ کیا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت جبریلؑ کی قرأت کے وقت اونچا پڑھا کرتے تھے کہ منع کیے گئے اور لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ فرمایا گیا؟ کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیچھے لوگوں نے اونچا پڑھا تھا جب کہ آپ نے انکاری لہجہ میں فرمایا: ھل قرأ معی احد منکم انی اراکم تقرءون۔ لعلکم تقرءون خلف امامکم وغیرہ یرفعون اصواتھم خلف رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کیا معنی؟

Scanned by CamScanner

ظہر کی نماز میں کسی نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی پڑھا تھا۔ کیا اس نے جہر کیا تھا؟ ظہر کی نماز میں کون جہر کرتا ہے؟ ہاں معمولی انداز کی آواز میں پڑھا ہوگا۔ جس کو ھمس کہا جاتا ہے ایسی آواز سے کبھی قریب والا شخص سُن لیتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا۔ کہ سب آوازیں اللہ تعالےٰ کے سامنے حاضری کے وقت پست ہو جائیں گی۔ پس تو نہیں سُنے گا مگر ھمس۔ معلوم ہوا کہ ھمس سُنائی دیتی ہے۔ آج کل جہالت کے زمانے میں بھی ظہر کی نماز میں کسی کو نہیں دیکھا سُنا ہوگا کہ امام کے پیچھے جہر کیا ہو تو پھر حضرات صحابہ کرامؓ جیسے اذکیاء اُمّت سے یہ توقع کیسے ہو سکتی ہے؟ صاحب خیر الکلام کے رویّہ پر افسوس ہے وہ لکھتے ہیں ص ۳۱۵ دکہ یہ انکار ان کی بے جا حرکت پر تھا امام کے ساتھ ساتھ جہر سے پڑھتے تھے) صرف مطلب سازی کے لیے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی توہین کر رہے ہیں۔ دیکھئے اگر وہ جہر کرتے تھے تو آپؐ نے ھل قرأ معی احد منکم بصیغہ استفہام کیسے فرمایا؟ لعلکم تقرؤن تردّد کے صیغے سے کیسے انکار کیا؟ اراکم تقرءون خلف امامکم گمان کے احتمالی عنوان میں یہ کیسے فرمایا؟ شاید مصنف خیر الکلام نے یہ الفاظ عبداللہ بن عامر کی روایت کو دیکھ کر (کانوا یَرفعون اصواتھم خلف رسول اللہ) کہہ دیئے ہیں اور بناء الفاسد علی الفاسد کے انداز میں یہ دونوں غلط ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو کچھ مزید تفصیل سے بیان کر دوں تاکہ حق اور باطل واضح ہو کر سچ اور جھوٹ کی کامل تمیز ہو جائے اور اشتباہ رفع ہو جائے۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ابو داؤد شریف ص ۱۲۰ ج ۱ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے ایک صحابیؓ آئے اور انھوں نے امام کے پیچھے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی پڑھا۔ ظہر کی نماز میں قرأت خفیہ کی جاتی ہے۔ لیکن اس نے ایسے انداز سے پڑھا کہ پاس والوں نے سن لیا۔ الفاظ یہ ہیں: جَآءَ رجل فقرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو بھی اس کے پڑھنے

کا احساس ہُوا لیکن بہت خفیف انداز کا۔ فرمایا: ایّکم قرأ؟ تم میں سے کس شخص نے قرأت کی ہے؟ فرمایا۔ جواباً عرض کیا گیا: قالوا رجل۔ (یعنی ایک شخص نے قرأت کی ہے) ہاں تیسری روایت میں سورۃ کا نام نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کلام میں ہے۔ (کہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى کس نے پڑھا ہے؟) ایّکم قرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى؟ اس روایت کو دیکھتے ہوئے حضرت امام بیہقیؒ نے مطلب سازی کے طور پر فرمایا کہ اس شخص نے جہر سے پڑھا تھا۔ ورنہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سورۃ کا نام کیسے لیتے؟ حالانکہ اوّل کی دو روایتیں نصاب شہادت بتا رہی ہیں کہ سورۃ کا نام حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے کلام میں نہیں ہے۔ نفس قرأت آپؐ کے سننے میں آئی ہے اور انکاری لہجے اور انداز میں آپ نے فرمایا: ایّکم قرأ؟ قالوا رجل۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ابوداؤد شریف میں حضرت شعبہؒ سے (جن کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہتے ہیں) دو راوی ابوالولیدؒ اور محمد بن کثیرؒ اس طرح روایت نقل کرتے ہیں۔ جاء رجل فقرأ۔ ان کی روایت میں سورۃ کا نام حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے کلام میں نہیں ہے۔ صرف ایّکم قرأ؟ آپؐ نے فرمایا ہے یعنی کس نے پڑھا ہے؟ اور بذل المجہود شرح ابی داؤد ص ۵۸ ج ۲ میں تیسرا راوی بھی ذکر کیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: روی شبابۃ وابوالولید ومحمد بن کثیر عن قتادۃ (الیٰ) ایکم قرأ۔ ان تینوں کی روایت میں بلا تسمیہ سورۃ ہی مروی ہے۔ بلکہ فرمایا: حجاج بن ارطاۃ بھی عن قتادۃ اسی طرح ایّکم قرأ ہی نقل کرتا ہے۔ اس طرح چار طریق سے یہ روایت بلا تسمیہ سورۃ ہی مروی ہے۔ صرف ابن ابی عدی عن سعید بن ابی عروبۃ کی روایت میں ہے: فلما انفتل قال ایّکم قرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى۔ لیکن انما العزۃ للتکاثر۔ آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ خصوصاً جبکہ اکثریت عادل، ضابط، حفاظ حدیث کی ہو اور پھر واقعہ بھی ظہر کی نماز کا ہو۔ جس میں

جہر سے قرأت کوئی نہیں کرتا۔ حضرت امام بیہقیؒ کے استدلال کی بنیاد اسی روایت پر ہے فرمایا: لولا انہ جھر لم یقل .... الخ یعنی اس شخص نے قرأت جہر سے کی تھی اسی لیے آپ نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى فرما کر نام سورۃ کا لیا ہے اس کے جہر کرنے پر انکار کیا گیا ہے لیکن یہ بات طفل تسلّی سے زائد وقعت نہیں رکھتی۔ آپ نے دیکھا راوی متقن بلا تسمیہ سورۃ نقل کرتے ہیں۔ امام بیہقیؒ نے ان کی طرف دھیان ہی نہیں کیا۔ مطلب کی بات لے لی ہے۔ اگر یہ مخالف مذہب ہوتی تو فرما دیتے کہ یہ نام لینا ایک راوی کا تفرد ہے، شاذ ہے اس کو نہیں لیا جا سکتا۔ لیکن چونکہ موافق مذہب روایت ہے اس لیے خاموشی سے گزر گئے ہیں سبحان اللہ کیا ہی انصاف ہے۔ یہ چار اور ایک کا تقابل ہے۔ حالانکہ واقعہ بنظر انصاف دیکھتے تو اس طرح جزمی فرمان لولا انہ جھر لم یقل .... الخ نہ فرماتے۔ اوّل تو آپ نے ابھی دیکھ لیا کہ ھمس کی قرأت جس کو جہر نہیں کہتے۔ اس میں بھی قریب والا آدمی سن لیتا ہے اس کے علاوہ یہ ہے کہ حضرت سعیدؒ بن ابی عروبہؒ راوئ تسمیۂ سورۃ اگرچہ ثقہ اور ثبت ہے مگر آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔ امام ازدیؒ فرماتے ہیں: اختلط اختلاطاً قبیحاً۔ بُری طرح کے اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔ تہذیب ص ۶۴ ج ۴۔

امام عقیلیؒ فرماتے ہیں: سمع منہ محمد بن ابی عدی بعد ما اختلط (ایضاً ص ۶۵)۔ اور یہ روایت بھی ابن ابی عدی عن سعید ... الخ کے طریق سے ہے اور امام نسائیؒ فرماتے ہیں:۔ من سمع منہ بعد الاختلاط فلیس بشئ۔ جس نے اس سے بعد اختلاط کے سُنا تو اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ اور ایسا ہی امام ابن معینؒ نے فرمایا اور امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں۔ ومن سمع منہ بعد الاختلاط لا یعتمد علیہ (تہذیب ص ۶۵ ج ۴) مسلم ص ۱۷۲ ج ۱ میں ابو عوانہؒ، سعیدؒ سے روایت کرتے ہیں مگر اس میں قتادہ عن سے روایت کرتے ہیں اور امام نوویؒ نے اسی مقام پر ص ۱۷۲ میں تصریح کی ہے کہ قتادہؒ مدلس ہیں اور اس کے بعد امام مسلمؒ نے قتادہؒ کی سمعتُ سے تحدیث کی جو روایت بیان کی ہے اس کا متن جُدا ہے۔ پہلی روایت میں سورت کا نام آنحضرت

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد میں ہے۔ اور دوسری کے الفاظ یہ ہیں: فجعل رجل یقرأ خلفہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى۔ الحدیث۔ جب متن جُدا جُدا ہیں تو دوسری روایت میں تحدیث بھی پہلی کے لیے مُفید نہ ہوگی۔ کما لا یخفیٰ۔

ایسے مشکوک طریقہ پر اعتماد کرنا اور بالمقابل چار عادل، ضابط، حفاظ حدیث کی روایت کو چھوڑ دینا کیا یہ علمی ذمہ داری کے خلاف نہیں ہے؟ مصنف خیر الکلام فاضل اہل حدیث کو یہ کھوٹا سامان مل گیا اور موافقِ مطلب جان کر جھٹ تھیلے میں ڈال لیا اور اس کو اس طرح ذکر کر دیا کہ گویا اس باب میں صرف یہی ایک روایت ہے مگر اس میں قوم کو دھوکہ دیا گیا ہے کہ پرواہ نہ کرو فاتحہ امام کے پیچھے پڑھتے جاؤ۔ حدیث میں جہر کرنے پر انکار ہے نفس پڑھنے پر نہیں۔ حالانکہ چار روایتوں میں صرف پڑھنے پر حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا انکار مروی ہے: ایّکم قرأ، ایکم القارئ۔ اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ خیر الکلام کے اکثر سودے کھوٹے ہیں۔ ہاں بورڈ خیر الکلام کا لگا ہوا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اگر پڑھنے والے نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى جہر سے پڑھا تھا۔ جیسے کہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں تو یہ یقیناً مکروہ فعل ہے۔ ظہر کی نماز کا واقعہ ہے۔ اس میں جہر سے پڑھنا امام کے پیچھے یقیناً مکروہ ہے حالانکہ راوئ حدیث حضرت قتادہؓ اس کو مکروہ نہیں کہتے۔ ابو داؤد میں ہے۔ انھوں نے فرمایا: لو کرھہ لنھیٰ عنہ۔ یعنی اگر یہ فعل مکروہ ہوتا تو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام اس کی نہی فرماتے اور اس سے منع فرماتے۔ معلوم ہُوا کہ ان کے نزدیک جہر سے پڑھنا نہیں ہُوا۔ سرّاً اور خفیہ پڑھا گیا اور ھمس کی وجہ سے آواز سُنائی گئی۔ جیسے کہ ہم نے عرض کیا تھا۔ اگر اس کو جہر پر محمول کیا جائے تو لو کرھہ لنھیٰ عنہ کے کیا معنی ہوں گے۔ کیا ظہر کی نماز میں وہ جہر بھی مکروہ نہیں کہتے۔ امام بیہقیؒ کا یہ بیان راوئ حدیث کے فہم کے بھی خلاف ہے۔ اس بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت قتادہؓ راوی حدیث سری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحہ خوانی کو جائز سمجھتے ہیں۔ مکروہ نہیں سمجھتے۔ اس جگہ چند باتیں قابلِ غور ہیں:۔

Scanned by CamScanner

۱ : اس پڑھنے والے نے آتے ہی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی کی سورۃ امام کے پیچھے پڑھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ قرینہ یہ ہے: کہ حدیث میں جاء فقرأ آیا ہے۔ حرف تعقیب مع الوصل کے لیے آیا کرتا ہے۔ معلوم ہُوا کہ آنے کے ساتھ ہی اس نے پڑھا۔ اگر فاتحہ پڑھ کر اس نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی پڑھی ہے تو روایت میں فأ کی بجائے ثمّ کا لفظ ہوتا۔ الفاظ اس طرح ہوتے۔ جاء ثم قرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی۔ کیونکہ فصل کے موقع میں ثمّ کا لفظ آتا ہے اور فریقِ ثانی بلا فاتحہ نماز کو باطل کہتا ہے۔ لہٰذا اس شخص کے فاتحہ پڑھنے کا ثبوت پیش کیجیے۔

۲ : دوسری بات اس حدیث سے یہ معلوم ہُوئی کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والا صرف ایک ہی شخص تھا۔ فریقِ ثانی کے نزدیک فاتحہ کی قرأت سب مقتدیوں پر لازم رہتی ہے۔ حالانکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایّکم قرأ فرمایا۔ جواباً بھی رجل ہی کہا گیا۔ یعنی ایک ہی شخص نے پڑھا ہے۔

۳ : یہ قرأت ھمس کے درجہ کی تھی جیسے بعض لوگ تصحیح حروف کرتے ہُوئے معمولی صَوت سے پڑھا کرتے ہیں جو کانوں تک آواز پہنچ جاتی ہے۔ ایسی آواز کو پاس والا شخص بھی سُن لیتا ہے۔ جیسے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی بیماری کے زمانے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ نبی علیہ السّلام جا پہنچے۔ روایت میں ہے: فقرأ من حیث انتھٰی الیہ ابوبکرؓ۔ یعنی نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے وہاں سے قرأت شروع کی۔ جہاں تک حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرأت پہنچا چکے تھے۔ ایسے ھمس کی آواز کو جہر نہیں کہا جاتا۔ حضرت حافظ ابنِ حجرؒ اس کو ظہر کا واقعہ فرما رہے ہیں۔ (جبکہ امام طحاویؒ وغیرہ حضرات اس کو جہری نماز کا واقعہ بتاتے ہیں۔) اور ظہر کی نماز میں قرأت خفیہ ہی کی جاتی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کیسے پتہ چلا؟ اس کا حل حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا کہ شاید حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرأت ھمس سے کی ہو گی جس سے قریب شخص سُن لیتا ہے۔ اس لیے آپؐ نے وہاں سے سن کر قرأت

شروع کی جہاں تک قرأت ہوچکی تھی۔ اسی طرح موجودہ واقعہ میں آنے والے صحابیؓ نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی ذرا دھیمی آواز میں پڑھی تھی۔ پاس والوں نے سُن لی اسی لیے انھوں نے فرمایا جاء رجل فقرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے شاید آواز پڑھنے کی سُنی۔ لیکن ذرا بُعد کی وجہ سے آپؐ کو قرأت کے الفاظ کی تمیز نہیں ہُوئی۔ اس لیے پہلے مجمل انداز میں ایکم قرأ؟ فرمایا۔ سورۃ کا نام نہیں لیا۔ اوّل دو روایتوں میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اس کی ایک اور نظیر دیکھیے: حضرت ابنِ جریرؒ نے روایت نقل فرمائی کہ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھا رہے تھے: صلّی ابن مسعود فسمع اناسًا یقرؤن مع الامام فلما انصرف قال اَما آن لکم ان تفھموا اَما آن لکم ان تعقلوا وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کما امرہ اللہ تعالیٰ۔ اس کی سند کی تحقیق احسن الکلام ۹۴، ۹۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔ یعنی حضرت ابن مسعودؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ سنا کہ پیچھے کچھ لوگ امام کے ساتھ قرأت کر رہے ہیں ان کو فرمایا تمھیں سمجھ نصیب نہیں ہوئی۔ تمھاری عقل نے کام نہ کیا کہ فرمان خداوندی وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ کو سوچیں اور سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ اس میں ہے فسمع اناسًا یقرؤن۔ کہ امام کے پیچھے چند لوگوں کو قرأت کرتے سُنا۔ اس پر انکار کیا کہ قرآنِ کریم کی آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ۔ خلف الامام قرأت سے منع کر رہی ہے۔ تم کیوں قرأت کرتے ہو۔ ان لوگوں کی قرأت جہر سے نہ تھی۔ امام کے پیچھے تو نادان بھی جہر سے قرأت نہیں کرتے۔ ہاں یہ ھمس کے درجے کی قرأت ہوگی۔ اس کو حضرت ابن مسعودؓ نے سُنا اور اس پر انکار کیا۔ اسی طرح حضرت زیدؓ بن ثابت سے بھی ممانعت مروی ہے: لاقرأۃ مع الامام فی شئ۔ (رواہ مسلم ص ۲۱۵ ج ۱) یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو مقتدیوں کو قرأت نہیں کرنی چاہیئے۔ ای لا قرأۃ حین تصلی مع الامام فی شئ من الصلوٰات یا لا قرأۃ وانت تصلی مع الامام کیسے واضح اور صحیح معنی ہیں لیکن افسوس کہ مصنف خیر الکلام نے اس میں بھی تحریف کر دی ہے۔ کہتے ہیں

کہ مراد یہ ہے: امام کے ساتھ ساتھ مت پڑھو۔ اس میں سکتے میں پڑھنے کی ممانعت نہیں نکلتی۔ یہ توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کے باب سے ہے۔ بلکہ اس میں غیر مقلدین کے رائج عمل کی تردید بھی ہے۔ کیونکہ وہ ساتھ ہی پڑھا کرتے ہیں۔

الحاصل: اس شخص نے نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی معمولی انداز کی آواز سے پڑھا تھا۔ جس کو ھمس کہا جاتا ہے اس پر ایکم قرأ سے انکار کیا گیا اس کو جہر نہیں کہتے۔ ظہر کی نماز میں جہر کون کرتا ہے؟ اس واقعہ میں مقتدی کا ھمس کی آواز سے پڑھنا اور امام کا سُن لینا ہوا۔ اس کی ایک اور نظیر عرض کرتا ہوں جس میں امام کا ھمس کی آواز سے پڑھنا اور مقتدی کا سُن لینا ہُوا۔ ھمس محل انکار نہیں ہوتا۔

ترمذی شریف ص۱۶۷ میں ہے: عن عوف رضؓ بن مالك قال سمعت رسول الله صلّی الله تعالیٰ علیه وسلم یصلی علیٰ میت ففهمت من صلوٰته علیه اللّٰهم اغفرلهٗ وارحمهٗ واغسلهٗ بالبرد کما یغسل الثوب۔ اور مسلم ص۳۱۱ میں ہے اللّٰهم اغفرلهٗ وارحمه واعف عنه وعافه۔ سب جانتے ہیں کہ جنازہ، ثناء، درود اور دُعا پڑھنے کا نام ہے اور یہ سب خفیہ پڑھے جاتے ہیں۔ کیا یہ دعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہراً پڑھی تھی کہ حضرت عوف رضؓ بن مالک نے سُنی تھی؟ امام نوویؒ شرح مسلم ص۳۱۱ میں فرماتے ہیں: اما الدعاء فیسرّ به بلا خلاف۔ یعنی دعا بلا خلاف خفیہ ہی پڑھی جاتی ہے۔ اسی طرح علامہ سندھی ابوالحسنؒ نے فرمایا: المعروف عند العلما فی الدّعاء هو الاسرار۔ جب یہ دُعا سرّاً پڑھی گئی تو مقتدی نے کیسے سُن لی؟ اس کی توجیہہ میں علامہ نوویؒ نے فرمایا: فلعلّ هٰذا اللفظ سمعه منه لقربه من النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم ربما یُسرّ فیسمع القریب بعض ذٰلك۔ یعنی کبھی پڑھنے والا مخفی انداز سے پڑھتا ہے لیکن قریب والا شخص سُن لیتا ہے۔ جیسے یہاں امام کی مخفی پڑھی ہُوئی دُعا مقتدی نے سُن لی۔ اسی طرح بالعکس مقتدی کی مخفی پڑھی ہُوئی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سُن لی ہوگی۔ اس پر ایکم قرأ سے انکار فرما دیا۔ اس سے

اس صحابیؓ کا جہر سے پڑھنا جیسے کہ حضرت امام بیہقیؒ اور ان کے تابع مصنف خیر الکلام یہ سبق پڑھ رہے ہیں۔ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ امام بیہقیؒ نے فرمایا: لولا انہ جھر لانکر علیہ۔ یہ مذہبی رعایت سے صرف من مانی کا روائی ہے۔ صحابیؓ کا عمل حتی المقدور صحیح محمل پر اتارنا چاہیئے۔ کیا جنازہ میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ دعا جہر سے پڑھی تھی کہ حضرت عوفؓ بن مالک نے سن لی؟ آپ نے علامہ نوویؒ کی توجیہہ دیکھ لی ہے وہی اس جگہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى میں جاری کرلیں۔ خذ ما صفا ودع ما کدر۔

مجھے امام مسلمؒ کے رویّہ سے ایک اور بات معلوم ہوئی جو ذکر کرتا ہوں شاید کام دے صحیح مسلم ص۱۷۲ میں امام مسلمؒ نے پہلے تو قتادۃ عن زرارۃ بن اوفی کے طریق سے ایکم قرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى والی روایت نقل کی ہے جس میں تسمیۂ سورت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں ہے۔ اس کے بعد دو روایتیں قتادۃ قال سمعت زرارۃ بن اوفیٰ کے طریقے سے ذکر کیں جن میں جاء رجل فقرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ مروی ہے اور آخر میں ایکم قرأ یا ایکم القاری ہے۔ قتادہؒ مدلّس ہیں۔ نوویؒ نے اس جگہ لکھا ہے: لہٰذا اس کی سماع والی پچھلی دو روایتیں ہی معتبر ہوں گی اور پہلی قابلِ اعتماد نہ ہوگی۔ کیونکہ ممکن ہے کہ درمیان میں متروک اور ضعیف راوی کی یہ کارروائی ہو۔ اور امام مسلمؒ کی عادت ہے کہ وہ روایات میں جو راجح جملہ اور حصّہ ہوتا ہے اس کو آخر میں ذکر کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ امام مسلمؒ اپنے صنیع سے تسمیۂ سورت والی روایت کو مرجوح بتا رہے ہیں۔

علامہ بیہقیؒ پر تعجب ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ قتادۃ مدلّس ہے اور عن سے روایت کرتا ہے اس کو استدلال میں لے کر اپنا مطلب نکال گئے ہیں اور بعد کی دو روایتیں جن میں سماع کی تصریح ہے اور ان میں سورت کا تسمیہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان میں نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکار نفسِ قرأت پر تھا، نظر انداز کر گئے ہیں۔

تنبیہہ: ممکن ہے کہ بعض لوگ دانستہ ضد اور جہالت سے یا نادانستہ یہ کہہ دیں کہ یہ انکار ایکم قرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى کا صرف اس کے مازاد علی الفاتحہ کے پڑھنے پر ہے۔ فاتحہ پر نہیں۔ جواب اوّل تو دے دیا گیا ہے کہ اس صحابی کے سورۂ فاتحہ

کے پڑھنے کا ثبوت پیش کریں کہ اس نے فاتحہ پڑھ کر پھر سورۃ پڑھی تھی۔ جاء فقرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى کا ظاہر تو یہی ہے کہ اس نے فاتحہ نہیں پڑھی تھی تو اس کی نماز کیسے ہوگئی ؟ اس کے علاوہ اس کو مازاد پر محمول کرنا اور اس میں منحصر کرنا قطعاً باطل ہے۔ نصِ قرآنی وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا۔ اور حدیثِ نبوی إِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا کا فرمان جملہ قرآن کو شامل ہے۔ فاتحہ ہو یا مازاد یعنی جب قرآن شریف پڑھا جائے اور امام اس کو پڑھتا ہو تو تم نہایت ہی خاموشی سے اسے سنو اور ظاہر بات ہے کہ قرآن شریف کی قرأت سورت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ صحیح حدیث کے مطابق قرآنِ عظیم کا اوّلین مصداق ہی سورۂ فاتحہ ہے۔ بخاری ص ۶۴۲ ج ۲ وغیرہ۔ تو اس کو خارج کرنا از حکم انصات بلا کسی قطعی دلیل اور صریح حجت کے کہاں کا انصاف ہے ؟ خاص کر جب کہ اس خاموشی کے حکم کی علّت ادب و احترام اور تکریم قرآنِ کریم ہے۔ کیا سورۃ فاتحہ قابلِ احترام نہیں ؟ یہ بات مفسّر ابن کثیرؒ کے حوالہ سے پہلے نقل ہو چکی ہے۔ جب سورۂ فاتحہ قرآن عظیم ہے تو یہ زیادہ قابلِ احترام و تعظیم بن جاتی ہے۔

تیسری وجہ یہ کہ مسلم شریف ص ۱۷۴ ج ۱ اور صحیح ابوعوانہ ص ۱۳۲ ج ۲ واللّفظ لہ کی صحیح حدیث میں ہے : اذا قرأ الامام فانصتوا واذا قال غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ فقولوا آمین۔ اس وقت قابلِ غور یہ ہے کہ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ ... الخ۔ سے پہلے سورۂ فاتحہ کے بغیر اور کونسی قرأت ہے کہ جس کو امام پڑھتا ہے اور مقتدیوں کا فریضہ اس میں انصات اور خاموشی ہے۔ مذہب کی آڑ کو چھوڑ کر سوچیں آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ منہی عنہ قرأت کو مازاد علی الفاتحہ پر محمول کرنا سراسر غلط اور مردود ہے۔ معلوم ہوا کہ امام کے فاتحہ پڑھنے کے وقت فاتحہ پڑھنا قرآن کریم اور حدیث کے مخالف ہے اور اس بے کار توجیہ اور جواب کا مچھّر کے پَر کے برابر بھی وزن نہیں۔ اللہ تعالیٰ صحیح سمجھ نصیب فرمائے اور علم پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

مصنف خیر الکلام امام اہلِ حدیث کا بیان ہے کہ انکار اس پر ہے کہ انھوں نے اونچا پڑھا تھا۔ کیا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے حضرت جبریل علیہ السّلام کی قرأت کے وقت اونچا

پڑھا تھا کہ آپؐ رو کے گئے ؟ بات صرف یہی ہے کہ کلامِ الٰہی کا حق واجب یہی ہے کہ جب وہ پڑھا جائے تو خاموشی اور محض خاموشی سے سُنا جائے تاکہ آدمی خدا تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہو۔

الانتباہ : گزشتہ ایک جاہل غیر مقلد کا بیان گزر چکا ہے کہ اس نے مذہبی تعصّب میں آکر سُورۂ فاتحہ کے قرآن ہونے کا کھلے الفاظ میں انکار کر دیا ہے تاکہ آیت کریمہ کی زد سے بچاؤ ہو جائے۔ اس نے کہا کہ آیت میں تو یہ ہے کہ قرآن پڑھا جائے تو خاموش ہو کر سُنا کرو۔ سورۂ فاتحہ تو قرآن ہی نہیں ہے تو پھر خاموشی کا حکم کیسے لازم ہو سکتا ہے اور وجہ یہ بیان کی کہ قرآن کریم کے سب لوگوں کے ہاں تیس پارے ہیں۔ اوّل پارہ الٓمٓ کا کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فاتحہ تیس پاروں میں داخل نہ ہوئی۔ (لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ) خدا جانے یہ دلیل اس کے نفسِ امارہ کی تعلیم ہے یا شیاطین الانس والجن کی تلقین ہے۔ بہر حال اس کا نفس اسی پر مطمئن تھا۔ خواہ اس میں ایمان کا خطرہ بھی ہو اور وہ مذہبی مسلک قرأتِ فاتحہ خلف الامام کے لیے اس کو سدِّ سکندری سمجھے ہوئے تھا۔ اس کو سمجھایا گیا کہ یہ راستہ خطرناک ہے سورۂ فاتحہ کا قرآن نہ ہونا، اس عقیدہ سے کفر لازم آجانے کا خطرہ بنتا ہے لیکن اس کا خیال تھا کہ میں کسی حنفی کی بات نہیں مانوں گا اور اپنی بات کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس کو کہا گیا کہ :

اوّل اگر سورۃ الفاتحہ قرآن نہیں تو فاتحہ سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم کیوں پڑھا کرتے ہو۔ یہ تعوّذ کا پڑھنا تو قرآن شریف پڑھنے کے وقت مامور ہے : وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہ... الخ قرآنِ کریم میں آیا ہُوا ہے۔

دوم یہ کہ قرآنِ کریم کا تیس پارے ہونا کس صحیح اور مرفوع حدیث میں ہے تم تو اہلِ حدیث بنتے ہو۔ صحیح حدیث بتاؤ کہ قرآن کے تیس پارے ہیں اور اوّل پارہ الٓمٓ کا ہے۔ اگر یہ نہیں تو کسی صحابی کا قول ہی تو پیش کرو۔ ہم تسلیم کر لیں گے۔ تم تو حضرات صحابہ کرامؓ کا اجماع بیس تراویح کا بھی نہیں مانتے۔ میں صرف ایک صحابی کا قول بھی مان لوں گا۔ کہ قرآن کے تیس پارے ہیں اور اوّل پارہ الٓمٓ ہے۔

سوم قطع نظر ان باتوں کے بخاری ص ۶۴۲ ج ۲ میں ابو سعید بن المعلیٰؓ کی روایت میں ہے

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا لَاُعَلِّمَنَّکَ سورۃ ھی اعظم السّوَر فی القرآن اِلیٰ قولہ لاعلمنک سورۃ ھی اعظم سورۃ من القرآن۔ الحدیث اس صحیح اور صریح حدیث میں تو سورۃ الفاتحہ کو فی القرآن اور من القرآن فرمایا گیا ہے ــــ کہ یہ قرآن میں ہے اور قرآن سے ہے پھر اس کو قرآن سے خارج کرنا کونسا ایمان ہے؟

ممکن ہے کہ کوئی جاہل بقولِ مشہور "نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملّاں خطرہ ایمان" یہ کہہ دے کہ سُورۂ فاتحہ کو ترمذی ص۴۱۸ میں امّ القرآن کہا گیا ہے: اقرأ امّ القرآن۔ مضاف اور مضاف الیہ کا غیر ہونا مسلّم مسئلہ ہے۔ اس لحاظ سے سورۂ فاتحہ قرآن نہ ہوئی۔ ہاں امّ القرآن ہے۔

جواب یہ ہے کہ غیریت اعتباری کافی ہے۔ سورۂ فاتحہ قرآن بھی ہے اور امّ القرآن بھی ہے۔ منزّل من اللہ ہونا، معجز ہونا قرآن کریم کی ذاتی صفات میں سے ہے۔ اس عالی شان میں فاتحۃ الکتاب اور تا آخر کل سورتیں شریک اور مساوی ہیں اور سورۂ فاتحہ کُل قرآن کا ماخذ اور اصل الاصول بھی ہے۔ سارا قرآن کریم اس کی شرح اور تفصیل ہے۔ اس اعتبار سے اس کو امّ القرآن بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ مکّہ شرفہا اللہ تعالیٰ کو امّ القریٰ بھی کہا جاتا ہے: وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا۔ (پ۷، الانعام ع۱۱) اور اس کو قریۃ بھی کہا جاتا ہے: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ بھی آیا ہے۔ اور قریتین سے مراد مکہ شریف اور طائف ہے جس طرح مکّہ مکرّمہ کو قریۃ بھی کہا گیا اور امّ القریٰ بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مقاماتِ حریری میں ہے: وحرمۃ الشیخ الذی سن القری واسس المحجوج فی ام القریٰ۔ اسی طرح سورۂ فاتحہ قرآن بھی ہے اور امّ القرآن بھی ہے۔ اس کو قرآن نہ کہنا جہالت ہے بلکہ کفر کا اندیشہ بھی ہے۔

تفصیل بقدرِ ضرورت یہ ہے: کہ سورۃ الفاتحہ کی شان باقی تمام قرآن کریم سے نرالی ہے۔ باوجود مختصر ہونے کے کل قرآنِ کریم کے مضامینِ حقّہ کی یہ جامع ہے۔ گویا یہ سورت الفاتحہ کل قرآن بن گئی۔ جس نے اس کو پڑھا گویا اس نے کل قرآن کریم کو دل و دماغ میں جمع کر لیا بعض سورتوں کو ربع القرآن اور بعض کو ثلث القرآن حدیثِ نبوی میں فرمایا ہے۔ اس طرح اس کو

پورا قرآن کہا جاسکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں تمام کلامِ خداوندی کو قرآن فرمایا گیا۔ لیکن جمیع مافی القرآن کے جامع ہونے کے لحاظ سے اس کو قرآنِ عظیم کا لقب دیا گیا ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ جیسے پورے قرآن میں مضامین دُہرائے گئے ہیں کہ دُنیا کے ذکر کے ساتھ آخرت کا ذکر، جنت کے ذکر کے ساتھ دوزخ کا ذکر کیا گیا اور مومنوں کے ذکر کے ساتھ کافروں کا ذکر وغیرہ وغیرہ تو اسی طرح اس سورۃ الفاتحہ میں بھی کیا گیا ہے گویا الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ سے لے کر مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ تک کل کتابِ الٰہی شرح اور تفصیل ہے اس سورۃ الفاتحہ کی۔ اس تفصیل میں لمبی لمبی سورتیں پہلے ذکر کی گئی ہیں اور چھوٹی بعد میں لائی گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تفصیلی قرآن کی ابتداء الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع ہوئی اور یوں کہہ لیجئے کہ سورۃ الفاتحہ متن ہے اور باقی اس کی شرح ہے۔ سہولت کے لیے حضرات سلف صالحینؒ نے اس کو تیس پارے بنا دیا۔ جیسے کہ پڑھنے کے لیے اس کی سات منزلیں مقرر کی گئیں۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس لحاظ سے اور اس اعتبار سے سورۃ الفاتحہ کو اوّل پارہ کا جزو نہیں کہا گیا کیونکہ اس کی نسبت کل قرآنِ کریم کے ساتھ ایک ہی طرح کی ہے اس لیے اس کو ابتداء میں مستقل رکھا گیا ہے جیسے متن الگ ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

میں نے سُنا کہ کسی جاہل اہلِ حدیث نے یہ بھی کہا (جو فاتحہ خلف الامام پڑھنے کو فرض کہتے ہیں اور مقتدی کی نماز کو سورۃ الفاتحہ پڑھنے کے بغیر باطل کہتے ہیں) وہ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ قرآن اور حدیث میں فاتحہ کو قرآنِ عظیم کہا گیا ہے لیکن سورۃ الاعراف والی آیت جو حنفیہ استدلال میں پڑھتے ہیں: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا اس میں تو قرآنِ عظیم کا لفظ نہیں ہے صرف قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ہے اس لیے اس سے مراد باقی قرآن ہے۔ یعنی باقی قرآن کریم فاتحہ کے بغیر پڑھا جائے تو تم خاموش ہو کر سُنا کرو۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ۝

افسوس صد افسوس امراضِ قلبیہ حسد اور ضد و عناد انسان کے دل و دماغ پر پردہ ڈال دیتے ہیں، نورانیت جاتی رہتی ہے۔ اس جاہل نے یہ نہ سوچا کہ قرآن کو کبھی عزّت

کے طور قرآن مجید اور کبھی قرآن کریم اور کبھی قرآنِ حکیم و قرآنِ شریف بھی کہہ دیتے ہیں صفت کے ذکر کرنے سے شئی بدل نہیں جاتی اور اس کا نام الفرقان، الذکر، موعظ اور ھُدًی وغیرہ بھی ہے۔ کیا اس طرح کہنے سے وہ قرآن ہونے سے نکل گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھ نصیب کرے۔ دیکھیے اس سورۃ الفاتحہ کے عظمتِ شان اور جامعیّت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نمازیں اس کے پڑھنے کو لازم کر دیا گیا ہے اور باقی قرآن جو تفصیل ہے اس میں سے کچھ قدر کا ملانا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ اس کی برکات سے بھی مسلمان محظوظ ہو جائیں لیکن جب جماعت سے نماز ادا کی جائے اور قرأت جہر سے کی جائے تو اس وقت مقتدی کو اپنے پڑھنے کی بجائے امام صاحب کی قرأت کا خاموشی سے سننا واجب کیا گیا ہے۔ اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔ تاکہ ادب اور احترام قرأت قرآن کریم کا محفوظ رہے۔ اس وقت اپنے پڑھنے میں امام کی قرأت سے بے التفاتی بن جاتی ہے۔ دیکھیے قاری صاحب جب دیکھتا ہے کہ میری قرأت کی طرف دھیان نہیں کیا جاتا، بے التفاتی کا برتاؤ ہو رہا ہے تو دل میں وہ رنجیدہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی صورت کو حدیث میں قانونی جرم قرار دیا گیا اور واذا قرأ فانصتوا کا حکم دیا گیا ہے اور قرآن کریم نے بھی یہی ادب سکھایا ہے اور فرمایا ہے: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ عظمت شانِ فاتحہ اس کو نہیں چاہتی کہ ہر ایک اس کو پڑھے بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ امام جو اشرف القوم ہے اس کو پڑھے اور قوم کو فرمانِ خداوندی سُنائے تو اس وقت قوم ہمہ تن گوش ہو کر نہایت خاموشی سے اس کو سُنے اور اس میں تدبّر و تفکّر کرے۔ امام صاحب کے فاتحہ پڑھنے کے بعد آمین کہہ کر دُعا میں شرکت کرے اور قرأت کے وقت صرف خاموش رہے۔

فائدہ: اس بیان سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ جہری نمازوں میں فاتحہ خلف الامام پڑھنے کی ممانعت کا اصل سبب یہی ہے کہ مقتدی کا پڑھنا جب کہ امام پڑھ رہا ہو امام کی قرأت کے سُننے میں خلل انداز بنتا ہے۔ خواہ خفیہ طور سے ہی مقتدی کی قرأت کیوں نہ ہو؟ کیوں کہ اس میں مقتدی کی کامل توجّہ سُنی ہوئی قرأت کی طرف نہیں رہتی۔ اپنے کام میں لگ جانے سے دوسری طرف دھیان پورا نہیں رہتا۔ یہ معنی نہیں کہ اونچا

Scanned by CamScanner

نہ پڑھے کہ امام کو قرآت میں التباس پڑے گا۔ جیسے مصنف خیر الکلام بار بار یہ سبق دھراتے ہیں۔ غور فرمائیں کہ اونچا پڑھنا، جہر کرنا اور شور وغل کرنا اگر یہی ممنوع اور بے جا حرکت ہے اور حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو ایسے پڑھنے نے خلجان میں ڈالا اور اس پر آپ ناراض ہُوئے تو یہ اُونچا پڑھنا اس پڑھنے والے شخص کے دائیں اور بائیں طرف کے لوگوں کے لیے بھی ان کی قرأت میں خلل انداز بنتا۔ پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو امام تھے تھوڑے فاصلہ پر تھے اگر وجہ ناراضگی یہ ہے تو پڑھنے والے مقتدی کے آس پاس والے لوگ بھی ضرور اس سے متاثر ہوتے۔ حالانکہ کسی پاس والے شخص نے یہ شکوہ نہیں کیا، ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے بھی بصیغۂ مفرد متکلم مالی انازع القرآن فرمایا ہے۔ کسی غیر کو اس میں شریک نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جماعت میں قرأت کرنے والا صرف امام ہی تھا۔ اگر مقتدی بھی قرأت کرتے تو لازمی طور پر سب کی قرأت میں اس اونچے پڑھنے سے جہر کرنے سے اختلال پیش آتا حالانکہ اور کسی نے یہ شکایت نہیں کی اور نہ آپ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے شکایت کے فرمان میں ان کو شریک کیا اور یہ نہیں فرمایا: مالنا ننازع القرآن۔ بلکہ فرمایا تو یہ فرمایا کہ انی اقول مالی انازع القرآن۔ بصیغہ مفرد حکایت فرمائی اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص کا سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى پڑھنا مخفی انداز کا تھا لیکن یہ مخفی انداز کا پڑھنا بھی چونکہ ممنوع فعل تھا اور وانصتوا کے حکم کے خلاف مکروہ اور ممنوع تھا اس لیے اس کے پڑھنے سے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو گرانی محسوس ہُوئی اور لوگوں کو پتہ نہ چلا یہ قلبی ایذاء اور کوفت جو اِن کے پڑھنے سے ہُوئی۔ ایسا فعل واجب الترک ہے۔ فتح الملہم ص ۲۳ ج ۲ میں ہے: اما قولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم فی حدیث عمرانؓ بن حصینؓ وھو فی السریۃ قد ظننت ان بعضکم خالجینھا۔ ابلغ عندی فی النھی عن قولہ لا تقرؤا خلفی لو کان ورد۔ یعنی صریح نہی عن القرأۃ خلف الامام سے یہ تعبیر قد ظننت ان بعضکم خالجینھا۔ زیادہ اس فعل کے قبیح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ خلجان یعنی آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قلبی ایذا رسانی اسی سے ہُوئی اور مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا

رَسُوْلَ اللّٰہِ قرآن کریم میں آ ہی چکا ہے اور ایذا دہی کے اسباب سے رُکنا بچنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ اسی نکتہ کو فتح الملہم ص ۲۳/۲ میں اس سے قبل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: فعدم الانصات والاستماع فی الصلوٰۃ اولیٰ واحق بان یکون سببًا للتلبیس والتخلیط والمنازعۃ والمخالجۃ وھٰذہ الامور لاشُبْھَۃَ فی انہ ینبغی ان ینھیٰ عنھا وعما یوجبھا ویفضی الیھا فی الاغلب یعنی امام کی قرأت کے زمانہ میں مقتدی کا انصات واجب نہ کرنا اور استماعِ مأمور کو ترک کرنا اور اس کی بجائے اپنی قرأت میں مشغول ہو جانا یقیناً مکروہ اور قبیح فعل ہے۔ مقتدی کا ایسا عمل ضرور بالضرور امام کی قرأت میں اشتباہ ڈالے گا۔ التباس اور اختلاط پیدا کرے گا اور اس سے اس کو قرأت میں خلجان اور قلبی کوفت ضرور پیدا ہوگی۔ نماز میں ایسا اختلال اور پریشانی ڈالنے والی چیز ضرور ممنوع قرار دی جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان مختلف عنوانات سے شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے نہی عن القرأۃ خلف الامام فرمادی۔ بجائے صریح نہی کے ان عنوانات سے ان اسباب پریشانی کا ذکر کرنا زیادہ مؤثر ہو جاتا ہے۔ جیسے دعویٰ مع الدلیل کو کلام کی خوبی کہا جاتا ہے۔ دیکھیے! کسی سے آپ کہیں کہ تیری اس بات نے دل میں کوفت پیدا کی، خلجانِ قلبی ہوا۔ اس کا یہی معنی ہے کہ تو بات نہ کرتا تو اچّھا ہوتا اور یہ قلبی پریشانی نہ ہوتی اس کے بعد حضرت قتادہؒ کا یہ فرمانا کیا معنی رکھتا ہے: لوکرھہ لمنعہ کیا خالجینھا وغیرہ الفاظ سے کراہت معلوم نہیں ہوتی؟ اس سے معلوم ہُوا کہ قرأت خلف الامام خواہ خفیہ ہی ہو یقیناً مکروہ فعل ہے اور مُفوِّت واجب مأمور ہے۔ وَاَنْصِتُوْا کا حکم صریح قرآنِ کریم اور حدیثِ نبویؐ دونوں میں آچکا ہے۔ تعجب ہے ان بعض شافعیہ حضرات محدثین کرامؒ کے رویّہ پر کہ اس حدیث میں وانصتوا کے ذکر کو تفرد کا بہانہ بنا کر اس کو ٹالتے ہیں کہ فلاں راوی اس کے روایت کرنے میں متفرد ہیں اوروں نے یہ ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اس کے ثقہ متابع بھی موجود ہیں۔ قطع نظر اس سے کیا قرآنِ کریم میں یہ لفظ نہیں آیا؟ فَاسْتَمِعُوْا، وَاَنْصِتُوْا۔ کیا قرآن کریم میں یہ بھی کسی حنفی نے لکھ دیا ہے؟

یا تفرد اور شذوذ کا بہانہ یہاں بھی ہو سکتا ہے ؟ کیا یہ آیت کریمہ جلیل القدر محدثینؒ اور مفسرینؒ کے بیان کے مطابق بلکہ بالاجماع مقتدی کے بارے میں نازل نہیں ہوئی ؟ کیا قرآن و حدیث دونوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا: اِذا قرأ الاِمام فانصتوا پہلے پوری تفصیل گزر چکی ہے۔ فتح الملہم ص ۲۳ ج ۲ میں ہے: فعدم الانصات والاستماع فی الصّلوٰۃ اولیٰ واحق بان یکون سببًا للتخلیط والتلبیس۔ یہ اولیٰ واحق اس لیے فرمایا کہ نماز سے خارج مقتدی کا وضوٗ میں نقصان کرنا اور موافق سنّت نہ کرنا اس کو بھی حدیث شریف میں موجب تلبیس فی القرأۃ فرمایا گیا ہے۔

نسائی شریف ص ۱۶ ج کی روایت میں ہے مابال رجال یصلون معنا لا یحسنون الطھور انما یلبس علینا القرآن اولٰئک۔ لوگوں کا کیا حال ہے کہ نماز کے لیے وضوٗ موافق سنّت نہیں کرتے، ناقص طہارت کرتے ہیں اور ہمارے ساتھ نماز میں آملتے ہیں، انہی کی وجہ سے ہمیں قرأت میں التباس واقع ہوتا ہے۔ خیال فرمائیں کہ جب خارجِ نماز ایک ناقص عمل سببِ تلبیس اور تخلیط کا بن سکتا ہے بلکہ بنا تو داخلِ نماز جب مقتدی ایک ممنوع فعل کرتا ہے تو اس کا یہ فعل امام کی قرأت میں کیوں مزاحمت پیدا نہیں کر سکتا؟ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس نے جہر کیا تھا۔ اس لیے التباس ہوا۔ نہیں، نہیں، ہرگز نہیں، ظہر میں کون جہر کرتا ہے۔ بلکہ اس شخص نے قرأتِ ممنوعہ کی تھی۔ اس سے خلل واقع ہوا اور حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا فرمان بھی اس جگہ: ایکم قرأ، ایکم القاری ہے ایکم جھر نہیں ہے اور نماز بھی ظہر کی تھی اس میں جہر کون کرتا ہے ؟

الفائدۃ الاولیٰ: حضرت شیخ استاذ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ صاحبِ فتح الملہم سے میں نے ڈابھیل ضلع سورت میں سُنا کہ حضرات محدثین کرام شافعیہؒ اکثر کو دیکھا گیا ہے کہ وہ حدیث فاتحہ خلف الامام کی بحث میں جملہ واذا قرأ فانصتوا۔ فرمانِ نبویؐ کو ساقط کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں کہ اس میں راوی کا تفرد ہے اور یہ عامہ رواۃ کے مخالف ہے۔ صحیح نہیں۔ وغیر ذٰلک۔ ہم کہتے ہیں کہ اس کو آپ چھوڑ دیں لیکن حدیث کا اوّل حصّہ انما جعل الامام لیؤتم بہ تو صحیح ہے اور صحیحین میں مروی ہے اس

Scanned by CamScanner

کا فرمانِ نبوی ہونا تو مسلّم ہے کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔ ہمارے احنافؒ کے لیے یہی جملہ متفق علیہا کافی وشافی دلیل ہے۔ آگے کو نہ جائیں۔ بشرطِ انصاف یہی جملہ دلیل منع قرأت خلف الامام بن جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ائیتمام اتباع کو کہتے ہیں یہی تفسیر حافظ ابنِ حجرؒ نے قاضی بیضاویؒ سے فتح الباری میں نقل کی ہے۔ قال البیضاوی الائیتمام الاتباع۔ عنقریب سکتوں کے بیان میں یہ پوری عبارت باحوالہ نقل کردوں گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ اور قرآن میں اتباع کا لفظ آچکا ہے ؎ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ اس اتباع کی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ سے بخاری ص۳ میں یہ نقل کی گئی ہے: استمع وانصت اس وقت انما جعل الامام لیؤتم بہ حدیث متفق علیہ کا معنی یہ ہوجاتا ہے انما جعل الامام لیستمع لہٗ وینصت لقرأتہٖ۔ وہ انصات جس کو آپ لوگ گرا رہے ہیں وہ تو صدر حدیث ائیتمام کے لفظ کا مدلول بن رہا ہے اور امام کی قرأت کے وقت مقتدی کا انصات (خاموش رہنا) متفق علیہ صحیح حدیث سے ثابت ہورہا ہے۔

الفائدۃ الثانیۃ: گزشتہ روایت میں گزرا کہ کسی نے بحالتِ اقتداء حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے پیچھے ظہر کی نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى کی سورۃ پڑھی۔ آپ نے فرمایا: کس نے قرأت کی ہے؟ مجھے اسی سے خلجان پیدا ہوا ہے خالجنیھا۔ اس سے امام کے پیچھے سرّی نمازوں میں قرأت کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی۔ اس انکار کا معنی کراہت ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ حضرت قتادہؓ کا فرمان لوکرھہ لمنعہ اس مقام میں کچھ معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی چیز کو ناپسند کرنا اور اس پر نکیر فرمانا ہی کراہت ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ دن کی سرّی نمازوں میں مقتدی کی امام کے پیچھے فاتحہ خوانی مکروہ فعل ہے اور لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کی حدیث سے مقتدی کو مستثنیٰ کرنا ہوگا۔ من کا عموم وضع کے لحاظ سے نہیں بلکہ خارجی حالات کو دیکھ کر لیا جاتا ہے۔ اسی لیے عموم کو ظنّی کہتے ہیں۔ دیکھیے قرآن کریم میں فرمایا: اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى۔ اسی طرح وَاَمَّا

Scanned by CamScanner

مَنْ جَاءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى۔ کیا دونوں جگہ مَنْ کے عموم کی رٹ لگانا ایمان کا ضائع کرنا نہیں بنتا۔ حضرت سفیانؒ بن عیینہ راوی حدیث لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب اس حدیث کو مخصوص کر رہے ہیں۔ اذا کان وحدہ۔ (ابوداؤد) اور حضرت امام زہریؒ راویِ حدیث کے حوالہ سے ہم جہری نمازوں میں حضراتِ صحابہ کرامؓ کا قرأت خلف الامام سے رُک جانا بیان کر چکے ہیں۔ یکفیھم قرأۃ الامام۔ کہ مقتدیوں کو امام کی قرأت ہی کافی ہو جاتی ہے۔ امام کے پیچھے قرأت نہ کریں۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں پر انکار فرمایا۔ جہری نمازوں میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت اور سرّی میں حضرت عمرانؓ بن حصینؓ کی روایت ثابت ہو چکی ہے۔ جس کا تذکرہ ابھی عنقریب گزرا۔ الحمد للہ تعالےٰ حنفیہ کرامؒ کا یہی مذہب ہے بعض لوگوں نے سرّی نمازوں میں حضرت امام محمدؒ کا قول جوازِ قرأت خلف الامام کا نقل کیا ہے اور صاحبِ توضیح الکلام نے بھی ص ۵۹ سے ص ۶۴ تک اسی پر بحث کی ہے۔ لیکن محققین حضرات حنفیہ کرام کثرھم اللہ اس کو صحیح نہیں کہتے۔

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام محمدؒ مؤطا میں فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنی چاہیئے خواہ امام جہر سے قرأت کرتا ہو یا آہستہ اسی پر عام آثار دلالت کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مسلک اور مذہب بھی یہی ہے۔ (تحفہ الاحوذی ص ۲۵۸ ج ۱، یہ عبارت مؤطا امام محمدؒ ص ۹۴، جامع المسانید ص ۳۳۶ ج ۱، فتح القدیر ص ۲۴۱ ج ۲ اور روح المعانی ص ۱۳۵ ج ۹ وغیرہ میں بھی نقل کی گئی ہے) اور یہی مضمون ان کی کتاب الآثار ص ۲۱ میں ہے۔ جن لوگوں نے امام محمدؒ کا مذہب امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے جواز اور استحسان کا نقل کیا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح القدیر ص ۲۴۱ ج ۲، شامی ص ۳۶۶ ج ۱ اور فتح الملہم ص ۲۰ ج ۲ وغیرہ) افسوس ہے کہ غیر مقلدین مردود اقوال کا سہارا لے کر اپنے عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں جیسا کہ صاحبِ توضیح الکلام وغیرہ نے کیا ہے۔ سرّی نمازوں میں بھی مقتدی کا فاتحہ پڑھنا مکروہ ہی ہے ابھی حضرت عمرانؓ بن حصینؓ کی روایت میں گزرا۔ حضراتِ شوافعؒ بھی جمعہ کے خطبہ میں یہی حکم دیتے ہیں کہ جن لوگوں کو خطیب کی آواز نہیں پہنچتی ان کو بھی خطبہ کے دوران میں وظائف

Scanned by CamScanner

پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے اور ان کے لیے خاموش رہنے کا ہی حکم دیتے ہیں۔ حافظ ابنِ حجرؒ کی عبارت میں تصریح ہے: کہ اکثر شافعیہؒ اسی کے قائل ہیں۔ صحیح بھی یہی ہے۔ قرآنِ کریم نے فرمایا: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ اور یہ نہیں فرمایا: اِذَا سُمِع.

نتیجۃ الکلام بیان میں کچھ طول ہوگیا ہے۔ لیکن یہ طول انشاءاللہ تعالیٰ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ بڑے لوگ جب بے اعتدالی کر جاتے ہیں تو شکوہ کرنا پڑتا ہے مصنف خیر الکلام فاضل جماعت اہل حدیث نے حضرت امام بیہقیؒ کے کلام کا سہارا لیا کہ لوگ ان کے عقیدت مند ہیں۔ بلا سوچے سمجھے تصدیق کرلیں گے اور اپنا کام چل جائے گا۔ کہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى پڑھنے والے صحابی پر آپؐ کا انکار اس کے اُونچے پڑھنے پر تھا۔ نفس قرأت خلف الامام پر انکار نہیں تھا۔ ان کی عبارت نقل کی کہ فرماتے ہیں: لولا انه جهر۔ اگر اس نے جہر سے نہیں پڑھا تھا تو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سورۃ کا نام کیسے لیتے؟ یعنی انکار اس کے جہر پر ہے۔ امام کے پیچھے خفیہ قرأت کی جا سکتی ہے۔ ہم نے اوّلاً یہ جواب دیا کہ یہ جہر نہیں تھا۔ ظہر کی نماز میں جہر کون کرتا ہے؟ یہ ھمس تھا جو مخفی قرأت ہی کہی جاتی ہے۔ لیکن اس میں کچھ آواز پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے نظائر بیان کیے تھے۔ وثانیاً یہ کہ تسمیہ سورۃ کا حضرت قتادہؒ کی اس روایت میں ہے جو قتادہؒ عن زُرارۃ بن اوفیٰ کے طریقے سے مروی ہے اور قتادہؒ مدلّس ہے۔ اور ایسی روایت مشکوک ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی حضرت امام بیہقیؒ استدلال اس سے کر گئے اور خاموش چلے گئے۔ اگر ایسی روایت حنفیہ کی ہوتی۔ تو یقیناً وہ کیا کچھ کہتے۔ بعض بڑے بڑے حضرات ایسا کر جاتے ہیں۔ دیکھئے حضرات امام بخاریؒ نے جزء القرأت میں حنفیہؒ کی دلیل جو مسلم شریف میں عن جریرؒ عن سلیمان التیمیؒ عن قتادہؒ عن یونسؒ بن غلابؒ عن ابی موسیٰ الاشعریؓ کے طریقے سے ہے نقل کی اور اس کے آخر میں ہے۔ زاد سلیمان التیمی فی ھٰذا الحدیث واذا قرأ فانصتوا۔ ان کے شاگرد نے پوچھا کہ کیا یہ زیادۃ صحیح ہے۔ تو امام مسلمؒ نے فرمایا: ھل تُرید احفظ من سلیمانؒ۔ الغرض امام مسلمؒ نے اس زیادۃ کو صحیح قرار دیا کہ زیادہ

ثقہ حافظ کی ہے اور صحیح ہے لیکن امام بخاریؒ نے جزء القرأت میں فرمایا کہ اس میں سلیمان تیمیؒ اور قتادہؒ مدلّس ہیں۔ اور یہ روایت عَنْ سے کر رہے ہیں اور اس کو مشکوک بنا گئے۔ کیا یہی قتادہؒ اس روایت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الاعْلٰی والی میں عَنْ کے صیغے سے روایت نہیں کرتے؟ کیا امام بیہقیؒ اس کو نہیں جانتے۔ صرف بات یہ ہے کہ چونکہ یہ اپنے مسلک کے لیے مفید ہے۔ خاموش ہو گئے ہیں۔ امام بخاریؒ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ جزء القرأت میں محمدؒ بن اسحٰقؒ عن مکحولؒ عن محمودؓ بن الربیع والی روایت لائے جس میں اِلّا بفاتحۃ الکتٰب فانہ لاصلوٰۃ اِلّا بِھَا۔ مذکور ہے۔ اس میں محمدؒ بن اسحٰقؒ اور مکحولؒ دونوں مدلّس ہیں اور عَنْ سے روایت کرتے ہیں اور امام بخاریؒ بھی یہ جانتے ہیں۔ لیکن فاتحہ کی دلیل میں اس کو ذکر کر گئے اور ان کی تدلیس کا نام تک نہیں کیونکہ یہ اپنی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ایسی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ وثالثاً یہ کہ امام مسلمؒ مسلم شریف ص۱۷۲ میں سابقہ روایت کے بعد حضرت قتادہؒ کی وہ روایت لائے جس میں قتادۃ سمعت زُرارۃ بن اوفیٰ ہے اس میں سماع کی تصریح ہے مشکوک نہیں لیکن اس کو بیہقیؒ نظر انداز فرما گئے کیونکہ یہ ان کے مفید مطلب نہیں تھی۔ سورت کا نام حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے فرمان میں نہیں ہے۔ آپؐ نے ایّکم قرأ فرمایا۔ ہاں یہ سورۃ کا نام پڑھنے والے کے پاس والے شخص کے کلام میں ہے: جاء رجل فقرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی۔ اگر وہ اس کو لیتے تو مقتدی کا جہر سے پڑھنا نہیں معلوم ہوتا۔ پاس والا شخص کبھی سرّی قرأت بھی سُن لیتا ہے۔ اس میں انکار نفس قرأت پر بنتا ہے اس لیے اس کو حضرت امام بیہقیؒ نے چھوڑ دیا اور بیمار کو میدانِ استدلال میں لاکر کھڑا کر دیا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جب سماع ثابت ہو گیا تو اوّل روایت عَنْ زُرارۃ بن اوفیٰ والی بھی مقبول بن جائے گی۔ یہ کاروائی بالکل نامناسب ہے۔ کیونکہ اوّل روایت کا مضمون اور ہے اور دوسری کا اور ہے جیسے ابھی ہم نے عرض کر دیا ہے اس کو متابعت نہیں کہہ سکتے۔ متابعت موافقت کا نام ہے اور یہاں مخالفت ہے۔ اس لیے امام بیہقیؒ نے مطلب سازی کے لیے بیمار روایت کو لیا اور اپنا کام چلایا۔ اگر صحیح سلامت روایت کو لیتے

Scanned by CamScanner

تو ان کا مقصد فوت ہوتا ہے اس لیے ان دونوں روایتوں میں ترجیح کا راستہ لیا جائے گا۔ ہم تو اس بیمار کے علاج کا مشورہ دیں گے۔ آپ کے نزدیک اگر وہ بیمار پہلوان کشتی کے میدان میں جیتنے والا ہے تو آپ جانیں۔ ہمارا پہلوان تو تندرست ہے۔ **ورابعاً** یہ کہ ایک راوی اگر تسمیہ سورت کا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے کلام میں نقل کرتا ہے جیسے کہ مذکور ہوا، تو بالمقابل تین چار ثقہ حضرات تسمیہ سورۃ کا پاس والے شخص کے کلام میں بیان کرتے ہیں پھر آپ کیسے جزماً فرماتے ہیں ؟ کہ اگر اونچا نہ پڑھا ہوتا تو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سورۃ کا نام کیسے لیتے ؟ منصف مزاج اور حقیقت شناس اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس مفصّل بیان سے معلوم ہوا کہ خیر الکلام کے بورڈ والی دکان کا یہ سودا بھی کھوٹا ہے اور ہم نے بتا دیا ہے پھر بھی اگر کوئی لینا چاہتا ہے تو اس کی مرضی، ہم نے رہنمائی کر دی ہے۔

؎ اندھیری شب ہے رستہ گم ہے لیکن
نظر آتے ہیں منزل کے اُجالے

Scanned by CamScanner

الهدیۃ السّنیّۃ فی المکالمۃ
بین قتادہؒ وشعبۃؒ
فی الفاتحۃ خلف الامام فی الصّلوٰۃ السّریّۃ

ابو داؤد شریف ص۱۲۰ ج۱ میں ہے کہ ایک شخص نے ظہر کی نماز میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے پیچھے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی پڑھا۔ اس کے بارے امیر المؤمنین فی الحدیث امام شعبہؒ نے حضرت قتادہؒ سے کہا کہ یہ پڑھنا تو حضرت شیخ سعیدؒ بن المسیّبؒ کے فرمان اور معمول کے خلاف ہے: الیس قول سعید انصت للقرآن۔ (جب قرآنِ مجید پڑھا جائے تو تم خاموش رہو) انھوں نے جواباً فرمایا: ذاك اذا جهر یعنی خاموشی کا حکم امام کی قرأت جہری کے وقت ہے اور ظہر کی نماز تو سری ہے۔ یہ سری اور جہری کا فرق حضرت قتادہؒ اپنی طرف سے فرما گئے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ حضرت سعیدؒ بن المسیّبؒ سرّی اور جہری کا فرق کیا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ یہ ان کی ذاتی رائے تھی کہ سرّی نماز میں امام کے پیچھے قرأت جائز ہے لیکن خود اسی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے انکاری لہجہ میں فرمایا: ایّکم قرأ۔ کس نے قرأت کی ہے؟ مجھے اس نے خلجان میں ڈال دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلام کراہت پر ہی دلالت کرتا ہے لیکن حضرت قتادہؒ نے اپنی طرف سے یہ فرمایا: لو کرهه لنهیٰ عنه۔ اس سے معلوم ہُوا کہ وہ سری نماز میں قرأت خلف الامام کو مکروہ نہیں سمجھتے تھے۔ ہاں جہری میں وہ بھی مکروہ جانتے ہیں۔ ذاك اذا جهر بہ گزر چکا ہے۔ لیکن حضرت امام شعبہؒ اور سعیدؒ بن المسیّبؒ دونوں سری نمازوں میں بھی قرأت خلف الامام کو مکروہ کہتے ہیں۔

بذل المجہود ص۵۹ ج۲ میں ہے: الانصات للقرآن علیٰ قول سعیدؒ بن المسیبؒ

یشمل الصّلوٰۃ الجھریۃ والسّریۃ۔ اسی لیے حضرت امام شعبہؒ نے حضرت قتادہؒ کے قول کی تردید کی۔ ہاں جہری نمازوں میں یہ تینوں حضرات متفق ہیں کہ قرأت خلف الامام مکروہ ہے۔ یہی بات امام ترمذیؒ نے فرمائی۔ واختار اھل الحدیث ان لایقرأ الرجل اذا جھر الامام بالقرأۃ۔ یہ لفظ جملہ محدثین کرامؒ کو شامل ہے جن میں یہ تینوں حضرات بھی شامل ہیں۔

ہمارے ملک کے اہلِ حدیث کہلانے والے اپنا چہرہ شیشہ میں دیکھ لیں کہ وہ ان اہل الحدیث میں ہیں یہ تو امام کے ساتھ ہی پڑھا کرتے ہیں اور فعل مکروہ کرتے ہیں۔ ابھی معلوم ہُوا کہ یہ حضرت شعبہؒ، قتادہؒ اور سعیدؒ بن المسیبؓ بلکہ جملہ محدثین کرامؒ کے خلاف چل رہے ہیں۔ اگرچہ نام اہل حدیث کا لیتے ہیں۔ لیکن یہ اہلِ ہوٰی ہی ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ ابوداؤد کا راجح نسخہ اس جگہ بجائے من رأی القرأۃ اذا لم یجھر کے باب من لم یری القرأۃ اذا لم یجھر ہی ہے۔ جیسے کہ بذل المجھود ص ۵۸ ج ۲ میں ہے اور یہی مقام کے مناسب بھی ہے کیونکہ ظاہر حدیث کراہت پر ہی دلالت کرتی ہے۔ خلجان ڈالنے والی چیز مکروہ ہی ہوتی ہے اور اس سے حضرت امام شعبہؒ اور سعیدؒ بن المسیبؓ بھی یہی سمجھ رہے ہیں اور اگر ترجمۃ الباب پہلا عنوان ہی ہو تو بھی مسئلہ پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ کما لا یخفٰی۔ امام شعبہؒ اور سعیدؒ بن المسیبؓ کا تمسک فرمانِ نبویؐ واذا قرأ فانصتوا سے ہے۔ اس میں جہری اور سرّی کا کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ اسی لیے حضرت امام شعبہؒ نے فرمایا: اَلَیْسَ قول سعیدؒ انصت للقران۔ حالانکہ یہ سری نماز کا قصّہ ہے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ انصات کا لفظ سری قرأت سے بھی منع کرتا ہے۔ یہی بات گزشتہ عرض کی تھی کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام حضرت جبریل علیہ السّلام کی قرأت کے وقت خفیہ پڑھا کرتے تھے۔ اس سے روکنے کے لیے فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ نازل ہوا۔ جس کی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ نے استماع وانصت سے کی تھی۔ لفظ انصات ان دونوں جگہوں میں خفیہ قرأت سے منع کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت امام بیہقیؒ کا فرمان کہ لوگ جہر کرتے

Scanned by CamScanner

تھے۔ اس سے روکنے کے لیے فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا نازل ہُوا۔ یہ سب باتیں محض سرسری طور سے بے محل مذہبی چارہ جوئی کے لیے کہی گئی ہیں۔ اگر انصات جہر کے روکنے کے لیے آتا ہے تو حضرت شعبہؒ نے حضرت قتادہؒ کو کیوں فرمایا اَلَیْسَ قول سعیدؒ انصت للقرآن۔ کیا پڑھنے والے سرّی نماز میں امام کے پیچھے جہر سے پڑھا تھا۔ فریقِ ثانی کی ضد و تعصّب کا یہ رونا کئی بار رویا گیا ہے۔ غلط چال پر جگہ جگہ ٹھوکریں لگتی ہی رہتی ہیں۔ مزید ذرا اپنے گھر کا حال بھی ملاحظہ فرمائیں:

مصنف خیر الکلام فاضل جماعتِ اہلِ حدیث بار بار لکھتے ہیں کہ: انصات کا معنی یہ ہے کہ جہر سے نہ کیا جائے، شور و غل نہ کیا جائے۔ قرأتِ مشوشہ نہ کی جائے۔ حوالے کئی جگہ پہلے نقل ہو چکے ہیں۔ کیا پڑھنے والے نے ظہر یا عصر کی نماز میں امام کے پیچھے شور و غل کیا تھا اور جہر سے پڑھا تھا کہ حضرت شعبہؒ نے اس کی تردید کی اور اَلَیْسَ قول سعیدؒ انصت للقرآن فرمایا مگر آپ حضرات کے نصیب میں تو سب کھوٹی باتیں ہی آئی ہیں اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اگر امام بیہقیؒ کی تقلید آپ کرتے ہیں کہ انصات صرف جہر سے روکنے کے لیے آتا ہے اور خفیہ قرأت ہو سکتی ہے تو بتائیے کہ ان دونوں جگہ انصات کا لفظ کیوں لایا گیا ہے؟ یعنی استمع وانصت حضرت ابنِ عباسؓ کے کلام میں اور اَلَیْسَ قول سعیدؒ انصت للقرآن حضرت شعبہؒ کے کلام میں۔

فائدہ: حضرت امام محمدؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کو مستحب کہتے ہیں لیکن یہ نسبت غلط کی گئی ہے۔ فتح الملہم ص ۲۰ ج ۲ میں ہے مانسب الی محمدؒ من اصحابنا من استحباب قرأۃ الفاتحۃ فی السّریۃ احتیاطا فھو ضعیف۔ قال الشیخ ابن الھمام والحق ان قول محمدؒ کقولھما فان عبارتہ فی کُتبہٖ مصرحۃ بذٰلک قال محمدؒ لا نرٰی القرأۃ خلف الامام فی شئ من الصّلوٰۃ یجھر اولا یجھر۔ بعض علمائے احنافؒ نے امام محمدؒ کی طرف جو یہ منسوب کیا ہے کہ وہ سرّی نمازیں امام کے پیچھے قرأتِ فاتحہ کے قائل تھے۔ یہ نسبت غلط اور قول ضعیف ہے۔ حافظ ابن الہمامؒ

فرماتے ہیں کہ حق بات صرف یہی ہے کہ حضرت امام محمدؒ کا قول بھی حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام ابو یوسفؒ کی طرح ہے جیسا کہ خود ان کی اپنی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ہم کسی نماز میں سرّی ہو یا جہری امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہیں ہیں۔

امام محمدؒ تو ببانگِ دُھل فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیئے۔ امام جہر سے قرأت کرے یا خفیۃً۔ مزید فتح الملہم ص۲۰ ج۲ میں فرمایا: قال الشعرانیؒ قال ابوحنیفۃؒ بعدم وجوب القرأۃ علی المأموم سواء جھرا واسرّ بل لاتسن القرأۃ خلف الامام عند الامام بحال وکذٰلک قال مالکؒ واحمدؒ انہ لا تجب القرأۃ علی المأموم بحال بل کرہ مالکؒ للمأموم ان یقرأ فیما یجھر فیہ الامام سواء سمع قرأۃ الامام اولم یسمع۔

امام شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کسی حالت میں جہری نماز ہو یا سرّی امام کے پیچھے قرأت کے وجوب کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس کو غیر مسنون کہتے ہیں اور حضرت امام مالکؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی پر قرأت واجب نہیں کسی حال میں بھی۔ بلکہ امام مالکؒ تو امام کی قرأتِ جہری کے وقت مقتدی کی قرأت کو مکروہ کہتے ہیں اور مطلق کراہت کا لفظ کراہتِ تحریمی پر بولا جاتا ہے۔ خواہ مقتدی امام کی قرأت سُنے یا دُوری کی وجہ سے نہ سنے۔ بہر حال حضرت امام مالکؒ مقتدی کا قرأت کرنا مکروہ کہتے ہیں۔ دلیل واضح ہے کہ مقتدی کا قرأت کرنا فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کے حکم کے خلاف ہے ضرور مکروہ ہوگا۔ حضرت امام شعبہؒ اور حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ سرّی نمازوں میں بھی مکروہ کہتے ہیں۔ اسی لیے حضرت امام شعبہؒ نے حضرت قتادہؒ کے قول کی تردید کی۔ اگر ظہر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت مباح ہوتی تو تردید نہ کرتے۔

حضرات اہلِ حدیث تو جہری نمازوں میں بھی قرأت خلف الامام کرتے ہیں۔

حضرات ائمہ دینؒ اور محدثین کرامؒ کے اقوال آپ کے سامنے ہیں۔ حضرات غیر مقلدین صرف عمومات کو سامنے رکھتے ہیں۔ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب مگر آپ جانتے ہیں کہ حضرات ائمہ دینؒ بھی ان عمومات کو جانتے تھے لیکن دوسری طرف بھی نگاہ کرتے تھے کہ ممانعت کے نصوص بھی صحیح اور صریح ثابت ہو چکے ہیں اور عمومات

Scanned by CamScanner

میں تخصیصات بھی کی جاتی ہیں۔ کیا انصات کا حکم قرآن اور حدیث میں آنہیں چکا؟ مزید سنئے:

فائدہ: اساتذہ کرامؒ سے سُنا کہ اس مقام میں اللہ جلّ جلالہٗ وعمّ نوالہٗ نے حنفیہ کرامؒ کی غیبی مدد فرمائی ہے۔ شکر الحمد للہ! مسلم شریف ص۱۷۴ ج۱ میں امام مسلمؒ نے بروایت سلیمان التیمیؒ عن قتادہؒ سالقہ روایت سے زیادت نقل فرمائی۔ زاد سلیمان فی ھٰذہ الروایۃ واذا قرأ فانصتوا ... الخ یہ زیادت صحیح مسلم میں آچکی ہے۔ لیکن ان کے تلمیذ خاص نے الہامِ خداوندی سے ایک سوال کیا کہ کیا یہ زیادت صحیح ہے۔ امام مسلمؒ نے فرمایا ھل ترید احفظ من سلیمان؟ کیا تو سلیمانؒ سے زیادہ حفظ والا چاہتا ہے؟ ان کا عادل، ضابط ہونا تو پہلے ہی معلوم تھا کہ رجال صحیحین کے ایسے ہی شان والے ہوتے ہیں لیکن امام مسلمؒ نے ان کو بجائے حافظ ہونے کے احفظ بصیغہ اسم تفضیل فرما کر اور بھی اونچی شان والا ہونا بتا دیا کہ اس کی زیادت میں کیسے شک کیا جا سکتا ہے؟ یہ صرف حافظ ہی نہیں بلکہ احفظ ہے اس میں امام مسلمؒ نے ایک ضابطہ کی طرف اشارہ فرما دیا کہ ثقہ حافظ راوی کی زیادۃ جب کہ اوروں کی روایت سے معارض نہ ہو وہ مقبول ہوتی ہے۔ اس کو بمنزلہ حدیث مستقل سمجھا جاتا ہے۔ یہ مسلّمہ اصول ہے۔ امام بخاریؒ ص۱۰۱ ج۱ بھی اس کو اپنی صحیح میں ذکر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں: الزیادۃ مقبولۃ والمفسر یقضی علی المبھم اذا رواہ اھل الثبت.... الخ موجودہ صورت میں دیگر روایات اس جملہ واذا قرأ فانصتوا۔ کے بیان سے ساکت ہیں۔ لیکن ساکت اور ناطق کا تعارض نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ زیادت صحیح ہوئی۔ یہی امام مسلمؒ کی مراد ہے کہ فرمایا: ھل ترید احفظ من سلیمانؒ۔ صرف یہی روایت نہیں بلکہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں بھی یہ زیادت مروی ہے جس کا عنقریب ذکر آرہا ہے۔ یہ زیادت صحیحۃ واذا قرأ فانصتوا بتاتی ہے کہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کے عموم سے مقتدی خارج ہے۔ بلکہ امام سفیانؒ بن عیینہؒ راوی حدیث بھی ھٰذا لمن یصلی وحدہٗ فرما رہے ہیں کہ یہ حدیث اکیلے نماز پڑھنے والے کا حکم ہے۔ (ابوداؤد ص۱۱۹ ج۱) حضرت سفیانؒ کے اس فرمان کی وجہ اور ہے کہ اس حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ... الخ کے آخر میں

Scanned by CamScanner

فصاعدًا کا لفظ بھی مروی ہے اور بعض اور روایات میں فمازاد ، وماتیسّر وغیرہ کے الفاظ بھی مروی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور حصّہ قرآن کا ملانا بھی ضروری ہے۔ ان میں واؤ عاطفہ اور فا چاہتے ہیں کہ ماقبل اور مابعد ایک ہی طرح ضروری ہیں۔ یعنی فاتحہ کے ساتھ سورت یا کچھ اور آیات کا ملانا بھی ضروری ہے اس لیے یہ حکم امام یا منفرد کے لیے ہی کہا جاسکتا ہے۔ مقتدی کا سورت ملانا تو کوئی بھی نہیں کہتا۔ اسی لیے فرمایا: ھٰذا لمن یصلی وحدہٗ۔ بہرحال مقتدی اس حدیث لَاصلٰوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب سے خارج ہے۔ خواہ اس زیادت فمازاد، وما زاد وغیرہ کی وجہ سے کہا جائے یا واذا قرأ فانصتوا کے حکم کی وجہ سے کہ مقتدی کا مطلق حکم امام کے پیچھے خاموش رہنا ہی ہے اور قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کی شہادت یہی ہے۔ حقیقت میں یہ حدیث قرآن کریم کی آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کی تفسیر ہی ہے۔ گزر چکا کہ بالاجماع یہ آیت کریمہ امامت کے مسئلہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا اس زیادت واذا قرأ فانصتوا کی صحت میں کلام کرنا بے سود ہی ہے کیونکہ اوّل جملہ یعنی انما جعل الامام لیؤتم بہٖ تو متفق علیہ مروی ہے، اور گزر چکا کہ اُیتمام کا معنی اتباع ہی ہے اور فَاِذَا قَرَأَ فَاتَّبِعُوْهُ۔ کی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ سے استمع وانصت مروی ہے۔ اس وقت معنیٰ مذکور روایت کا یہ بن جاتا ہے کہ انما جعل الامام لیُستمع لقرأتہ وینصت لھا یہی واذا قرأ فانصتوا کا معنی ہے۔ الحاصل: حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی بروایت سلیمانؒ التیمی عن قتادہؒ مسلم شریف میں ہے۔ پہلے تو یہی اس کی دلیلِ صحت ہے پھر اس کے ساتھ امام مسلمؒ نے اس کی مزید توثیق بھی فرمادی ہے جو نورٌ علیٰ نور ہوگیا ہے سلیمان تیمیؒ اور قتادہؒ کے کئی متابع بھی موجود ہیں۔ تفصیل فیض الباری ص ۲۷ ج ۲ میں دیکھیں متابعت سے تدلیس کا شبہ رفع ہوگیا اور یہ حدیث قطعی حجت، صحیح اور صریح برھان قاطع بن گئی۔ اس کے بعد بے بنیاد شکوک پیدا کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ امام مسلمؒ کے اسی شاگرد نے ایک اور سوال بھی اس مقام میں کیا ہے۔ وہ پہلے سوال سے بھی زیادہ مفید

اور بفضلہٖ تعالیٰ حنفیہ کرامؒ کی تائیدِ مزید بنا اس نے پوچھا کہ یہ فرمان یعنی واذا قرأ فانصتوا کا جملہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں بھی مروی ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے فرمایا: ھو عندی صحیح۔ وہ بھی میرے نزدیک صحیح ہے۔ پھر پوچھا کہ اگر صحیح ہے تو آپ اپنی کتاب (صحیح مسلم) میں اس کو کیوں نہیں لائے؟ لِمَ لَمْ تصنعہ ھٰھنا؟ تو امام مسلمؒ نے جواب دیا کہ کتاب میں (اس کتاب میں) وہ احادیث لاتا ہوں جو بالاتفاق صحیح ہوں۔ حضرت ابوہریرہؓ والی روایت میں بعض حضرات محدثین کرامؒ تردّد کرتے ہیں اس لیے اس کو میں کتاب میں نہیں لایا۔ ہاں میرے نزدیک وہ بھی صحیح ہے امام مسلمؒ نے اس کی صحت پر بھی مہر تصدیق لگادی۔ بے شک امام ابوداؤدؒ نے اس میں کلام کیا ہے والوھم عندنا من ابی خالد۔ سند یوں ہے: ابوخالد الاحمر عن محمد بن عجلان عن ابی ھریرۃؓ انما جعل الامام... الخ۔ لیکن اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ابوخالد الاحمر بخاری اور مسلم شریف کا ثقہ حافظ اور ضابط راوی ہے اور فتح الملہم ص ۲۲ ج ۲ میں ہے: تابع اباخالد الاحمر فیہ عن محمد بن عجلان محمد بن سعد الانصاری عند عند النسائی ایضاً وحسان بن ابراھیم الکرمانی ذکرہ فی کتاب القرأۃ ص ۹ وھو من رجال الصحیحین ومحمد عجلان ثقۃ مأمون صدوق من علماء مدینۃ واجلائھم ومفتیھم ولیس ھٰذا من حدیثہ عن سعید المقبری الذی قیل انھا اختلطت علیہ .... الخ۔ امام ترمذیؒ نے کتاب العلل ص ۵۶۱ میں فرمایا: قال سفیانؒ بن عیینۃؒ کان محمدؒ بن عجلان ثقۃ مأمونا فی الحدیث وانما تکلم یحییٰ بن سعید القطان فی روایۃ محمد بن عجلان عن سعید المقبریؒ۔ لیکن یہاں محمدؒ بن عجلانؒ کی یہ روایت سعید المقبری سے نہیں ہے یہی بات فتح الملہم ص ۲۲ ج ۲ میں فرمائی گئی ہے۔ اس بیان سے واضح ہوگیا کہ مصنف خیر الکلام فاضل اہلِ حدیث کی وہ بات محض تعصب اور سینہ زوری ہے جو لکھتے ہیں: اگر وہم ابوخالد الاحمرؒ سے نہیں تو محمدؒ بن عجلانؒ سے ہوگا۔ یہ امام ترمذیؒ اور دیگر ائمہؒ جرح وتعدیل کے قول کے

مخالف اور مردود ہے۔ علاوہ ازیں ابو خالد الاحمرؒ کی روایت کے متابعات بھی موجود ہیں۔ ابھی گزر چکا ہے۔ پھر دہم کہنے کا کیا معنیٰ؟ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی مذکورہ روایت جو سلیمان التیمیؒ عن قتادہؒ کے طریق سے ہے۔ اس ابو خالد الاحمرؒ کی روایت کا شاہد صحیح اور قوی موجود ہے، الحاصل حضرت ابو ہریرہؓ بھی اس واذا قرأ فانصتوا کے راوی ہیں۔ روایت بھی بفرمان امام مسلمؒ صحیح اور قوی ہے۔ یہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت کے ساتھ مل کر جمہور کے دو شاہد عادل ہو گئے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت نہیں کرنی چاہیئے اس کا وظیفۂ وقت انصات ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث جو سلیمان التیمیؒ عن قتادہؒ کے طریق سے مسلم شریف میں آچکی ہے اس کی محتاج نہیں کہ اور محدثین کرامؒ سے اس کی صحت نقل کریں مسلم شریف میں آجانا ہی صحت کی ضمانت ہے بشرطیکہ راوی کی تدلیس اور عدم متابعت سے خالی ہو۔ اسی لیے بخاری مسلم کو صحیحین کے نام سے پکارا جاتا ہے کہ ان کی جملہ روایات غیر مشکوک اور صحیح ہیں۔ لیکن بہتر معلوم ہوتا ہے کہ بعض اور اجلہ محدثین کرامؒ کے اسمار گرامی بھی آپ دیکھ اور سن لیں برکت ہی ہوگی۔ فتح الملہم شرح مسلم ص ۲۲ ج ۲ میں فرمایا: حدیث ابی موسیٰ اشعریؓ صححہ احمدؒ بن حنبلؒ کما فی التمہید لابن عبد البرؒ وصاحبہ ابو بکرؒ بن الاشرمؒ ثم مسلمؒ ثم النسائیؒ من حیث اخراجہ فی مجتباہ ثم ابن جریرؒ فی تفسیرہ، ثم ابو محمدؒ بن حزم الاندلسی ثم ذکی الدین المنذریؒ ثم ابن تیمیہؒ وابن کثیرؒ فی تفسیرہ ثم الحافظ ابن حجرؒ فی الفتح۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔ ہمارے خیال میں امام ابو زرعہ رازیؒ کو بھی ملا لینا چاہیئے تاکہ عدد طاق بن کر احد عشر کوکبًا کا منظر بن جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام نوویؒ نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کتاب لکھتے وقت یہ طریقہ رکھا کہ جس قدر کتاب لکھتا حضرت شیخ ابو زرعہ رازیؒ کی خدمت میں پیش کرتا جس کو وہ صحیح قرار دیتے وہ باقی رکھتا اور جس حدیث کے متعلق وہ تردد ظاہر کرتے اس کو میں ترک کر دیتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی یہ روایت ان کی نظر میں بھی صحیح ہے۔ اسی لیے امام مسلمؒ نے اس کو کتاب

Scanned by CamScanner

صحیح مسلم میں درج کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فائدہ : امام مسلمؒ صحیح مسلم ص۱۷۴ ج۱ میں حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کی روایت انصات والی فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا لائے اور ان کے شاگرد کے پوچھنے کے بعد کہ کیا یہ زیادت صحیح ہے۔ مزید توثیق بھی فرمادی۔ کسی قسم کی جرح و تنقید نہیں کی، اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت مسلم شریف میں اگرچہ مستقل طور پر پیش نہیں کی۔ لیکن پوچھنے پر اس کی بھی تصحیح فرمادی اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ان کا مسلک اور مختار یہی ترک القرأۃ خلف الامام تھا۔ اگر فاتحہ خلف الامام کے وہ قائل ہوتے تو کچھ نہ کچھ اس میں کلام تنقیدی انداز میں فرمادیتے۔ شارح امام نوویؒ چونکہ شافعی المذہب ہیں اس لیے وہ ایسی باتوں کا اظہار نہیں فرماتے۔ بلکہ خاموش گزر جاتے ہیں اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ بعض محققین نے لکھا ہے کہ امام مسلمؒ کا مختار باب کے آخر کا حصہ ہوتا ہے۔ اوّل باب میں مطلق ذکر کر جاتے ہیں۔ بعد میں قیودات لاکر تخصیص کر جاتے ہیں۔ اوّل باب میں عن سے روایت لاتے ہیں۔ بعد میں سماع اور تحدیث والی روایات لاتے ہیں۔ وغیر ذلک۔

باب فاتحہ خلف الامام کے آخر میں یہ انصات والی روایات لانا اسی اصول کے موافق ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مسلک اسی خلافیہ میں ترک القرأۃ خلف الامام ہی تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ امام مسلمؒ کی روایت مقتدی کے بارے میں صریح ہے۔ امام بخاریؒ کی روایت صریح نہیں وہ عموم لفظی سے مقتدی کو داخل کرتے ہیں۔ لیکن ما من عام الّا وقد خص عنہ البعض کا مقولہ مشہور و معروف ہے۔ مقتدی کے لیے انصات کا حکم قرآنِ کریم اور صحیح و صریح احادیث سے ثابت ہے۔ یہی اس کے مخصوص ہونے کی دلیل ہے۔ دیکھئے: لاصیام لمن لم ینو الصّیام من اللیل۔ (روزہ نہیں ہوتا اس شخص کا جس نے رات سے نیت نہیں کی)۔ حدیث میں مَن کا لفظ موجود ہے حالانکہ نفل روزہ کی نیّت رات سے ضروری نہیں۔ روایات سے ثابت ہے کہ بعض دفعہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام گھر تشریف لے گئے۔ کھانے کا پوچھا۔ جواب ملا کہ کھانے کو کچھ نہیں تو آپؐ فرماتے کہ پھر آج ہمارا روزہ ہوگا۔

Scanned by CamScanner

فائدہ جلیلہ: حضرت استاذ علامہ سیّد محمد انور شاہ کاشمیری نوراللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مذاہب مدوّن نہیں ہیں۔ صرف ان کے بیانات سے ان کے مختارات معلوم کیے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں اختلاف بھی آجاتا ہے کسی نے ان کے الفاظ سے کچھ مطلب سمجھا اور کسی نے اور مطلب بیان کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کے بارے اختلاف چلا کہ ان کا مختار قرأت خلف الامام میں کیا ہے؟ حضراتِ شافعیہؒ ان کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں۔ دوسرے حضرات اس کا انکار کرتے ہیں۔ علامہ نوویؒ شرح مسلم ص۱۷۴ میں فرماتے ہیں: مما یؤید وجوبها علی المأموم قول ابی هریرةؓ اقراء بها فی نفسك فمعناه اقرأ بسرٍّ بحیث تسمع نفسك۔ یعنی امام کے پیچھے فاتحہ کی قرأت اس انداز کی کیا کرو کہ تم خود اس کو سُن سکو اس میں وہ سرّی جہری کا فرق نہیں کرتے عام رکھ کر قرأت خلف الامام کا حکم دیتے ہیں اور اس کو حضرت ابوہریرہؓ کے فرمودہ الفاظ کا معنی بتا رہے ہیں کہ سائل نے پوچھا: انا نکون وراء الامام. ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو اس کا جواب دیا کہ خفیہ قرأت کر لیا کرو۔ بظاہر اس کو وہ سرّی اور جہری دونوں پر محمول کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت تو ان کے صریح فرمان کے خلاف ہے۔ ترمذی ص۷۲ میں ہے: عن ابی هریرةؓ ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انصرف من صلوٰة جهر فیها بالقرأة فقال هل قرأ معی احد منکم آنفا فقال رجل نعم یا رسول اللہ قال انی اقول مالی انازع القرآن. فانتهی الناس عن القرأة مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما جهر فیه۔ یعنی حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک جہری نماز سے فارغ ہو کر فرمانے لگے کہ کیا تم میں سے کسی شخص نے میرے پیچھے قرأت کی ہے؟ ایک شخص نے کہا: جی ہاں میں نے کی ہے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میں دل میں سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرأت میں کیوں جھگڑا ہو رہا ہے؟ یہ ناراضگی کے الفاظ سُن کر حضراتِ صحابہ کرامؓ نے جہری نمازوں میں آپؐ کے پیچھے پڑھنا چھوڑ دیا۔ اسی طرح ابوداؤد ص۱۲۰ ج۱ میں ہے: قال ابوهریرةؓ

Scanned by CamScanner

فانتھیٰ النّاس یعنی یہ فانتھیٰ النّاس حضرت ابوہریرہؓ کا فرمان ہے۔ غور کریں کہ جب حضرت ابوہریرہؓ نے حضرات صحابہ کرامؓ کا قرأۃ خلف الامام پڑھنے سے رُک جانا بیان کر دیا تو اس کے بعد وہ کیسے فتویٰ دے سکتے ہیں کہ امام کے پیچھے سرّاً پڑھا کرو۔ نوویؒ ص۱۷۰ پر فرماتے ہیں فمعناہ اقراء بسرّ بحیث تسمع نفسک خفیہ پڑھ لیا کرو۔ اس انداز کا کہ اپنے کان تک آواز پہنچ جائے امام ترمذیؒ نے اس سے مخلص یہ سوچا کہ یہ مقولہ حضرت امام زہریؒ کا ہے حضرت ابوہریرہؓ کا نہیں فرمایا: قال الزھریؒ فانتھیٰ النّاس۔

اس کا اوّل جواب تو یہ ہے کہ یہ بات ایک مغالطہ پر مبنی ہے جس کا تذکرہ العرف الشذی ص۱۴۹ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت امام زہریؒ کی یہ حدیث بیان کرتے وقت آواز پست ہو گئی تھی حضرت سفیانؒ کچھ کلمات نہ سُن سکے تو اپنے پاس والے صاحب سے پوچھا کہ حضرت شیخؒ نے کیا کہا؟ اس نے کہا: قال الزھریؒ فانتھیٰ النّاس ... الخ۔ درحقیقت یہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کے الفاظ تھے جو سُنے نہیں گئے تھے۔ ابوداؤد ص۱۲۰ ج۱ میں ہے قال سفیانؒ وتکلم الزھریؒ بکلمۃٍ لم اسمعھا فقال معمرؒ انہ قال فانتھیٰ النّاس۔ یہ حضرت امام زہریؒ کا اپنا مقولہ نہیں ہے لیکن امام ترمذیؒ نے اس کو مقولہ امام زہریؒ کا ہی قرار دے دیا ہے اور مصنف خیر الکلام کو یہ مالِ غنیمت ہاتھ لگ گیا اور فوراً تھیلے میں ڈال دیا۔ لیکن یہ کچھ کام آنے والی چیز نہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

فسوف تریٰ اذا انکشف الغبار
افرسٌ تحت رجلک ام حمار!

مان لیجئے کہ یہ حضرت امام زہریؒ کا فرمان ہے تو بھی بڑی دلیل ہے کہ اس فرمان میں وہ حضرات صحابہؓ کا تعامل ہی بیان کر رہے ہیں۔ فانتھیٰ النّاس سے وہ حضرات صحابہ کرامؓ کا قرأت خلف الامام سے رُک جانا فرما رہے ہیں۔ انھوں نے کثیر التعداد حضرات صحابہ کرامؓ کو اسی طرح دیکھا پایا ہوگا اور حضرات صحابہ کرامؓ کے ساتھ حضرات تابعینؒ کا معمول بھی یہی بتا گئے۔ جھوٹ تو نہیں بول گئے۔ اگر یہ بزبان امام زہریؒ بھی ہو تو تب بھی حجّت ہے۔ جیسے اگر یہ بزبان حضرت ابوہریرہؓ ثابت ہو جائے اور صحیح سند سے یہی ثابت ہے۔

Scanned by CamScanner

(دیکھئے ابوداؤد ص۱۲۰ ج۱ بروایت ابن السرحؒ) دونوں صورتوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قرأت خلف الامام پر ناراضگی دیکھتے ہوئے حضرات صحابہ کرامؓ کا اس سے رک جانا اور اس کو چھوڑ دینا معلوم ہوتا ہے۔ وھوالمراد بیان کرنے والے دونوں حضرات صادق و مصدوق ہیں۔ اس کو دیکھتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ اپنی طرف سے قرأت خلف الامام کا فتویٰ کیسے دے سکتے ہیں؟ جیسے حضرت امام نوویؒ نے بیان فرمایا ہے (کہ امام کے پیچھے سرّاً قرأت کرلیا کرو) دیکھئے جس صحابیؓ کی قرأت کرنے پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ناراضگی فرمائی تھی، اس نے سرّاً ہی پڑھا تھا۔ جبھی تو آپؐ نے پوچھا تھا: ھل قرأ معی احد منکم آنفاً؟ اگر جہر کیا ہوتا تو ایسے کیوں پوچھتے؟ اس بیان سے وہ بات بھی رد ہوگئی جو بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ان کی مراد نہی عن الجھر بالقرأۃ ہے یہ محض غلط افسانہ ہے۔ اس کے بعد یہ بھی غور فرمائیں کہ بقول امام ترمذیؒ حضرت امام زہریؒ جن حضرات صحابہ کرامؓ کا قرأت خلف الامام سے رک جانا بیان فرمارہے ہیں۔ فانتھی الناس عن القرأۃ فیما جھر فیہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ اس کا منشا اور سبب کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ منشأ وہ ناراضگی ہی ہے جو فرمانِ نبویؐ انی اقول مالی انازع القرآن سے مفہوم ہوتی ہے یعنی میرے ساتھ قرأت میں کیوں جھگڑا ہو رہا ہے؟ چونکہ جماعت کی صورت میں قرآن کا پڑھنا صرف امام کا وظیفہ ہی ہے اور اسی کا حق ہے۔ مقتدی کا پڑھنا غصب منصب بنتا ہے اسی کو منازعت سے تعبیر فرمایا اور اسی سے ناراضگی ہوئی کہ یہ فعل مکروہ ہے۔ اگر اونچا پڑھا گیا تو اس میں اور لوگ بھی شریک ہوتے۔ اس لحاظ سے حضرات صحابہ کرامؓ نے اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے امام کے پیچھے پڑھنا چھوڑ دیا۔ یہی فانتھی الناس عن القرأۃ کا معنی ہے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ استدلال ترک قرأۃ خلف الامام پر اس حدیث کے اوّل حصّہ سے ہی تام ہو جاتا ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال ھل قرأ معی احد؟ انکاری لہجہ میں فرمانا اور آخر میں انی اقول مالی انازع القرآن تصریح کر دینا قرأت خلف الامام کے کراہت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جو چیز آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے تکلیف دہ بنتی ہے اس سے احتراز ضروری ہے اور وہ قرأت ہی ہے۔ ھل قرأ معی احد؟ اس پر صاف دال ہے

اس سے پتہ چلا کہ حدیث کے آخری حصّہ یعنی فانتھیٰ النّاس عن القرأۃ مع رسُول اللہ میں یہ کلام کرنا بے سُود ہے کہ یہ مقولہ حضرت ابوہریرہؓ کا ہے یا امام زہریؒ کا۔ جیسے کہ مصنف خیر الکلام یا اور شافعیہؒ حضرات نے بلا وجہ اس پر زور دیا ہے یہ بیکار بات ہے کیونکہ الیٰ اقول مالی انازع القرآن کا جملہ فرمانِ نبوی سننے والا بخوبی جان سکتا ہے کہ یہ انکار ان کے قرأۃ کرنے پر ہی کیا گیا ہے لہٰذا اس سے احتراز واجب ہوگا۔ آپؐ کو ایذا قلبی پہنچانے والے اسباب واجب الترک ہوں گے۔ اس کے بعد میں عرض کروں گا کہ یہ قرأت خلف الامام کی ناپسندیدگی جو حضرات صحابہ کرامؓ نے سمجھی اور اس سے رُک گئے جیسے فانتھیٰ النّاس ... الخ کے جملے کا مقصد ہے کیا یہ بات راویِ حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے بھی سمجھی یا نہیں؟ ظاہر تو یہی ہے کہ ضرور انھوں نے بھی اس سے قرأۃ کی ناپسندیدگی کو سمجھا ہوگا؟ اور اس کے بعد وہ بھی قرأت خلف الامام سے رُک گئے ہوں گے۔ بالخصوص کہ ان کی روایت واذا قرأ فانصتوا بھی صحیح ثابت ہو چکی ہے تو اس کے بعد ان کے کلام اقرأ بھا فی نفسک کا یہ معنی کیسے صحیح ہوگا کہ امام جب قرأت کرے تو اس کے پیچھے تم آہستہ سے پڑھ لیا کرو جیسے کہ امام نوویؒ نے بیان فرمایا ہے بالخصوص جبکہ یہ جہری نمازوں میں فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا حکمِ خداوندی کے بھی یقیناً مخالف ہے تو اس کے بعد یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت ابوہریرہؓ امام کے پیچھے قرأت کے قائل ہیں، غلط ہے۔ اور توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کی قسم سے ہے۔

مزید سنئے! حضرت امام ترمذیؒ نے اس کے بعد لکھا ہے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ کی طرف سے مجھے حکم ہُوا کہ میں اعلان کروں: لاصلوٰۃ الّا بفاتحۃ الکتاب .... امرنی رالنبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ان انادی ان لاصلوٰۃ الّا بفاتحۃ الکتب۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس فرمان میں محلِّ نزاع یعنی خلف الامام فاتحہ کا پڑھنا صریح نہیں ہے۔ لہٰذا یہ استدلال ناتمام ہے۔ ہاں اگر اس کے عموم لفظی سے استدلال کیا جائے تو مقتدی کو اس سے مستثنیٰ کرنا ہوگا۔ کیونکہ ابھی حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں گزرا کہ کسی نے امام کے پیچھے قرأت کی تو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے اس پر انکار فرمایا

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الکتاب ۔صرف امام اور منفرد کے بارے میں ہے ۔مقتدی کو ہرگز شامل نہیں ۔خاص کر جبکہ خود حضرت ابوہریرہؓ سے واذا قرأ فانصتوا کی روایت صحیح آچکی ہے ۔بہرحال یہ کہنا کہ حضرت ابوہریرہؓ جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام کے قائل ہیں، غلط افسانہ ہے ۔اس طرح ان کا یہ فتوٰی جیسا کہ امام نوویؒ نے فرمایا ان کی صریح روایت کے خلاف بن جائے گا ۔اور اگر کوئی ضد سے کام لے اور کہے کہ یہی معنی ہیں جو امام نوویؒ نے بیان کیا تو میں اس کو مصنف خیر الکلام کی وہ بات سناؤں گا جو انھوں نے ص۲۲۸ میں لکھی ہے ۔(حدیث کے جاننے والے سے مخفی نہیں کہ راوی کی روایت کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ رائے کا) دوسری جگہ ص۱۷۰ پر لکھتے ہیں ۔(پھر قاعدہ کے اعتبار سے راوی کی روایت کا اعتبار ہوتا ہے نہ رائے کا اگر راوی کی رائے روایت کے خلاف ہو تو اس کی رائے کو چھوڑ دیا جاتا ہے) آپ نے دیکھا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت صحیح اور صریح اس حکم اور فتوٰی کے خلاف موجود ہے ان کا فرمان فانتھی النّاس عن القرأۃ فیما جھر فیہ رسول اللہ صریح ہے اور واذا قرأ فانصتوا ان سے مروی حدیث میں آچکا ہے اس کے ہوتے ہوئے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت وہ کیسے دے سکتے ہیں ؟ جیسے کہ علامہ نوویؒ نے معنی بیان کیے اور ان کی طرف منسوب کیا۔ معلوم ہوا کہ نہ تو وہ فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں اور نہ وہ قرأت خلف الامام کا فتوٰی دے سکتے ہیں ۔ہاں بعض لوگ ان کے قول اقرأ بھا فی نفسک کو سری نمازوں میں اجازت دینے پر محمول کرتے ہیں لیکن یہ بات بھی چنداں معقول نہیں کیونکہ انصات کا لفظ جو ان کی روایت میں آچکا ہے وہ سری نمازوں میں بھی قرأت سے مانع بنتا ہے ۔پہلے گزر چکا ہے کہ ظہر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کے سلسلہ میں حضرت قتادہؒ کے سوال کے جواب میں حضرت شعبہؒ نے ان کو کہا : الیس قول سعیدؓ انصت للقرآن ۔اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انصات کا لفظ سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت سے روکتا ہے جب یہ ہے تو حضرت ابوہریرہؓ سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کی کیسے اجازت دیتے ہوں گے ۔اس سے پتہ چلا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث اقرأ بھا فی

Scanned by CamScanner

نفسک کا معنی امام کے پیچھے سرّا قرأت کرنا نہیں بلکہ اس کا معنی اقرأبها وحدك ۔ یعنی حدیث لاصلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب امام کے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں نہیں آئی ۔ یہ انفرادی نماز پڑھنے کے بارے میں ہے یعنی جب تم اکیلے نماز پڑھو تو اگر فاتحہ نہ پڑھو گے نماز نہیں ہوگی اور یہ خداج یعنی ناقص اور ناتمام ہوگی ۔ یہ اسی طرح ہوا جیسے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما اِلّا اَنْ یَّکون وراء الامام کے الفاظ سے مقتدی کی استثنا فرما رہے ہیں ۔ ترمذی ص۵۳ ۔ پہلے تفصیل گزر چکی ہے کہ انصتوا کا حکم سری وجہری دونوں نمازوں میں مقتدی کو قرأت سے منع کرتا ہے تو انا نکون وراء الامام کے جواب میں کیسے حضرت ابوہریرہؓ یہ فرما سکتے ہیں کہ امام کے پیچھے آہستہ آہستہ پڑھ لیا کرو ۔ اس لیے ہم نے کہا کہ اقرأ بها فی نفسك کا معنی اقرأ بها منفردا یا وحدك کے ہیں اس کی نظیر نحویوں کا قول ہے الاسم ما دل علیٰ معنیً فی نفسہٖ یعنی اسم اکیلے اپنے معنی پر دال بن جاتا ہے ۔ فی نفسہٖ کا معنی وحدانا و منفردًا ہے اور حرف کا معنی کہتے ہیں مالا یدل علیٰ معنی فی نفسہٖ یعنی حرف منفردًا اور اکیلا اپنے معنی پر دلالت نہیں کرتا ۔ جب تک ضم ضمیمہ نہ ہو ۔ محققین نحاۃ نے بیان کیا ہے کہ فی کا معنی ظرفیت مطلقہ اور علیٰ کا معنی مطلقًا استعلاء نہیں ہے یہ تو مدلول اسمی ہے ۔ بلکہ فی کا معنی ظرفیت خاصہ ہے جیسے صلیت فی المسجد اور علیٰ کا معنی استعلاء خاص ہے جیسے صلیت علیٰ السقف ۔ حرف کا یہ جزئی معنی سوائے ضم ضمیمہ کے تمام نہیں ہوتا ۔ (مزید تحقیق عبدالغفور حاشیہ شرح جامیؒ میں ہے) اس لیے کہا جاتا ہے کہ اسم بانفرادہ اپنے معنی پر دلالت کرتا ہے اور حرف منفردًا اور وحدانًا اپنے معنی پر دال نہیں ہوتا ۔ اسی طرح اقرأ بها فی نفسك کا معنی اقرأ بها وحدانا اور منفردًا کا ہوا ۔ یعنی فاتحہ اس وقت ضروری ہوتی ہے جب کہ نماز وحدانا اکیلے پڑھو ۔ یہی محاورہ صاحب کشاف نے قُلْ لَّهُمْ فِیْ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا ۔ آیتِ کریمہ میں لے کر معنیٰ کیا قل لهم خالیًا بهم لیس معهم احد غیرهم او کما قال ۔ اسی طرح ایک حدیث بخاری ص۹۷ میں ہے: واذا صلّی احدکم لنفسه فلیطول ما شاءَ

یعنی جب اکیلے تنہائی میں نماز پڑھو تو جتنی مرضی ہو طویل قرأت کر سکتے ہو۔ اسی طرح اقرأ بها فی نفسك کا بھی یہی معنیٰ ہے کہ جب اکیلے اور تنہائی میں نماز پڑھو تو اس وقت اپنی قرأت ضروری ہے ہاں امام کے پیچھے ہو تو امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے۔ مقتدی کی نماز خداج نہیں بنے گی۔ اگرچہ اس نے فاتحہ خود نہ پڑھی ہو۔ کیونکہ یہ بحکم شرع روکا گیا ہے۔ اس کو امام کی قرأت کے وقت انصات کا حکم دیا گیا ہے وہ استماع کرے گا اسی مطلب کے لیے ایک حدیث میں من کان له امام فقرأة الامام له قرأة۔ فرمایا گیا ہے۔ اسنادہٗ صحیح علی شرط الشیخین حاشیہ بخاری صـ۱۰۴۔ اسی کو دیکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ مقتدی حکماً قاری ہے۔ جیسے حضرت عثمانؓ کو غزوہ بدر سے روکا گیا تھا کیونکہ اس وقت ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم علیل تھیں تو ان کو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے حکم دیا کہ آپ گھر رہیں: ولك اجر من شهد بدرا وسهمه۔ تجھے بدر میں شریک ہونے والوں کا ثواب بھی ملے گا اور غنیمت بھی۔ اسی طرح مقتدی کو بھی قرأت سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے فرمایا ہے: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ اور یہ حکم احترامِ قرآن کے لیے دیا گیا ہے اور اس کی خاموشی کو حکماً قرأت قرار دیا گیا ہے۔ من کان له امام فقرأة الامام له قرأة کا یہی راز ہے۔ الغرض حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث اقرأ بها فی نفسك کا معنی یہی ہے کہ وحدانا اور منفرداً نماز پڑھو تو اس وقت قرأت کیا کرو۔

مزید سنیے کہ ایک محاورہ ہے اور حدیثِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں اس کو معتبر قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں آتا ہے فان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکرنی فی ملإٍ ذکرته فی ملإٍ خیر منه۔ ترمذی صـ۲۰۰ ج ۲

یعنی خدا تعالیٰ فرماتے ہیں جو شخص مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہوں اور جو شخص مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو ان سے بہتر جماعت ہوتی ہے یعنی فرشتوں میں۔ ہم نے اساتذہ کرام سے سُنا کہ اس حدیث میں من ذکرنی فی نفسه سے مراد منفرداً اور وحدانا ذکر کرنا ہے

اس کا قرینہ یہ ہے کہ مقابل میں فی ملإٍ سے مراد جماعت میں ذکر کرنا آرہا ہے۔ اگر خفیہ اور سرًا ذکر نا مراد ہوتا تو بالمقابل ان ذکرنی بالجھر کہا جاتا۔ اسی کو دیکھتے ہوئے حدیث میں اقرأبھا فی نفسک کا معنی منفردًا تنہائی میں نماز پڑھنا ہی قرین قیاس ہے۔ خاص کر جب کہ انہی حضرت ابوہریرہؓ سے واذا قرأ فانصتوا۔ نسائی ص۱۰۶ ج۱ میں صحیح طور سے ثابت ہو چکا ہے اور حدیث میں انصات کا لفظ بیان ہو چکا ہے کہ یہ خفیہ قرأت سے بھی مانع ہے خاص طور پر جہری نمازوں میں تو استماع اور انصات کے دونوں لفظ قرآن کریم میں آچکے ہیں۔ گزشتہ امام رازیؒ کی تقریر اور تفسیر بھی بیان ہو چکی ہے۔ ان وجوہ کو دیکھتے ہوئے کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اس سائل (جس نے انانکون وراء الامام کہا) کے جواب میں یہ فرمائیں کہ امام کے پیچھے خفیہ پڑھو۔ دیکھئے حضرت امام زہریؒ کا فرمان بھی پہلے گزر چکا ہے کہ وہ فانتھی الناس عن القرأۃ فرمارہے ہیں۔

اور یہی حضرت ابنِ عمرؓ کا قول مؤطا امام مالک ص۲۵ میں نقل کیا ہے: ان ابن عمرؓ کان اذا سئل ھل یقرأ خلف الامام قال اذا صلّی احدکم خلف الامام فحسبہ قرأۃ الامام واذا صلّی وحدہ فلیقرأ۔ (جب حضرت ابنِ عمرؓ سے امام کے پیچھے قرأت کرنے کے بارے پوچھا جاتا تو فرماتے جب کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہو تو اسکو امام کی قرأت کافی ہوتی ہے ہاں جب اکیلے پڑھے تو اسکو چاہیئے کہ قرأت کرے) وکان ابن عمرؓ لایقرأ خلف الامام اور حضرت ابنِ عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے تھے اور یہی حضرت زیدؓ بن ثابت کا فرمان بھی ہے جیسے امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ لاقرأۃ مع الامام فی شیٔ اور حضرت ابوالدرداءؓ کا فتوٰی ہے: ماأری الامام اذا ام القوم الّا کفاھم۔ (نسائی ص۱۴۶ ج۱) بلکہ اسی حدیث ابی ہریرہؓ کو اگر غور سے دیکھیں تو اس سے پتہ چل جائے گا کہ عام حضرات صحابہ کرامؓ کا معمول بھی یہی تھا کہ امام کے پیچھے وہ قرأت نہ کرتے تھے اور یہ اس لیے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جب ایسی نماز کو جس میں قرأۃ نہ کی جائے، ناقص، ناتمام اور خداج فرمایا تو اگر وہ سائل یا اور لوگ امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے تو ان کے ذہن میں یہ سوال کیسے کھٹکا کیونکہ ان کی نماز تو تمام ہوگئی جیسے کوئی کہے کہ جس نے التحیات للہ ... الخ امام کے پیچھے نہ پڑھی اس کی نماز خداج ہوگی، ناتمام ہوگی۔ اس وقت کسی اور کے ذہن میں سوال اپنی

Scanned by CamScanner

نمازوں کا پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ سب التحیات پڑھا کرتے ہیں۔ ہاں جو لوگ التحیات نہیں پڑھتے ان کو شبہ گزرے گا۔ اسی طرح فاتحہ خلف الامام والوں کو کیسے غم لگ گیا کہ ہماری نمازیں تو خداج بن گئیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سائل اور عام لوگ فاتحہ نہیں پڑھتے تھے اور نہ پڑھنے والوں کی نماز کو خداج کہا گیا تو اب اس نے سوال کیا اور حضرت ابوہریرہؓ کے جواب کا حاصل یہ ہُوا کہ یہ حکم خداج کا اکیلے نماز پڑھنے والوں کا ہے امام کے ساتھ جماعت میں نماز پڑھنے والوں کے لیے امام کی قرأت کافی ہو جاتی ہے وہ کیوں خداج بنے گی۔ غور سے حقیقت تک رسائی ہوگی۔

الانتباہ ممکن ہے کہ کوئی الٹی چال چلتے ہوئے یہ کہے کہ حضرت ابوہریرہؓ قرأت خلف الامام کے قائل ہیں کیونکہ بعض محدثین کرامؒ نے ان کا مسلک یہ بیان کیا ہے کہ وہ مدرک رکوع کو مدرک رکعت نہیں مانتے تھے۔ یعنی جو شخص امام کو رکوع میں پائے ان کے نزدیک اس کو وہ رکعت نہیں ملے گی۔ دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں: ابو عوانۃ عن محمد بن اسحاق عن عبد الرحمٰن الاعرج عن ابی ھریرۃؓ قال اذا ادرکت الامام رکوعًا لم تعتد بتلك الرکعۃ۔ یعنی جب تم امام کو رکوع میں پاؤ تو تم اس رکعت کا اعتبار نہ کرو یعنی وہ رکعت نہیں ہُوئی۔

اور یہ کہنا بظاہر اسی لیے ہوا ہے کہ اس نے فاتحہ نہیں پڑھی اس لیے ان کے قول اقرأ بھا فی نفسك کا یہی معنی ہے کہ امام کے پیچھے آہستہ سے قرأت کر لیا کرو۔ یہی چال صاحب توضیح الکلام نے بھی ص ۱۴۱ سے ص ۱۴۶ تک چلی ہے اور اپنا خصوصی ہتھیار انشائی (انشاء اللہ تفصیل پھر آئے گی) بھی استعمال کیا ہے۔ ماشاء اللہ یہ ہتھیار انشائی ان کے لیے ایسا کارگر ثابت ہوتا ہے کہ بڑے بڑے معرکۃ الآراء مسائل ان کے اس ہتھیار سے بیک جنبش قلم سر ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ موجودہ مادی دور کے بڑے بڑے مہلک ہتھیار بھی اپنے کیمیاوی اجزاء کے باوجود ان کے ہتھیار انشائی کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ سبحان اللہ! کیا ہی مؤثر اور مفید ہتھیار کے موجد ہیں۔ صاحب توضیح الکلام۔ اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ ہتھیار بھی ان کو اپنے مثبت دلائل کے اثبات میں استعمال کرنا پڑا

ہے۔ نافی دلائل کا رد کرنے سے پوری کتاب میں صرفِ نظر کیا ہے۔ حالانکہ عام مصنفین ایسے اختلافی مسائل میں ہر دو پہلوؤں (مُثبت و نافی) سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن صاحب توضیح الکلام کی محدود علمیّت یہاں سے ہی خوب واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے فریقِ مخالف (یعنی احناف) کے دلائلِ قویہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمّت بھی نہیں کی آخر ان کو اتنا تو معلوم ہے کہ احناف کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی معنیٰ رکھتا ہے۔ احناف کے دلائل قویہ کے سامنے تو بڑوں بڑوں کو دم مارنے کی ہمّت نہیں تھی۔ یہ بے چارے تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ شکر ہے کہ ان کے بڑوں نے ان کو اتنا سبق تو دیا ہے کہ دلائل احناف بیشہ شیر سے کم نہیں جن میں گھس کر واپس نکلنا محال ہے اس لیے ان سے تعرض ہی نہیں کرنا چاہیئے بلکہ صرف اپنے معتقدین سے دادِ تحسین وصُول کرنے کے لیے اپنے دلائل کو مخصوص حیلوں کے ساتھ پھیر پھیر کر اور پھیلا پھیلا کر کتب کا حجم بڑھانا چاہیئے اور انہی وطیرہ کے ساتھ ان کے گروہ کا ہر کس و ناکس بڑے بڑے جبال علوم کا مقابلہ کرنے پر تُل جاتا ہے جن کے سامنے ان کی علمی حیثیت پانچ سالہ طفلِ مکتب کی سی بھی نہیں ہوتی۔ اور یوں: "بازی بازی باریش بابا ہم بازی" کا مصداق بن بیٹھتے ہیں اور اگر کبھی ان میں کوئی نیک نیّت فریقِ مخالف کے علمی رُعب کی بنا پر پیچ مارنے سے پہلوتہی کرے تو کوئی نہ کوئی ان میں سے "خانہ خالی را دیو می گیرد" پر عمل کر لیتا ہے۔ آخر ہم بھی دیوبند ہیں۔ یہاں بھی کسی دیو کی پیش نہیں چلنے کی۔ بفضلہٖ تعالیٰ۔ خیر ہم تو بفحوائے حدیث ان لصاحب الحق مقالا۔ گفتگو کا یقیناً حق رکھتے ہیں اور اگر ایسی گفتگو سے ان کو سیخ پا ہونے کا موقع بھی مل جائے تو عوض معاوضہ گلہ ندارد کو پیش نظر رکھ لیں۔ غرضیکہ صاحب توضیح الکلام کی اُلٹی چال سے بات دور جا نکلی۔ ان کی چال کا جواب ملاحظہ ہو۔

جواب کہ بے شک بعض حضرات متاخرینِ شافعیہؒ اس کے قائل ہیں کہ رکوع میں امام کے ساتھ ملنے سے وہ رکعت نہیں ملتی کیونکہ اس نے فاتحہ نہیں پڑھی اور لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب آ ہی چکا ہے۔ لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کو اس لپیٹ میں لینا صحیح نہیں ہے۔ حضرت شیخ استاذ سیّد محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ

فرماتے تھے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا نظریہ یہ ہے کہ قیام فریضہ ہے جس شخص نے امام کو قیام میں پالیا اگرچہ تھوڑی ہی مقدار ہو تو اس کا رکوع معتبر ہوگا اور رکعۃ ہو جائے گی اور اگر قیام میں امام کو نہیں پایا صرف رکوع میں ملا تو اس کی وہ رکعت نہیں ہوگی۔ جزء القرأت امام بخاریؒ ص۴۵ میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: وَلا یجزئك الّا ان تدرك الامام قائما یعنی وہ رکعت کافی نہیں ہوگی جس میں تُو امام کو قیام کی حالت میں نہ پائے (بلکہ رکوع میں پائے) جزء القرأت کا یہ حوالہ صاحب توضیح الکلام نے بھی دیا ہے۔ (دیکھئے ص۱۴۲) لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے ہاں مدرک رکوع کے مدرک رکعت ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار قیام میں امام کو ملنے نہ ملنے پر ہے۔ قرأت فاتحہ پر نہیں۔ اگر ایک تسبیح کے برابر بھی قیام کو پالیا تو اس کی رکعت کو وہ درست کہتے ہیں لیکن اور عام محدثین کرامؒ کا یہ نظریہ نہیں ہے وہ امام کو قیام میں پانا ضروری نہیں کہتے وہ صرف رکوع میں مل جانے سے ہی مدرک رکعت کہتے ہیں جب کہ نماز میں شریک ہونے والا تکبیر تحریمہ قیام کی حالت میں سیدھا کھڑا ہو کر کہے پھر رکوع میں چلا جائے کیونکہ تندرست کے لیے نماز میں قیام فرض ہے اور ادنیٰ قیام یہ ہے کہ جس میں تکبیر تحریمہ کہہ سکے۔ (درمختار ص۴۱۴/۱) ان میں حضرات فقہاء حنفیہ کرامؒ تو فاتحہ مقتدی پر واجب ہی نہیں کہتے۔ بلا اختلاف وہ مدرک رکوع کی رکعت کو صحیح کہتے ہیں اور عام شافعیہ حضرات اگرچہ فاتحہ کا پڑھنا مقتدی پر فرض کہتے ہیں لیکن وہ مدرک رکوع کو اس ضابطہ سے مستثنیٰ کرتے ہیں کیونکہ احادیث اس بارے میں صحیح ثابت ہو چکی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رکوع پالینے سے رکعت مل جاتی ہے جیسے حضرت ابوبکرہؓ کی حدیث میں اس کا تذکرہ آنے والا ہے۔ لیکن بعض متاخرین شافعیہؒ اس کو مستثنیٰ نہیں کہتے وہ انکار کرتے ہیں۔ بہرحال یہ کہنا کہ حضرت ابوہریرہؓ امام کو رکوع میں ملنے والے شخص کو رکعت کا پانے والا نہیں کہتے اور صاحب توضیح الکلام کا یہ کہنا (کیونکہ وہ مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا ضروری کہتے ہیں۔) نرا مغالطہ ہے بلکہ وہ مقتدی کے لیے امام کو فی الجملہ قیام میں پانا ضروری کہتے ہیں تو ان کے نزدیک رکعت کا نہ ہونا ترک فاتحہ کی وجہ سے نہیں بلکہ ترک قیام کی وجہ سے ہے۔

Scanned by CamScanner

الحاصل: حضرت ابوہریرہؓ جب فاتحہ خلف الامام کو ضروری نہیں جانتے تو، انا نکون وراء الامام کے سوال کے جواب میں وہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کا حکم کیسے دے سکتے ہیں؟ کہ اقرأبها فی نفسك کا معنی اقرأبها سرّاً کیا جاتا ہے اور اس کی دلیل ان کا وہ فرمان لا تسبقنی بآمین ہے جو مروان سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔ پہلے اس کا قصہ حافظ ابنِ حجرؒ کے بیان میں دیکھیں جو فتح الباری ص ۱۲۸ ج ۲ میں ذکر فرمایا ہے: کان ابوھریرۃؓ یؤذن لمروان فاشترط ان لا یسبقه بالضالین حتی یعلم انه دخل فی الصف کانه کان یشتغل بالاقامة وتعدیل الصفوف وکان مروان یبادر الی الدخول فی الصلوٰة قبل فراغ ابی ھریرۃؓ فقال ابوھریرۃؓ لا تسبقنی بآمین فنهاه ابوھریرۃؓ عن ذٰلك۔ یعنی حضرت ابوہریرہؓ مروان کے مؤذن تھے اور ان کے ذمہ اقامت کے علاوہ صفوں کی درستگی کا کام بھی تھا اور مروان ان کی فراغت سے قبل ہی نماز شروع کر دیتا تھا جس کے نتیجہ میں ان کو ولا الضالین کے بعد آمین کہنے کا موقع نہ ملتا اس لیے انھوں نے مروان سے فرمایا کہ مجھے آمین کہنے کا موقع دیا کرو۔ جلدی نہ کیا کرو۔ لا تسبقنی بآمین۔ چونکہ آمین امام کے ساتھ پڑھنے کی بڑی فضیلت ہے اس لیے اس سے فرمایا کہ آمین پڑھنے کا موقع دیا کرو جلد بازی نہ کیا کرو۔ اس کے بعد یہ بھی خیال فرمائیں کہ آمین کہنا سنّت ہے۔ نہ کہنے سے یا چھوٹ جانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی اور فاتحہ کا پڑھنا فریقِ ثانی کے نزدیک فرض ہے اس کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں اور وہ نماز کو باطل کہتے ہیں۔

مقام غور ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو اس کے فوت ہونے کا خیال کیوں نہ آیا اور لا تسبقنی بالفاتحة کیوں نہ فرمایا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں بھی مقتدی کے ذمہ صرف آمین کا کہنا ہے۔ فاتحہ کا پڑھنا نہیں ورنہ ضرور وہ اس کا ذکر فرماتے۔ الحاصل ہم فاتحہ خلف الامام فرض کہنے والوں سے اور اس کے بغیر نماز باطل ہونے کا دعویٰ اور قول کرنے والوں سے دریافت کرتے ہیں کہ مروان کے جلدی سے قرأت شروع کرنے پر، اگر آمین کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے اور اسی لیے حضرت

Scanned by CamScanner

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو اس جلد بازی سے روکا تو بتائیے کہ کیا فاتحہ خوانی کے فوت ہونے کا اندیشہ بھی ان کو تھا یا نہیں؟ پھر کیا فرض کا فوت ہونا زیادہ خطرناک ہے یا سُنّت کا؟ ممکن ہے کہ امام فاتحہ کے بعد والعصر یا انا اعطیناک الکوثر ہی پڑھیں تو اس مقدار میں فاتحہ جو سبع مثانی ہے کیسے پڑھی جاسکے گی؟ فرض کیجئے آمین کو انھوں نے پالیا لیکن اس کے بعد وہ فاتحہ کیسے پوری کریں گے؟ غرضیکہ آپ حضرات ضرور آمین کی تخصیص کی وجہ بتائیں کہ انھوں نے لا تسبقنی بآمین فرمایا اور فاتحہ کو کیوں چھوڑ دیا؟ حنفیہ کرامؒ تو مقتدی پر فاتحہ لازم ہی نہیں کہتے اور جمہور شافعیہؒ مدرک رکوع کو مستثنیٰ کہتے ہیں کہ حدیث اس بارہ میں ثابت ہو چکی ہے اور پہلے بیان گزر چکا ہے۔

اطلاع مصنف خیر الکلام نے صـ ۱۸۱-۱۸۲ پر لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا فتویٰ جزء القرأۃ صـ ۵ میں مرقوم ہے اذا قرأ الامام بام القرآن فاقرأ بھا واسبقہ یعنی جب امام فاتحہ پڑھے تو تم بھی پڑھا کرو اور امام سے پہلے ہی ختم کر دیا کرو۔ جب وہ مقتدی کو پڑھنے کا حکم دیتے ہیں تو حنفیہ کا یہ معنی کرنا کہ جب اکیلے ہو پڑھا کرو۔ اس اثر مذکور کے خلاف ہے۔ (خیر الکلام صـ ۱۸۲)

سُبْحَانَ اللّٰہ! ایک ایسا بڑا دعویٰ کرنا کہ سورۃ فاتحہ مقتدی پر فرض ہے اور دلیل یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ کا فتویٰ اس بارہ میں امام بخاریؒ جزء القرأت میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن فتویٰ کی سند کا تذکرہ ہی نہ کیا۔

جنابِ من اگر اس فتویٰ میں کچھ جان ہوتی تو حضرت امام بخاریؒ صحیح بخاری میں اسے لاتے یا اشارہ ہی کر جاتے۔ خواہ مجہول ہی کے صیغہ سے ضعف کی طرف اشارہ کر جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جزء القرأت کے رسالہ میں تو امام بخاریؒ ہر طرح کی سقیم روایات بھی لے آتے ہیں۔ لہٰذا اس میں لے آنا صحت کی دلیل نہیں اس مذکور فتویٰ کی سند میں عن علاء عن ابیہ آیا ہوا ہے۔ علاء کئی ہیں۔ علاء بن الحارث، علاء بن زید، علاء بن عبدالرحمٰن باپ بیٹے دونوں کی تعیین کیجئے اور ان کے عدالت کے متعلق ائمہ حدیث کا بیان پیش

کیجئے اس کے بعد یہ فتوٰی قابلِ اعتبار ہوگا۔ امام کے ساتھ پڑھنے کو امام بخاریؒ بھی پسند نہیں کرتے وہ سکتات میں پڑھنا کہتے ہیں اور امام سے سبقت کرنا تو صحیح حدیث میں منع آیا ہے پھر حضرت ابوہریرہؓ کیسے اجازت دے سکتے ہیں؟ یہ کسی ضعیف راوی کی من گھڑت تجویز ہے۔ اگر علائ بن زید اس فتوٰی کا بیان کرنے والا ہے تو فتح القدیر ص ۶۵۴ ج ۱ میں اِتَّفَقُوْا عَلٰی ضُعْفِہٖ فرمایا ہے اور اگر علائ بن عبد الرحمٰن ہے تو اس کا حال احسن الکلام ص ۴۸، ۴۹ ج ۲ میں ملاحظہ کیجئے اور اگر علاء بن الحارث ہے تو محدثین کرامؒ اس میں بھی کلام کر رہے ہیں۔ ایسے گمنام شخص پر اعتماد کرکے ان کی صحیح حدیث جو امام نسائی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نقل کی اذا قرأ فانصتوا اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صحت کی شہادتِ صادقہ دی۔ اس کو چھوڑنا کیا قانونِ تحدیث کے ساتھ یہ غداری نہیں بنتی اور کیا امانت داری یہ سبق دیتی ہے؟

اس کے بعد ایک اور بات بھی جو اس کے مناسب ہی ہے اس کو بھی زیرِ نظر لائیں انشاء اللہ تعالیٰ مفید ہوگی۔ وہ یہ کہ ابوداؤد شریف ص ۱۴۸ اور بذل المجہود ص ۱۵۲ ج ۲ میں باب من قام من ثنتین ولم یتشہد میں ہے کہ کسی روز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے رباعی نماز میں درمیان کا جلسہ رہ گیا آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور واپس نہیں آئے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ ان کھڑے ہونے والے بعض حضرات نے فوت شدہ التحیات الخ کو کھڑے کھڑے پڑھ لیا وکان منا المتشہد فی قیامہٖ روایت میں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس تیسری رکعت کے قیام میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو صرف فاتحہ ہی پڑھی ہوگی اور بعض حضراتِ صحابہ کرامؓ نے اس کی بجائے التحیات پڑھی۔ پھر ان کی نماز کیسے ہوگئی؟ اس کے علاوہ یہ کہ تیسری رکعت میں آپ کے نزدیک فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے اگر حضراتِ صحابہ کرامؓ بھی فرض جانتے تھے تو ان کے ذہن میں یہ کیسے آیا کہ التحیات پڑھیں۔ فوت شدہ التحیات کا پڑھنا اہم ہے یا فاتحہ کا پڑھنا جو فریضہ وقت ہے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالی جگہ دیکھ کر انھوں نے التحیات کا پڑھنا بہتر سمجھا جیسے ان لوگوں کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فاتحہ کا پڑھنا امام کے پیچھے ضروری نہیں سمجھا۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کے طریقِ کار سے

Scanned by CamScanner

بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ دوسروں نے فاتحہ کی جگہ التحیات پڑھی اور حضرت ابوہریرہؓ نے فاتحہ کا نام تک ہی نہیں لیا۔ ہاں لا تسبقنی بامین سے آمین کا ذکر کر دیا۔ فاتحہ خلف الامام فرض کہنے والوں کو دونوں سوال حل کرنے ہوں گے۔ دونوں سوال لازمی ہیں، نمبر بھی برابر ہیں۔ ورنہ ہم یہی کہیں گے کہ غلط راستہ چھوڑ دو۔

حضرت ابوہریرہؓ کی مذکورہ روایت خداج والی میں ایک اور بات بھی تحقیق طلب ہے وہ یہ کہ خداج کا معنی خود حدیث میں غیر تمام کے کیا گیا ہے کہ جس نے فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز ناتمام مکمل ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ واجب ہے فرض نہیں۔ ورنہ یوں کہنا مناسب تھا۔ خداج باطل هالك۔ جب کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ فاتحہ کے بغیر نماز ہوتی ہی نہیں۔ فاتحہ کو فرض کہنے والوں سے عموماً اور غیر مقلدین کے مذہبی قائدین سے خصوصاً اس کی عقدہ کشائی بھی مطلوب ہے۔ مصنف خیر الکلام کا صـ۱۷۴ پر یہ کہنا کافی ہے کہ اگر بالفرض اس حدیث سے یہ ثابت بھی ہو جائے کہ فاتحہ کے بغیر نماز ناقص ہے۔ باطل نہیں تو حنفیہؒ کو اس میں کیا فائدہ ہے؟ حضراتِ حنفیہؒ کو یہ فائدہ ہے کہ اس سے حدودِ شرعیہ اور الفاظ شرعیہ کی حفاظت ہو گی کہ یہ حدیث تو فاتحہ کے بغیر نماز مخدج اور ناقص کہتی ہے گو فریضہ ادا ہو جاتا ہے اور تم لوگ اس کو باطل کالمعدوم اور ھالک کہتے ہو۔ فرقِ مراتب کو بھی سمجھنا چاہیئے۔ تم صاحبِ قاموس سے صلوٰتہ خداج ای ناقصہ نقل کرتے ہو۔ خیر الکلام صـ۱۷۵۔ اور اسی طرح اخدجت الناقہ ای جاء بولد ناقص وان کان ایامہ تامۃ نقل کرتے ہو اور اس کے ساتھ بیرونی پیوند اور پنکچر لگا کر بطلان ثابت کرتے ہو کہ اس جگہ نقصان سے ذاتی نقصان مراد ہے نہ کہ وصفی... الخ۔ اور لکھتے ہو کہ ظاہر ہے کہ اس وقت بچہ مردہ ہے یا بعد میں مر جاتا ہے۔ خیر الکلام صـ۱۷۵۔ مراد یہ ہے کہ اسی طرح وہ نماز بھی مردہ ہو گی، ہلاک ہو گی جس میں فاتحہ نہیں پڑھی گئی اور اس سے فرض ہونا ثابت کرتے ہو۔ اور یوں اس طرح سخن سازی کر کے تین چار صفحہ پر یہ حیلہ سازیاں کرتے ہو اور آپ کے بعد جب آپ کے شاگردِ رشید

Scanned by CamScanner

صاحب توضیح الکلام کی باری آتی ہے تو وہ اس موضوع پر بحث شروع کرتے وقت جلی عنوان قائم کرکے (یعنی خداج کو نقصان وصفی پر محمول کرنے کے دلائل کی حقیقت) قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں لیکن قارئین کو پوری بحث پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آئے گی کہ صاحب توضیح الکلام احناف کا رد کرنے کی بجائے اپنے اکابر مبارک پوری صاحبؒ جیسے حضرات کا بھی رد کر گئے ہیں اور قارئین کو اصل مقصد سے ہٹا کر اِدھر اُدھر کی ابحاث میں الجھا کر اپنے خصوصی مکر و فریب کا نمونہ دکھا گئے ہیں اور ایک دلیل بھی خداج کے نقصان ذاتی ہونے پر پیش نہیں کر سکے۔ ماشاء اللہ اتنی سمجھ تو رکھتے ہیں کہ جس بات کے لیے ان کے استاد محترم صاحب خیر الکلام کو بہت سے پاپڑ بیلنے پڑے لیکن پھر بھی وہ مقصد براری نہ کر سکے۔ اس بات کو پھر یہ کس طرح ثابت کر سکیں گے؟ اور یوں اس بات سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے قارئین کو علمی رُعب دکھانے کے لیے بغیر دلیل دینے کے آخر میں بہت دیدہ دلیری سے رقم طراز ہیں۔ الغرض خداج کے معنی نقصان ذاتی کے ہیں۔ سبحان اللہ! کیا ہی خوب غرض اور مدعیٰ ہے جو بغیر دلیل کے حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیئے اور بچشمِ غائر دیکھ کر یہ پڑھ لینا چاہیئے کہ ایسے شعبدوں سے احناف کے دلائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ البتہ ان کے اپنے معتقدین بے بصیرت تو ضرور خوش ہوتے ہوں گے اور داد دیتے ہوں گے جو کہ ان کا مقصود اصلی ہے۔

ادھر احنافؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شارع علیہ السّلام کی حدیثِ مبارک میں خداج بمعنی نقصان ہے اور نقصان بطلان کا غیر ہے جیسے حرام اور ہے اور مکروہ تحریمی اور ہے۔ ثانی میں شئی ہو جاتی ہے البتہ نقصان دار ہوتی ہے جیسے کسی کے ذمہ سجدہ سہو واجب تھا اس نے نہیں کیا تو نماز ناقص کہی جائے گی، باطل نہیں کہہ سکتے۔ ہاں اعادہ واجب ہوگا کہ نقصان شدید درجہ کا ہے۔ نماز میں سنّت کو ترک کرے گا تو اعادہ واجب نہیں ہوگا۔ فاتحہ بھی بزعمِ شما اگر مقتدی پر واجب ہے تو اس کے بغیر نماز ناقص ہوگی۔ واجب الاعادہ ہوگی۔ لیکن باطل محض۔ لیس بشئی اور کالعدم نہیں ہوگی۔ اس کو سزا تارک صلوٰۃ کی نہ دی جائیگی۔ ہاں ناقص ادائیگی پر مناسب حال سزا کا مستحق ہوگا۔ شریعتِ حقّہ میں سزا و جزا میں فرق

Scanned by CamScanner

مراتب کیے گئے ہیں۔ اندھے کی لاٹھی نہیں چلائی گئی۔ صاحب خیر الکلام فاضل جماعت کا خیر الکلام ص۱۷۵ پر یہ کہنا کہ بچہ مردہ ہے یا بعد میں مرجاتا ہے۔ یہ فاتحہ کو فرض بنانے کی حیلہ سازی کی گئی ہے لیکن نامکمل بات کہہ گئے ہیں آپ کی جماعت والے مقلد (مگر نام نہاد غیر مقلد) اگر اس میں مؤلف خیر الکلام وغیرہ کی تقلید کریں تو ان کی مرضی ہم تو اس کو مغالطہ ہی کہیں گے۔ آپ نے مخدج کے لیے موت لازمی بنادی تاکہ کام بن جائے لیکن اتنا تو لازمی ہے کہ آپ اہلِ حدیث بن کر بھی حدیث کو نہیں جانتے۔ عقلی باتیں کر رہے ہیں کہ نقصان ذاتی ہے بعض اجزاء ابھی فِٹ نہیں ہوئے تھے کہ بچہ باہر نکل آتا ہے مرجاتا ہے۔ جناب اجزاء پورے فِٹ ہوجائیں، پوری مدّت پر پیدائش ہو۔ لیکن قویٰ بدنیہ ناقص اور کمزور ہوں اس کو بھی خداج کہا جاتا ہے۔ دُور نہ جائیے مشکوٰۃ ص۳۱۲ کو اُٹھا کر دیکھئے: حدیث میں ہے رجل فی الحی مخدج سقیم فوجد علیٰ امتہٖ من امائھم یخبث بھا۔ الحدیث۔ یعنی ایک مخدج شخص کسی عورت سے بدکاری کرتے دیکھا گیا۔ اب آپ بتائیں کیا مُردہ مخدج نے یہ زناکاری کی تھی؟ یہ تو صحیح سلامت انسان تھا لیکن ناقص الخلقت تھا۔ ناتمام صحت والا تھا۔ الغرض اس کو ناقص الخلقت کہا جاتا ہے، مُردہ نہیں کہا جاتا اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ خداج جیسے بچے کی صفت ہے ناقۃ کی صفت بھی ہے۔ اخدجت الناقۃ کا محاورہ تو آپ نے دیکھا سُنا۔ تو کیا ناقہ بھی مردہ بن جاتی ہے یا بعد میں مرجاتی ہے۔ غلط راستے پر چلنے سے ٹھوکریں لگتی ہیں۔

صاحب خیر الکلام ص۱۷۴ پر لکھتے ہیں: پھر معلوم نہیں کہ یہ لوگ (حنفیہ) لفظ خداج کے پیچھے اس طرح کیوں پڑ گئے ہیں۔ ہمارے بیان سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ احناف آپ کی اس غلط چال کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔ اس حدیث میں آپ نے دو غلطیاں کی ہیں۔ پہلی یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں: اقراء بھا فی نفسک کا یہ معنی کیا۔ اور دوسری بات آپ کا فاتحہ کو فرض کہنا اور اس کے بغیر نماز کا باطل کہنا اور یہ باتیں اس حدیث کے مخالف ہیں۔ تفصیل گزر چکی ہے۔

اس حدیث کے بیان میں خاصا طول ہوگیا ہے لیکن العلم لا یحصل

براحۃ الجسم بزرگانِ دین اور محدثینِ کرامؒ کا فرمان ہے۔ مسلم شریف ص۲۲۳ میں ہے لایستطاع العلم براحۃ الجسم۔ یہاں تک دو دلیلیں قرآن کریم اور حدیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مذکور ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد تیسری دلیل آرہی ہے۔ ہاں ایک بات اور بھی قابل ذکر تھی کہ حضرت امام بخاریؒ نے فرمایا: لم یذکر سلیمان (التیمی) فی ھٰذہ الروایۃ سماعا من قتادۃ ولا قتادۃ من یونس۔ لیکن اس کا جواب مفصّل انشاء اللہ تعالیٰ محمد بن اسحٰق عن مکحول کی روایت کے بیان میں آئے گا۔

الدّلیل الثالث علیٰ منع القرأۃ خلف الامام المسمّیٰ بامامۃ القرآن

اس کا ضمنی طور سے کچھ تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ لیکن ادلہ کی جگہ میں مستقل لانا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ ھو المسک ما کررتہ یتضوع لعل اللہ یفتح بہ قلوبا غلفا واذانا صما۔ قرآن کریم پارہ ۲۶ میں سورۃ الاحقاف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمِنْ قَبْلِہٖ کِتٰبُ مُوْسٰٓی اِمَامًا وَّرَحْمَۃً ۔ اس کے بعد فرمایا: وَھٰذَا کِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ (الیٰ) وَبُشْرٰی لِلْمُحْسِنِیْنَ ۔ یعنی قرآن کریم سے پہلے اللہ تعالیٰ جلّ جلالہ وعم نوالہ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو کتاب (تورات) مرحمت فرمائی جو ان کے لیے امام اور رحمتِ خداوندی بنی اور اس کے بعد یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی بھیجی جو خوشخبری دینے والی ہے۔ صالحین اور بھلائی کمانے والوں کے لیے اس آیتِ کریمہ میں تورات کا توصیفی لقب امام اور رحمت الٰہیہ ہونا بتایا گیا ہے اور اجماعی عقیدہ ہے کہ نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمام حضرات انبیاء و مرسلین علیہم الصّلوٰت والتسلیمات سے افضل اور اعلیٰ شان والے ہیں ان کی امت سب اُمّتوں سے نرالی اور ان کی کتاب سب کتابوں سے اکمل وارفع ہے۔ اس لیے ان کو دی ہوئی کتاب بھی امام اور رحمتِ کاملہ کے لقب سے یاد کیے جانے کی مستحق ہے۔ بلکہ بعض احادیث میں تصریح مروی ہے کہ کسی موقع میں حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام جب بعض لوگوں کی ناموزوں باتوں پر ناراض

ہوئے اور مزید غصہ کے آثار چہرۂ انور پر محسوس ہوئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھٹنے ٹیک کر دوزانو بیٹھ کر آپؐ کے سامنے یہ کلمات رضینا باللہ ربّا وبالاسلام دینًا وبمحمّد رسُولًا دہرانے لگے۔ یہاں تک کہ آپؐ کا غصہ کم ہو گیا۔ بعض روایات میں چوتھا جملہ بھی آیا ہے وبالقرآن حکمًا و اماما۔ پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ کلمات سنے اور سکوت فرمایا اس سے قرآن کریم کا امام ہونا مرفوع اور تقریری حدیث سے ثابت ہو گیا۔ قرآن کریم کے اشارہ سے اور حضرت عمرؓ کے فرمان سے یہ لقب قرآن کے بارے میں حضرات سلف صالحینؒ نے بھی استعمال کیا۔ چنانچہ حضرت امام بخاریؒ نے صحیح بخاری ص ۷۳۹ ج ۲ میں حضرت حسن بصریؒ سے نقل کیا قال اکتب فی المصحف فی اوّل الامام بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم۔ اس جگہ حاشیہ میں اوّل الامام کا معنی اوّل القرآن ہی کیا ہے بلکہ اسی جگہ شارح قسطلانیؒ سے مزید نقل کیا ہے ای اوّل القرآن الذی ھو الفاتحۃ یعنی سورۃ الفاتحہ قرآن کریم کا ابتدائی حصّہ ہے۔ اس تمہیدی بیان سے دو فائدے حاصل ہوئے۔ اوّلاً تو ان جاہلوں کی تردید معلوم ہوئی جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ سورۃ الفاتحہ تو قرآن ہی نہیں اور یہ اس لیے کہتے ہیں کہ آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا۔ امام کے پیچھے اس کے فاتحہ پڑھنے کے وقت مقتدی کے فاتحہ خوانی کی ممانعت کرتی ہے تو انھوں نے یہ حیلہ سوچا کہ اس کے قرآن ہونے سے ہی انکار کر دیا جائے ایک متعصب اور جاہل نام نہاد اہل حدیث کہنے لگا کہ قرآن تو تیس پارے ہیں۔ اوّل پارہ الٓمٓ کو کہتے ہیں تو فاتحہ قرآن کی سورۃ ہی نہ ہوئی۔ اس کی تردید گزشتہ کی گئی ہے کہ یہ قول تو کفر کا کلمہ بن جاتا ہے جو اس کو قرآن نہ کہے۔ اس قول کی مزید تردید اسی حضرت علامہ قسطلانیؒ کے بیان سے معلوم ہوئی۔ اول القرآن الذی ھو الفاتحۃ۔ بخاری ص ۷۳۹ ج ۲ کو دیکھ لیں اور اپنے ایمان کی تصحیح کریں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کریم جب امام ہوا تو اس کی قرأت کا حق بھی امام ہی کو ہونا چاہیئے۔ آیت کریمہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا۔ میں یہی حکم بیان کیا گیا ہے کہ حق حقدار کو دو۔ مقتدی تو مأموم ہوتا ہے۔ مأموم کو امام بنا دینا حق تلفی نہیں تو اور کیا ہے؟ الی اقول مالی

Scanned by CamScanner

انازع القرآن ؟ کا مقصد بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پڑھنا امام کا حق ہے۔ دوسرے لوگ اسے کیوں اپناتے اور اس کا حق غصب کرتے ہیں۔ کلامِ الٰہی کا حق تقدم ہے نہ کہ تاخر۔ (راجع فیض الباری ص۱۹۰ ج۱)۔ دیکھئے قرآنِ کریم کا رکوع وسجود میں پڑھنا منع کیا گیا ہے جس کی بظاہر حکمت یہی ہے کہ یہ دونوں تذلل کی حالتیں ہیں۔ اور یہ قرآن کے علوِّشان کے خلاف ہے کہ اس کو ایسے حال میں پڑھا جائے یا رکھا جائے۔ اسی طرح خلفیت بھی تذلل کی نشان دہی کرتی ہے۔ دیکھئے قرآن کریم کو بلا کسی مجبوری کے پسِ پشت اگر کوئی پڑھتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ قرآن پڑھنا ہے تو آگے بیٹھ جاؤ ہمیں گناہ گار نہ بناؤ۔ ممکن ہے کہ غیر مقلدین حضرات اس کو توہین نہ سمجھتے ہوں۔ لیکن حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو اس پسِ پشت پڑھنے سے کوفتِ قلبی ہُوئی اور آپؐ نے لعلّکم تقرؤنَ خلف امامکم سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے اونچا نہ پڑھا تھا۔ ورنہ لعلّ سے کیوں ذکر کیا جاتا۔ وجہ انکار کی بظاہر خلفیت کو ہی سمجھا گیا۔ خداوندِ کریم سمجھ نصیب کرے۔ عمومات سے دھوکہ نہ کھائیں اور نہ دھوکہ دیں۔ قرآن کریم میں مقتدی کے بارے میں استماع اور انصات کا حکم آچکا ہے۔ صحیح حدیث میں انصتوا ثابت ہوچکا ہے۔ یہ قانونی شکل کے الفاظ ہیں مقتدی کے بارے الّا بفاتحۃ الکتاب فانہ لاصلوٰۃ اِلّا بھا کی استثنا صحیح نہیں ہے۔ عنقریب بیان آنے والا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

الحاصل امام کی قرأت کرتے ہوئے مقتدی کا اپنی قرأت کرنا استماعِ مأمور بہ میں خلل انداز بنتا ہے اور یہ انصات مأمور بہ کے خلاف ہے۔ پیچھے پڑھنا عظمت شانِ قرآن کے خلاف بنتا ہے۔ مأموم کو امام بنانا قلب موضوع ہے۔ انفرادی حالت میں یا امام بن کر پڑھنا ہی صحیح ہے۔ یہ کہنا کہ امام کا پڑھنا دوسرے کا پڑھنا کیسے بن گیا؟ یہ تو صحیح حدیث کے مخالف ہے اور دلیل یہ بیان کرنا کہ ثنا، تسبیحات اور التحیات بھی صرف امام پڑھے، تم خاموش رہا کرو، جہالت ہے۔ کیونکہ نہی تو قرأت قرآن سے بوقت قرأت قرآن ہے ہم نے تو ترک قرأۃ خلف الامام کے بارے میں قرآن کی آیت اور حدیث پیش کی ہے۔ زندہ دل کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے اور مردہ دلوں کے لیے اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی آیا

ہوا ہے کہ وہ سُنی اَن سُنی کر دیتے ہیں۔

الدّلیل الرّابع امامتُ حضرۃ جبرئیل علیہ السّلام

حضرت امام ترمذیؒ ترمذی شریف باب مواقیت الصّلوٰۃ ص۴۸ میں روایت لائے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امّنی جبریل عند البیت مرتین یعنی حضرت جبریل علیہ السّلام نے دو روز نماز کے اوقات بتانے کے لیے میری امامت کرائی۔ ایک دن اوّل اوّل وقت میں نماز پڑھائی اور دوسرے روز وقت کے آخر میں حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے ان دونوں دنوں میں مقتدی ہو کر نماز پڑھی۔ اب سوال یہ ہوگا کہ کیا آپؐ نے حضرت جبریل علیہ السّلام کی قرأت کے ساتھ ساتھ فاتحہ خوانی کی یا نہیں؟ احنافؒ تو فرمائیں گے کہ امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ آپ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے قرأت نہیں کی ہوگی۔ خاص کر جب کہ آپؐ کو حکم خداوندی فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ پہلے سے آچکا تھا جس کی تفسیر حضرت ابنِ عباسؓ نے استمع وانصت سے کی ہے اور بخاری شریف میں ہے کہ اس کے بعد آپ حضرت جبریل علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے پڑھنے کے وقت خاموش رہتے تھے۔ صرف سُنتے ہی تھے ہونٹ بھی نہ ہلاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اسی حکم کی تعمیل آپؐ نے حضرت جبریل علیہ السّلام کی امامت کے وقت بھی قرأت میں کی ہوگی۔ جو لوگ فاتحہ پڑھنے کے بغیر نماز نہ ہونے کے قائل ہیں ان کو ضروری ہوگا کہ ان دنوں کی نمازوں میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پڑھنا ثابت کریں۔ حنفیہ کی تو یہی دلیل ہے کہ نہیں پڑھی کیونکہ یہ استمع وانصت کا حکم اطلاق پر ہے خارج نماز کی تخصیص نہیں کی گئی۔ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ فرمایا ہے۔ من ادعیٰ خلافہ فعلیہ البیان۔ ہاں فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ کی تفسیر استمع وانصت جو حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کے مطابق یہ حکم دیا گیا ہے اگر آپؐ نے حضرت جبریل علیہ السّلام کے پیچھے قرأت کی تو فرمان فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ کی اس میں صریح خلاف ورزی پائی جاتی ہے۔ اس کا جواب بھی آپ دیں۔

Scanned by CamScanner

اور اس بات کو پیشِ نظر رکھیں کہ فَاِذَا قَرَأَ اَنْصِتُوْا فَاتَّبِعُ قُرْاٰنَہٗ میں نماز اور خارج نماز کا فرق نہیں کیا گیا۔

قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ جہری نمازوں میں حضرت جبریل علیہ السّلام نے جب وَلَا الضَّآلِّیْنَ پڑھا ہو گا تو موافق فرمانِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا اَمَّنَ الامام فَاَمِّنُوْا۔ آپ نے آمین بھی کہی ہو گی۔ کیونکہ یہ تو سکتہ میں پڑھی جاتی ہے اور دعا کے بعد آمین کہنے والے کو حکماً تالی اور قاری کہا جاتا ہے تو آپ کی نماز بدون فاتحہ نہ بنی دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے مخالفین کے متعلق یہ دعا پڑھی تھی رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰی اَمْوَالِھِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ۔ الآیۃ۔ اور حضرت ہارون علیہ السّلام نے اس پر آمین کہی۔ جیسے کہ حضرت حافظ ابنِ حجرؒ نے فتح الباری ص۱۷۱ ج۱ میں روایت نقل کی ہے کان موسیٰ داعیا وھارون مؤمنا۔ اس کے باوجود قرآن کریم نے دونوں کو داعی (دعا کنندہ) فرمایا۔ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا۔ اسی کو قرأۃ الامام قرأۃ للمأموم کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نماز میں جب مقتدی نے آمین کہہ دی تو حکماً وہ بھی تالی اور قاری بن گیا۔ اس کی نماز بلا فاتحہ نہ بنی۔

الحاصل جس طرح حضور علیہ السّلام نے حضرت جبریل علیہ السّلام کی قرأت کے وقت خاموشی اختیار کی۔ استماع وانصات پر عمل کیا اور آپؐ کی نماز ہو گئی تو اسی طرح مقتدی اور امام کا مسئلہ بھی بن جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خاموش رہنے اور سننے کی دلیل تو ہم نے بیان کر دی کہ حکم فَاِذَا قَرَأَ اَنْصِتُوْا فَاتَّبِعُ قُرْاٰنَہٗ کا خارج نماز کے ساتھ مخصوص نہیں کیا گیا۔ ہم مدعیانِ فرضیت فاتحہ خلف الامام سے سوال کرتے ہیں کہ ان نمازوں میں جو دو دن حضرت جبریل علیہ السّلام کے پیچھے آپؐ نے پڑھیں۔ ان میں فاتحہ پڑھنے کا ثبوت کسی صحیح اور صریح دلیل سے پیش کریں۔

علامہ ابنِ کثیرؒ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السّلام کی دعا اور آمین کے بارے میں فرماتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر ص۳۲ ج۲: فدلّ علی ان من اَمّن علیٰ دعاء فکانما قالہ یعنی جس نے آمین کہہ دی گویا اس نے خود دعا پڑھ دی۔ ولھٰذا قال من قال ان

المأموم لایقرأ لان تأمینہ علیٰ قرأۃ الامام الفاتحۃ قرأتھا یعنی جس نے کہا کہ مقتدی قرأت فاتحہ کی نہ کرے۔ اس نے اسی بنا پر کہا کہ مقتدی کا آمین کہہ دینا گویا فاتحہ کا پڑھنا ہی ہے۔

الخامس من الادلۃ امامۃ ابی بکرن الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سرکار دوجہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مرض وفات کے دنوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امامت کے مأمور تھے اور امامت کراتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس حکم کو ایک مصلحت سے ٹالنا بھی چاہا کہ بجائے ابوبکرؓ کے حضرت عمرؓ کو فرمادیں کہ وہ فریضۂ امامت ادا کیا کریں لیکن آپؐ نے سابق حکم کو تبدیل نہ کیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تقرر کسی خاص مصلحت سے تھا۔ ورنہ آپؐ کی جگہ تو نماز پڑھانے والے سب ہی لائق اور فائق تھے خصوصاً قریبی رشتہ دار حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ بھی موجود تھے۔ لیکن ان کو آپؐ نے اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے مقرر نہ کیا اور نہ مبہم انداز میں فرمایا کہ میں مسجد کو نہیں جاسکتا کوئی اور شخص نماز پڑھا دیا کرے بلکہ اس کام کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو مخصوص کر دیا۔ شاید یہ خیال فرمایا ہو کہ ان کی امامت سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ان کی خلافتِ کبریٰ یا امامتِ کبریٰ کا سبق سیکھ لیں اور یہی آپؐ چاہتے تھے اور یہی حضرات صحابہ کرامؓ نے کیا چنانچہ بعض نے صریحاً یہ فرما بھی دیا کہ دین کا معاملہ دُنیا سے فائق اور اہم ہے جب دین کا امام حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنایا گیا ہے تو خلافتِ دُنیوی کا حق بھی انہی کو دیا جائے۔ اسی وجہ سے بلا مقابلہ ان کا انتخاب ہوگیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک

اسی اشارہ اور دلالت پر اعتماد کرتے ہوئے شاید آپؐ نے واللہ تعالیٰ اعلم قرطاسِ خلافت نہیں لکھا۔ بعض لوگوں نے کچھ اصرار بھی کیا لیکن آپؐ نے ضرورت نہ سمجھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یقیناً سمجھ گئے تھے کہ پڑھایا ہوا سبق انتخابِ خلافت کے لیے کافی ہے آپؐ نے حضرات صحابہ کرامؓ کی دانش پر اعتماد کیا کہ غلطی نہیں کریں گے۔ چنانچہ بخاری

Scanned by CamScanner

صـ ۹۳ ج ۱ کے حاشیہ پر ہے۔ وکانت فی ھذہ الامامۃ دلالۃ علی الامامۃ الکبریٰ۔ اس بیان سے جیسے شیعہ کی غباوت اور جہالت معلوم ہوئی اسی طرح غیر مقلدین حضرات کا علمی قصور بھی معلوم ہوا کہ وہ قیاس کے منکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہر دینی مسئلہ حدیث میں منصوص ہونا ضروری ہے۔ قیاس کوئی چیز نہیں۔ حضرات محدثین کرامؒ اور محققین عظامؒ نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے موجودہ تصویر میں قیاس ہی کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب دین کا امام حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنایا ہے تو اسی قیاس پر دنیوی نظام کی باگ ڈور بھی انہی کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے یہی قیاس ہے جس پر اجماع ہوا۔ ورنہ نص صریح حدیث میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی استحقاق خلافت پر بتائیں۔ یہ باتیں مختصر انداز سے ضمنی طور پر مذکور ہوئیں آگے اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں:

اس مرضِ وفات کے زمانہ میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بقول حافظ ابن حجرؒ ظہر کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔ فتح الباری صـ ۱۱۹ ج ۲ اور جماعت سے نماز ادا کی اور بیماری کے دنوں میں آپؐ نے صرف یہی ایک نماز پڑھائی۔ حضرت شیخ استاذنا مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک عشاء کی نماز میں بھی شریک جماعت ہوئے۔ ظہر کی نماز کی حاضری تو بخاری شریف میں تصریحاً مروی ہے اور عشاء کی حاضری ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتی ہے اور اقرب بھی یہی ہے۔ کیونکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جانا اس وقت ہوا جب حضرت ابوبکرؓ کچھ قرأت کر چکے تھے۔ کم از کم فاتحہ کا کچھ حصہ تو پڑھ چکے ہوں گے اور بعض روایات میں تصریح ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ فاتحہ کے بعد سورۃ پڑھ رہے تھے اس وقت آپ پہنچے۔ اوّل حصہ حضرت ابوبکرؓ نے پڑھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہنچنے کے بعد مابقی کو آپؐ نے تمام کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیماری کے ضعف کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور لوگ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے رہے۔ ایک روایت میں راوی فرماتے ہیں: ابتداء من حیث انتھیٰ الیہ ابوبکرؓ اور دوسری میں ہے:

Scanned by CamScanner

من حیث انتھیٰ الیہ من السّورۃ (مسندِ احمد ص ۲۰۹/۱ج) ۔ اوّل روایت میں اگرچہ فاتحہ کا نام نہیں لیا گیا ۔ لیکن بیان کچھ قرأت پر دال ہے ۔ اوّل صورت میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فاتحہ کا بعض حصّہ چھوٹا اور دوسری صُورت میں پوری فاتحہ رہ گئی ۔ اس سے معلوم ہُوا کہ بلا فاتحہ پڑھے ہوئے بھی (کُل یا بعض) آپؐ کی نماز ہوگئی اوّل حصّہ میں امام حضرت ابوبکرؓ تھے ان کے پیچھے تکبیر کہہ کر ان کی نماز میں شمولیت ہو گئی ۔ ہاں اس کے بعد آگے سے خود امامت کے فرائض ادا کیے اور نماز تمام کی ، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکبّر کی حیثیّت سے لوگوں کو تکبیرات سُناتے رہے اس مقام میں بعض باتیں قابلِ توجّہ ہیں ۔ عرض کرتا ہوں :

سوال نمبر ۱ : اگر ظہر کی نماز کا واقعہ ہو تو ظہر میں جب خفیہ قرأت ہوتی ہے تو آپؐ کو کیسے پتہ چلا کہ قرأت کہاں تک ہو چکی ہے جس کی وجہ سے کہا گیا کہ جہاں تک ابوبکرؓ پڑھ چکے تھے ، اس مقام سے آپ نے قرأت شروع کی ؟

الجواب : حضرت حافظ ابنِ حجرؒ نے یہ جواب دیا کہ قرأت اگرچہ خفیہ تھی لیکن ہمس کے درجہ کی قرأت سے پاس والا سُن لیتا ہے جیسے ایک شخص نے ظہر کی نماز آپؐ کے پیچھے پڑھی تو سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی پڑھ دیا ۔ اس کے پاس والا شخص کہتا ہے : جاء فقرأ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی ۔ اور ممکن ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیت یا اس کا کچھ حصّہ جہر سے پڑھ لیا ہو تاکہ آپؐ کو پتہ چل جائے اور اس سے آگے قرأت فرمائیں اور یہ جائز ہے ۔ جیسے آیا ہے یُسْمِعُنَا الْاٰیۃ احیانا ۔ کہ آپؐ کبھی سری نمازوں میں بھی کوئی آیت اونچی آواز سے پڑھ لیتے تھے اور اگر واقعہ کسی جہری نماز کا ہو جیسے ابھی عشأ کی نماز میں جانے کا قول گزر چکا ہے تو اشکال پیدا ہی نہیں ہوتا ۔

سوال نمبر ۲ : عارضی امام نماز پڑھا رہا ہو ، پھر اصل امام آجائے تو نائب امام کی امامت بہر حال رکھی جاتی ہے ۔ نماز اسی پر تمام کی جاتی ہے ۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے کیوں ایسا نہ کیا ؟ آپؓ پیچھے کیوں ہٹ گئے ؟

الجواب: بعض لوگوں نے تخصیص کا دعویٰ کیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موجودگی میں دوسرے کسی کو حق نہیں کہ وہ امامت کرائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ما کان لابن ابی قحافۃ ان یتقدم بین یدی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (بخاری ص۹۴ ج۱) فرمان کا یہی مطلب لیا گیا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ کارروائی ایک ضابطہ کے ماتحت ہوئی وہ یہ کہ اگر امام کو کوئی عارضہ پیش آجائے کہ وہ نماز تمام نہ کرسکتا ہو تو اس کو اجازت ہے کہ کسی اور کو اپنی جگہ کھڑا کردے تاکہ لوگوں کی نماز تمام ہوجائے۔ جیسے سبقِ حدث کی صورت میں ہوتا ہے۔ یا جیسے حضرت عمرؓ کو صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے ابولؤلؤ فیروز مجوسی نے خنجر مارا اور آپؓ زخمی ہوگئے تو آپ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو اپنی جگہ کھڑا کردیا اور انھوں نے نماز پوری کرائی۔ موجودہ صورت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عارضہ الحصر عن القرأۃ کا پیش آیا۔ یعنی دل میں حضور علیہ السلام کی اس معذوری کی حالت میں آمد پر اتنا قلبی صدمہ پیش آیا کہ زبان سے قرأت نہ ہوسکتی تھی۔ مزید ہیبت کی وجہ سے بھی ایسی حالت بن جاتی ہے۔ بخاری ص۹۹ میں ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ان یقم مقامک یبک فلا یقدر علی القرأۃ فقال مروا ابابکرؓ فلیصل۔ الحدیث۔ اور دوسری روایت میں ہے۔ اذا قام فی مقامک لم یسمع الناس من البکاء۔ بخاری ص۹۹ ج۱۔ اسی کو الحصر عن القرأۃ کہتے ہیں۔ اسی عارضہ کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹ گئے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آگے بڑھ گئے تاکہ نماز مکمل کی جائے۔ ابنِ ماجہ ص۸۸ کی روایت میں ہے اخذ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من القرأۃ من حیث کان بلغ ابوبکرؓ قال وکیع وکذا السنۃ۔ انھوں نے اسی ضابطہ کو واضح کیا کہ سنت یہی ہے کہ امام کو اگر ایسا عارضہ پیش آجائے تو ایسا ہی کرنا چاہیے۔

۳: ابھی بیان ہوچکا ہے کہ ابنِ ماجہ ص۸۸ کی حدیث میں ہے واخذ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من القرأۃ من حیث کان بلغ ابوبکرؓ اور حضرت حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں اسنادہ حسن۔ (فتح الباری ص۳۱۵ ج۲) باب انما

جعل الامام لیؤتم بہ اور طحاوی شریف میں فاستتم مروی ہے یعنی آگے سے قرأت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل فرمائی۔ اس میں محل قرأت کا بیان نہیں۔ مجمل انداز میں ہے کہ جہاں تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھ چکے تھے۔ وہاں سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرأت شروع کی۔ ہوسکتا ہے کہ فاتحہ کا کچھ حصہ پڑھا ہو۔ لیکن مسند احمد ص ۲۰۹ ج ۱ کی روایت میں محل کا بیان ہے فقرأ من المکان الذی بلغ الیہ ابوبکرؓ من السورۃ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاتحہ کے بعد سورۃ پڑھتے وقت پہنچے تھے۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ص ۲۰۱ ج ۱ مبہم اور مفسر کا قانون بیان فرمایا ہے: الزیادۃ مقبولۃ والمفسر یقضی علی المبہم اذا رواہ اھل الثبت یعنی مبہم سے مفسر راجح ہوگا۔ اس قاعدہ کے مطابق آپ سے پوری فاتحہ چھوٹ گئی اور ظاہر بھی یہی ہے کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز اس وقت شروع کی ہوگی جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مسجد میں تشریف آوری سے ناامیدی ہوگئی ہوگی۔ پھر فاتحہ پڑھنے میں اتنی دیر نہیں لگتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد بھی ضعف کی بنا پر آہستگی سے ہوئی ہوگی۔ تیز رفتاری سے تو آنہیں سکتے تھے کہ فوراً پہنچ گئے ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ پڑھنے کے زمانہ میں ہی پہنچے ہوں گے کُل فاتحہ پڑھی گئی ہوگی۔ بہرحال فاتحہ کُل یا بعض آپؐ سے چھوٹی مگر آپؐ کی نماز صحیح ہوگئی اور یہی آپؐ کی مسجد میں باجماعت آخری نماز تھی اب فاتحہ کے پڑھنے کے بغیر نماز نہ ہونے والوں کو اس کی جواب دہی کرنا ہوگی۔

۴: یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت ان دنوں میں از خود نہ ہوئی اور نہ ہی حضرات صحابہ کرامؓ کے عمل اور مشورے سے ہوئی، بلکہ یہ بحکم جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہوئی مروا ابابکر فلیصل بالناس (بخاری ص ۹۹) بلکہ آپؐ جب مسجد میں پہنچے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب پیچھے ہونے لگے تو آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ جگہ پر رہو پیچھے نہ ہٹو۔ فلما راٰہ ابوبکرؓ ذھب یتأخر فاشار الیہ ان صلّ۔ (بخاری ص ۹۹ ج ۱) لیکن حضرت ابوبکرؓ

نے آپؐ کی موجودگی میں منصبِ امامت پر رضا برداشت نہ کی تو کچھ پیچھے سرک گئے ان کا یہ عمل ادبًا ہی تھا۔ پھر نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے قرأت وہاں سے شروع کی جہاں تک قرأت ہو چکی تھی اور نماز تمام کی اگر یہ عشاء کی نماز کا واقعہ ہو جیسے بعض ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا تو کوئی اشکال نہیں۔ ہاں اگر ظہر کی نماز میں ایسا ہوا جب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کچھ الفاظ اس انداز کے پڑھے ہوں کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سُن لیے ہوں۔ پھر اس کے مابعد سے قرأت شروع کر دی ہو آپؐ کی قرأت کے الفاظ بھی سُننے میں آئے کیونکہ راوی حدیث بعد سے قرأت کرنا کہتا ہے اور یہ جبھی ہی ہو سکتا ہے کہ اس نے کچھ الفاظ سُنے ہوں جیسے کسی نے آپ کے پیچھے ظہر کی نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى پڑھا اور ساتھ والوں نے سُن لیا۔ بیان گزر چکا ہے۔ اسی انداز میں واخذ من القرأۃ من حیث کان بلغ ابوبکرؓ راوی بیان کر رہا ہے۔

مقامِ عبرت و حسرت

جماعتِ اہلِ حدیث کے فاضل مصنف خیر الکلام نے اس جگہ ایسی باتیں کی ہیں جیسے شیعی مزاج دشمنانِ صحابہؓ کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے جب فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں اس سے رکاوٹ محسوس کی تو یہ فرما گئے کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام جب مسجد میں گئے اور دیکھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جماعت کرا رہے ہیں تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انکی جماعت میں داخل ہونے کی بجائے اس کو کالعدم قرار دے کر از خود ہی نئی نماز کی تکبیر کہی اور نماز پڑھی۔ خیر الکلام صـ۴۶۱ میں لکھتے ہیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے آکر سابق امامت کالعدم قرار دیتے ہوئے نئی امامت سے نماز کی ابتدار کی ہو تو اس صورت میں خلیفہ بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سبحان اللہ! کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آپؐ ناراض تھے کہ ان کی جماعت و امامت کو کالعدم قرار دے کر نئی نماز کی نیّت کی۔ جب کہ آپؐ نے خود ہی مروا ابابکر فلیصل بالنّاس کا حکم دیا تھا۔ یہی شیعہ لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ دوسری جگہ صـ۴۶۱ میں لکھتے ہیں: یہ کیسے معلوم ہُوا کہ آپ ابتدأ میں

امام بن کر شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ مقتدی بن کر شامل ہوئے تھے۔ پھر امام بن گئے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ پہلے ہی امام بن کر نماز میں داخل ہوئے ہوں۔ سبحان اللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ مشہور ہے حبك الشئ یعمی ویصم کہ کسی چیز کی محبت کبھی اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ نظامِ عالم بگڑ جائے تو اس کی پرواہ نہیں، مگر انھوں نے اپنی ضد نہیں چھوڑنی۔ فاتحہ خلف الامام پڑھنے پڑھانے کے ذوق وشوق نے انھیں عقل کی راہنمائی سے محروم کر دیا ہے معمولی سوجھ بوجھ والا انسان بھی ایسی بات نہیں کہتا جو یہ مدعیان علم وفہم کہہ رہے ہیں۔ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ۔ فرمانِ خداوندی ہے۔ سُنئے کیوں جناب اگر حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی امامت کو کالعدم قرار دے دیا تھا اور آپ ابتداً ہی سے امام بن کر نماز پڑھانے کی نیّت سے تشریف لائے تھے جیسے آپ کا فرمان ہے (ہوسکتا ہے کہ آپ پہلے ہی امام بن کر نماز میں داخل ہوئے ہوں)۔ تو:

پہلی بات یہ ہے کہ آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچتے ہی ان کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ فرماتے۔ حالانکہ بخاری ص۹۹ ج۱ کی حدیث میں تو یہ گزرا فاشار الیہ ان صلّ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے اپنے امام ہونے اور امام بننے کا خیال ہی نہیں کیا تھا کیا معاذ اللہ تعالیٰ آپؐ نے تقیہ کر کے کہا کچھ اور دل میں اور کچھ رکھ رکھا تھا؟ ان صلِّ کا مطلب تو یہ ہے کہ نماز اسی طرح اور اپنی جگہ پر پڑھاتے رہو۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ابتداءً امامت کا ارادہ نہیں کر رکھا تھا ورنہ اشارہ فرماتے کہ پیچھے ہو جاؤ اب میں نماز پڑھاؤں گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اشارہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ آتے ہی سابقہ نماز کی نیّت کر چکے تھے۔ اس لیے زبان سے کلام نہیں کیا۔ صرف اشارہ کر دیا۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ امامت جب بحکم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہوئی، تو آپ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی رضامندی پائی گئی جب امامت بحکمِ رسول وبرضائے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے تو اس صحیح عمل کو کالعدم

کیسے بنایا جاسکتا ہے ؟ یہ کا روائی مؤلف خیر الکلام کی طرف سے صرف اس لیے کی گئی ہے کہ اس سے خلف الامام فاتحہ خوانوں کا راستہ بند ہو گیا ہے کہ اس نماز میں فاتحہ خلف الامام نہیں پڑھی گئی مگر بایں ہمہ نماز ہو گئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا راستہ ہی غلط ہے۔ غلط راستے پر چلنے والوں کو ٹھوکریں لگا ہی کرتی ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ آپ خیر الکلام ص۴۶۱ میں لکھتے ہیں۔ یہ کیسے معلوم ہوا کہ آپ ابتدا میں امام بن کر شامل نہیں ہوئے بلکہ پہلے مقتدی بن کر شامل ہوئے پھر امام بن گئے ... الخ۔ ہم نے تو قرینہ بتا دیا ہے کہ اشارہ سے بتانا قرینہ ہے کہ آپ پہلی نماز میں شامل ہو چکے تھے۔ آپ بتائیں کہ پہلی پڑھی ہوئی نماز کو کالعدم بنانا آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟ اور آپ کا ابتدا سے امام بننا آپ کو کیسے معلوم ہوا ؟ دلیل صحیح اور صریح ہو۔ ہو سکتا ہے کے لفظ سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ یہ انداز اختیار کرنا جس سے حضرت ابوبکرؓ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی صحیح اور درست نماز کو کالعدم قرار دیا جائے، دماغی خرابی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ من ذٰلک۔

پانچویں بات بھی سُنتے جائیے جو اس سے بھی مزے کی ہے کہ مصنف خیر الکلام فاضل اہل حدیث ص۴۶۰، ۴۶۱ میں لکھتے ہیں "آپؐ نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی"۔ اس پر کوئی دلیل نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے فاتحہ کا متروک حصّہ یا ساری فاتحہ پڑھ کر وہاں سے قرأت شروع کی ہو۔ آپؐ نے آہستہ پڑھی تھی اس لیے راوی نے ذکر نہیں کیا۔ جناب ! اس پڑھنے پر دلیل پیش کرنی ہوگی۔ یہ بات ظاہر کے بالکل خلاف ہے فریضہ کے ثابت کرنے کے لیے محض احتمال کافی نہیں ہوتا۔ صراحت درکار ہے اور یہ احتمال حدیث کے الفاظ واخذ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من القرأۃ من حیث بلغ ابوبکرؓ کے خلاف ہے۔ اس کے بعد ص۴۶۱ پر لکھتے ہیں: یا راوی کا مطلب قرأت سے جہراً پڑھنا مُراد ہے۔ یعنی آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے الفاظ مصنف مذکور نے دونوں جگہ نہیں لکھے) نے جہراً وہاں سے قرأت شروع کی جہاں ابوبکرؓ پہنچے تھے۔ اس سے آہستہ پڑھنے کی نفی نہیں ہوتی۔ غور کیجئے کہ

Scanned by CamScanner

خیر الکلام ص۴۵۴ میں خود مصنف نے حدیث کے الفاظ یہ لکھے ہیں: اخذ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من القرأۃ من حیث کان بلغ ابوبکرؓ دوسری روایت یوں نقل کی فقرأ من المکان الذی بلغ ابوبکرؓ من السورۃ۔ ان میں آپؐ کا نفس قرأت کرنا مذکور ہے اور فاضل اس کے مجازی معنی لیتے ہیں یعنی قرأت سے جہراً پڑھنا مراد ہے۔ علمأ معانی فرماتے ہیں کہ مجاز لینے کے لیے قرینہ صارفہ ضروری ہوتا ہے۔ بلاقرینہ مجاز بنانا غلط ہے۔ فلا بد من القرینۃ۔ کیونکہ علماء عربیّت کا مشہور مقولہ ہے المجاز قنطرۃ الحقیقۃ۔ جب سڑک سیدھی ہو تو اس پر پُل بنانا نادانوں کا کام ہے۔ آپ بتائیں کہ اس جگہ کون سا قرینہ جہر کا ہے۔ صرف یہ کہ یہ دلیل آپ کے خلاف بن رہی ہے؟ یہ تو کوئی قرینہ نہیں۔ شاید کہ علم معانی بیان و بدیع کا نام ہی اکثر فضلأ اہلِ حدیث نے نہ سُنا ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ کہ صاحب خیر الکلام ص۴۵۹ میں کہہ چکے ہیں۔ (اب صرف ظہر کی نماز رہ جاتی ہے)۔ (ایک دن تخفیف ہوئی تو ظہر کے لیے نکلے) اس بیان سے عشأ کی نماز کے لیے آپؐ کے مسجد جانے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس لیے صرف ظہر کے لیے جانا ہی کہتے ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ گزشتہ فاضل صاحب خیر الکلام کا کلام نقل ہو چکا ہے کہ انھوں نے فرمایا (قرأت سے جہراً پڑھنا مراد ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہراً وہاں سے قرأت شروع کی جہاں ابوبکرؓ پہنچے تھے۔ کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ظہر کی نماز میں جہراً قرأت کی تھی؟ حضرت ابوبکرؓ نے تو ضرور قرأت مخفی کی ہوگی کیونکہ نماز ظہر کی تھی۔ کیا پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وہاں سے جہراً قرأت شروع کر دی تھی؟ آپ لوگوں نے تو دن کو رات بنا دیا ہے۔ (سبحان اللہ) معلوم ہوا کہ خیر الکلام کے بورڈ والی دکان میں کھوٹا سامان بھرا ہُوا ہے۔ جو چاہے اسے آنکھیں بند کر کے خرید لے۔ ہم نے النصح لکل مسلم کی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے خبرداری کر دی ہے۔ وما علینا الاّ البلاغ۔ وللہ الحمد والمنّۃ۔

Scanned by CamScanner

عُذرِ گناہ بدتر از گناہ

گزشتہ ذکر ہو چکا کہ مصنّف خیر الکلام فاضل جماعتِ اہلِ حدیث نے کہا کہ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم مرضِ موت کے دنوں میں جب مسجد تشریف لے گئے اور دیکھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نماز پڑھا رہے ہیں تو آپ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ان کی نماز میں داخل نہیں ہوئے بلکہ اس کو کالعدم قرار دے کر اپنا تحریمہ جداگانہ کر کے امامت کی نیّت سے نماز میں داخل ہوئے اور یہ اس لیے کیا کہ وہ سورۃ فاتحہ اور کچھ مزید پڑھ چکے تھے۔ ان کی نماز میں داخل ہوتے تو فاتحہ کے سوا آپ کی نماز نہ ہوتی۔ اس لیے اس کو کالعدم قرار دے دیا۔ اور مستقل نماز کی افتتاح کی۔ یہ حدیث کے الفاظ فَقَرَأَ مِنْ حَيْثُ بَلَغَ اَبُوْبَكْرٍ رضہ کا معنی یہ کیا۔ (نماز پڑھی آپؐ نے ابوبکرؓ کی قرأت کے بعد)۔ خیر الکلام ص۳۵۶ میں ہے: حدیث میں جو قرأت کا لفظ آیا ہے اس سے مراد نماز ہوگی۔ مطلب یہ ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز وہیں سے شروع کی۔ (سبحان اللہ)

سُنیے! یہ معنی کئی وجوہ سے باطل اور مردود ہے۔ اوّل یہ کہ یہ معنی مجازی ہیں۔ ذکر جزء اور مراد کل مجاز کے اقسام سے ہے اور مجاز سوائے مجبوری کے بلا قرینہ صارفہ نہیں لیا جاتا جیسے رَأَيْتُ اَسَدًا يَرْمِيْ۔ یہ یرمی قرینہ ہے کہ مراد رَجُلٌ شُجَاع ہے۔ ایک جگہ مصنف خیر الکلام نے ص۴۶۶ پر خود لکھا: بدون قرینہ ایک لفظ کا اصلی معنی چھوڑ کر مجازی معنیٰ مراد لینا درست نہیں ہوتا۔ ولہٰذا بتائیں کہ یہاں کس قرینہ سے مجازی معنی آپ نے لیا ہے۔ اسی طرح ان کا یہ معنی کرنا کہ جہرًا قرأت کرنا وہاں سے کیا جہاں ابوبکر صدیق رضؓ پہنچ چکے تھے۔ (پہلے بھی اس کا تذکرہ گزر چکا ہے) یہ دونوں معنی مصنف خیر الکلام کی من مانی کہانی ہے جو خلافِ قاعدہ ہے اور مردُود ہے۔

دوم[۲] وجہ غلطی کی یہ ہے کہ اگر آپؐ کی نیّت نئے سرے سے نماز پڑھنے کی تھی اور سابق کالعدم قرار دی گئی تھی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی جگہ نماز پڑھتے رہنے اور پیچھے نہ ہٹنے کا اشارہ آپؐ نے کیوں کیا؟ بخاری شریف ص۹۹ میں ہے: فلمّا رأہ

Scanned by CamScanner

ابوبکر ذھب یتأخر۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے۔ فاشار الیہ ان صلّ یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو اشارہ کیا کہ نماز پڑھتے رہو۔ پیچھے مت ہٹو اور بخاری شریف ص۹۴ میں ہے فاشار الیہ ان کما انت۔ حاشیہ میں معنیٰ یہ کیا ہے: ای الزم الذی انت علیہ وھو الامامۃ۔ یعنی اے ابوبکرؓ اپنی امامت پر قائم رہو۔ اسی طرح نماز پڑھتے پڑھاتے جاؤ۔ پیچھے نہ ہٹو۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس امامت کو برحال رکھا اور اپنی امامت کا ارادہ نہ تھا۔ بصورت اقتدا ان کے پیچھے پڑھنا یہی ارادہ تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز اور امامت کو کالعدم نہیں قرار دیا گیا ہاں انھوں نے بوجہ ہیبت اور شدّۃِ غم کے آئندہ قرأت کرنے کی قدرت نہ پائی۔ اس لیے وہ پیچھے ہو گئے تاکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز تمام کرادیں۔ اس کو حصر عن القراۃ کہا جاتا ہے۔ اسی کو حاشیہ بخاری ص۹۵ میں اختیار کیا۔ یَجُوْزُ اَنْ یَّسْتَخْلِفَ اِذَا حُصِرَ عَنِ الْقِرَأَۃِ لِحَدِیْثِ اَبِیْ بَکْرٍؓ کَمَا اَحَسَّ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حُصِرَ عَنِ الْقِرَأَۃِ فَتَاَخَّرَ وَتَقَدَّمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَتَمَّ۔ یعنی امام کو حصر عن القراۃ یعنی بندش ہو تو دوسرے کو اپنی جگہ خلیفہ بنا سکتا ہے جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خود پیچھے ہٹے تھے۔ ہٹائے نہیں گئے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہی کی پڑھائی ہوئی نماز کو تمام کیا اور تا آخر پہنچایا

اس مقام میں مصنف خیر الکلام ترجمان جماعتِ اہلِ حدیث کا یہ کہنا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے گزشتہ نماز کو کالعدم کر کے از خود نئے سرے سے نماز پڑھائی۔ افسوس ناک غلط بیانی ہے۔ یہ ایک طرح شیعی آواز کی تصدیق ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب مسجد پہنچے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معزول کر دیا اور پیچھے ہٹا دیا۔ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) ہٹاتے تو جب کہ ان کی امامت ان دنوں میں خلافِ حکمِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہوتی۔

Scanned by CamScanner

حضرات اہل سُنّت وجماعت کا قول تو یہ ہے جو بخاری ص۹۳ کے حاشیہ میں فرمایا۔ کَانَتْ فِیْ هٰذِهِ الْاِمَامَةِ دِلَالَةٌ عَلَی الْاِمَامَةِ الْکُبْرٰی۔ ان دنوں (مرض الموت) میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امام بنانے میں آپؐ کا اشارہ خلافت کی طرف تھا، کہ میرے بعد میرا جانشین حضرت ابوبکر ہی ہوگا۔ (رضی اللہ عنہ)۔ اسی لیے کسی اور کو ان دنوں کی نمازوں کا امام نہیں بنایا اور نہ منظور کیا۔ بعض ازواجِ مطہراتؓ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام بھی لیا کہ انہیں فرمادیں کہ وہ نماز پڑھادیں۔ آپؐ نے فرمایا تم مجھے بہکاتی ہو۔ (محصلم) اگر صرف نماز پڑھانا مقصود ہوتا تو سب ہی حضرات صحابہ کرامؓ لائق فائق تھے۔ آپؐ فرمادیتے کہ میں مسجد میں نہیں جاسکتا کسی اور کو کہو کہ نماز پڑھادے۔

الحاصل جیسے شیعہ لوگوں کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معزول کرنا غلط بیانی اور خبثِ نفس کی نشانی ہے اسی طرح مصنف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ سابق نماز کو جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پڑھائی اس کو کالعدم قرار دے کر آپؐ نے اپنی نماز کی ابتدا کی اور ابتدا سے نماز پڑھائی۔ یہ بات بھی خلاف واقع محض غلط افسانہ اور جھوٹ ہے۔ ان کی قوم اگر اس بات کو مانتی ہے تو ان کی مرضی ہم تو اس بات پر لاحول ہی پڑھتے ہیں۔ یہ صرف فاتحہ خلف الامام پڑھنے کی ضرورت سے گھڑی گئی ہے اور روافض کی پیروی کی ہے اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ کے فرمان کے مطابق ہم تو کہتے ہیں کہ پھل کڑوا ہے تو درخت بھی اسی طرح کا ہوگا۔ غلط راستہ پر چلنے سے ٹھوکریں لگا ہی کرتی ہیں۔

فائدہ : بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بائیں جانب بیٹھنا اسی لیے تھا کہ امام بن کر نماز پڑھائیں گے ہمارے خیال میں یہ ناتمام بات ہے۔ یہ بیٹھنا اتفاقی طور پر ہوا کہ اس میں سہولت تھی۔ اتفاق سے یہ بات ہوگئی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز کو تمام نہ کر سکنے کی وجہ بعد میں وہ مقتدی ہوگئے اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی جگہ امام بن گئے۔ اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی جگہ پر رہتے۔ نماز پڑھاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہی کی اقتداء میں نماز تمام کرتے۔ اصل مقصد ہی یہی تھا۔

Scanned by CamScanner

تنبیہ ۱: صاحب خیر الکلام نے صـ۴۶۱ پر لکھا ہے اور پہلے بھی اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ (پس ہو سکتا ہے کہ آپ نے اگر سابق امامت کو کالعدم قرار دیتے ہوئے نئی امامت سے نماز کی نیّت کی ہو) یعنی تکبیر تحریمہ کہتے ہوئے آپؐ نے امام ہونے کی نیّت کی ہوگی۔ آپؐ امام ہی ہو گئے ہوں گے۔ اس میں جب وہ اشکال سمجھے کہ لوگوں کی تکبیر تحریمہ تو پہلے سے ہو چکی ہے۔ اس صورت میں مقتدیوں کی تکبیر تحریمہ امام سے متقدم ہو جاتی ہے تو اس کا جواب دیتے ہوئے یہ فرماتے ہیں۔ مقتدی کی تکبیر تحریمہ اگر ضرورت کی بنا پر پہلے ہو جائے اور امام بعد میں تکبیر تحریمہ کہے تو اس صورت میں اقتداء درست ہوتی ہے۔ امام بخاریؒ کا یہی مذہب ہے۔ (سبحان اللہ! کیا ہی مزے کی بات کہی) آپ کو تو اس موقع میں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر جمہور صحابہ کرامؓ کا یہی مذہب ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا صحابہ کرامؓ امام بخاریؒ کے مذہب کے عقیدت مند اور پابند تھے؟ حضرات صحابہ کرامؓ تو لا تبادروا الامام۔ وانما جعل الامام لیؤتم بہ کے عقیدت مند تھے۔ آپ تو اہل حدیث ہیں۔ حدیث کا حوالہ دیتے جس کو وہ حضرت جانتے تھے۔ امام بخاریؒ کی تو بہت سی باتیں آپ بھی نہیں مانتے امام بخاریؒ نے مصافحہ بالیدین کا ترجمۃ الباب صحیح بخاری صـ۹۲۶ میں ذکر کیا۔ یہی ان کا مذہب اور مختار ہے اور آپ کی جماعت والے سب ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں

باب اخذ یالیدین وصافح حماد بن زید بن المبارك بیدیہ۔

بخاری صـ۹۲۶ ج۲۔ حضرت امام بخاریؒ بیک وقت تین طلاقوں کے جواز اور ان کے وقوع کے قائل ہیں اور یہ باب قائم کرتے ہیں: من اجاز الطلاق الثلاث (صـ۷۹۱ ج۲) اور آپ لوگ تین طلاقوں کو ایک قرار دے کر التثلیث فی التوحید کے قائل ہیں اور امام بخاریؒ محرم کے نکاح کو جائز قرار دیتے ہیں۔ دیکھئے بخاری صـ۶۴۸ ج۱ باب تزویج المحرم مگر آپ لوگ اس کے قائل نہیں ہیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ حضرت امام بخاریؒ امام کی تکبیر سے مقتدی کی تکبیر تحریمہ کے تقدم کو جواز کیوں کہتے ہیں اور اس کا جواب کیا ہے؟ تو اس کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں۔ اس کے

Scanned by CamScanner

لیے آپ فیض الباری ص۳۵۷-۳۵۸ ج۱ کی طرف مراجعت فرمائیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ تشفی ہو جائیگی۔
اجمالی بات یہ ہے کہ ایک دفعہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خیال نہ آیا۔ غسل کرنا تھا
مگر صرف وضو کر کے مسجد میں تشریف لے گئے اور نماز پڑھانے کی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔
غیر صحیحین کی بعض روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے تکبیر بھی کہہ دی۔ بعد میں یاد آیا کہ میں نے
تو غسل کرنا تھا۔ واپس گھر کی طرف لوٹ آئے اور لوگوں سے فرمایا: مَکَانَکُمْ۔ یعنی تم
جگہ پر رہو۔ غسل کر کے آئے اور نماز کی تکبیر کہی۔ اوّل تکبیر یقیناً صحیح نہیں ہوگی۔ لوگوں کی
سابقہ تکبیر بھی اس وقت کی صحیح نہ ہوئی۔ لیکن غسل کے بعد والی تکبیر کے ساتھ لوگوں کا تکبیر
کا اعادہ کرنا مذکور نہیں۔ اس میں مقتدیوں کی تکبیر امام سے پہلے ہو گئی۔ لیکن بخاری ص۱۲۱ میں
ہے فلما قام فی مُصَلَّاہُ ذکر انہ جنبٌ فقال مکانکم ثم رجع
فاغتسل۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھڑے ہوتے ہی یاد آگیا کہ میں جنابت میں ہوں۔ آپؐ
نے ابھی تکبیر نہیں کہی تھی۔ لہٰذا سابق دلیل ناتمام ہو گئی۔ راجح بخاری ہی کی روایت ہے
اور یہی اکثر کا مختار ہے۔ بخاری ص۸۹ میں ہے وانتظرنا ان یکبر انصرف۔ الخ
ہم انتظار میں تھے کہ تکبیر کہیں گے مگر آپ واپس چلے گئے اور مسلم میں ہے: قبل ان
یکبر۔ یعنی تکبیر کہنے سے قبل ہی آپؐ واپس تشریف لے گئے۔ معلوم ہوا کہ ابھی
آپؐ نے تکبیر نہیں پڑھی تھی۔ حاشیہ بخاری ص۸۹ کو دیکھ لیں۔ لیکن مصنف خیر الکلام
مطلب سازی کے لیے پہلی مرجوح روایت کو لیتے ہیں اور بخاری و مسلم کی روایت کو چھوڑتے
ہیں اور کہتے ہیں کہ مقتدی کی تکبیر تحریمہ امام سے پہلے ہونا درست ہے۔ مصنف خیر الکلام
نے اس مقام پر اور کئی باتیں اسی انداز کی کہی ہیں۔ صرف حنفیہ کثرھم اللہ تعالیٰ کی ضد
میں یہ چال انھوں نے چلی ہے۔ ص۴۶۸-۴۶۹ میں لکھتے ہیں۔ (ابنِ ماجہ کی روایت کی
سند میں ابو اسحٰق سبیعی ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے اس کو تیسرے درجے کے مدلسین میں شمار
کیا ہے) لیکن یہ بیکار عذر ہے۔ انہیں حافظ ابنِ حجرؒ نے ان کی سند کو اسنادہ حسن
فرمایا ہے۔ ص۳۱۹ ج۲ فتح الباری باب انما جعل الامام لیؤتم بہ۔ اسی طرح
مصنف خیر الکلام نے مسند احمد کی روایت میں ابو اسحاق کی تدلیس کی شکایت کی ہے

Scanned by CamScanner

جواب ابھی معلوم ہوا کہ انہی کی روایت کو حافظ ابنِ حجرؒ حسن فرما چکے ہیں۔ کیا آپ کی دلیل اِلّا بفاتحۃ الکتاب کا راوی محمد بن اسحاق تیسرے درجے کا مدلس نہیں ہے؟ اس کا کذّاب و دجّال ہونا اس پر مزید ہے۔

۲: خیر الکلام ص۴۶۶ میں لکھتے ہیں۔ یہ نماز از روئے تحقیق ظہر کی تھی۔ صحیحین کی روایت سے معلوم ہوتا ہے اور خیر الکلام ص۴۶۷ میں لکھا کہ آپؐ آتے ہی امام بن گئے تھے پہلے مقتدی نہیں بنے اور قرأ من حیث بلغ الیہ ابوبکرؓ کی تأویل (جو درحقیقت تحریف ہے) کرتے ہوئے لکھا (ص۴۶۹/۴۷۰) کہ قرأت سے نماز مراد لینی چاہیئے۔ کئی صفحات انھوں نے اسی لایعنی بیان میں سیاہ کیے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کی عشاء کی نماز میں آمد کا انکار کر رہے ہیں۔ اس بنا پر کہ حافظ ابنِ حجرؒ صرف ظہر میں مسجد میں آنا لکھتے ہیں اور ص۴۵۶ میں ہے کہ بخاری میں ظہر ہے اور جن روایات میں عشاء کی نماز میں مسجد کو جانا معلوم ہوتا ہے ان کو اختصار کے بہانہ سے ٹال رہے ہیں اور قوم کو بتانا یہ چاہتے ہیں کہ مرضِ وفات کے دنوں میں صرف ایک ظہر کی نماز میں آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ظہر کی نماز کی حاضری میں جب تأویل کی جائے گی کہ جب آپؐ نے خود امامت کی نیت کی تھی تو حضرت ابوبکرؓ کی اقتدار کی نیّت نہیں کی تھی تو حنفیہ کا استدلال ردّ ہو جائے گا کہ آپ نے اقتداً نماز میں کی تھی اور فاتحہ کل یا بعض نہیں پڑھی تھی؟ تو اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی پر فاتحہ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ مصنف خیر الکلام کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اقتدأ حضرت ابوبکرؓ کی آپؐ نے نہیں کی تھی۔ اپنی امامت کی نیت سے نماز پڑھی تھی۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ مصنف خیر الکلام نے اپنے اس حیلہ سازی کی مدار قرأ من حیث بلغ الیہ ابوبکرؓ من السورۃ میں مجازی معنی پر رکھی ہے کہ آپؐ نے نماز وہاں سے شروع کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ پہنچ چکے تھے۔ آپؐ نے اقتدار حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کی ہی نہیں۔ آپ کی قوم اگر اس میں آپ کی تقلید کرتی ہے تو خوشی سے کرے۔ مگر دُنیا علم اور عقل رکھتی ہے اور مُجاز بلا قرینہ کو اربابِ فن مردُود کہتے ہیں۔ ہاں ممکن ہے کہ شیعی مزاج لوگ بھی اس میں آپ کی ہمنوائی کریں۔

Scanned by CamScanner

کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتداء کا انکار ان کا بھی نظریہ ہے اور شاید وہ آپ کی اس تاویل کو اپنالیں شیعی نظریات ہوائی فائر ہوتے ہیں ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ دیکھئے اگر کوئی عقل کا دشمن یہی بات کہے تو اس کو یہ بات سنائیں کہ بخاری شریف میں ہے کہ سوموار کے روز جو آپ کی زندگی کا آخری دن ہے صبح کے وقت مرض میں کچھ افاقہ ہوا۔ صبح کی نماز کے وقت مسجد کی طرف جو پردہ لٹکا ہوا تھا اس کو اٹھایا۔ دیکھا کہ جماعت ہو رہی ہے۔ تمام حضرات صحابہ کرامؓ حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے صف باندھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر خوشی محسوس کرتے ہوئے آپؐ ایسے مسکرائے کہ ہنسنے کا انداز بن گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی نظر بھی آپؐ کے چہرہ مبارک پر پڑی۔ خیال ہوا کہ شاید آپ مسجد میں تشریف لانا چاہتے ہیں تو پیچھے ہٹنے لگے کہ شاید آپ نماز پڑھائیں گے۔ لیکن حضرت نے اشارہ فرمایا کہ اپنی جگہ پر رہو اور نماز پڑھاتے رہو۔ آپؐ واپس ہو گئے اور پردہ کو نیچے کر دیا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہے: بخاری ص ۹۳ ج ۱ اذا کان یوم الاثنین وھم صفوف فی الصلوٰۃ فکشف النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رؤیتھم باجتماعھم علی الصلوٰۃ بالھیئۃ التی امر بھا من امامۃ ابی بکرؓ واتفاقھم علیٰ ذٰلکَ۔ اور یہ بھی لکھا ہے التبسم عبارۃ عن الرضاء... الخ۔ یعنی اس حال میں ان کو دیکھ کر آپ کا مسکرانا دلیلِ رضامندی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخری نماز تک آپ حضرت ابوبکرؓ کی امامت پر راضی تھے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ حضور علیہ السلام جب مسجد کو گئے تو حضرت ابوبکرؓ کو پیچھے ہٹا دیا اور امامت سے معزول کر دیا۔ ہاں وہ پیچھے ہٹنے کے قریب ہوئے تو آپؐ نے ان کو اشارہ فرما دیا: اَنْ صَلِّ یا اَنْ کَمَا اَنْتَ۔ مگر حضرت ابوبکرؓ کے ضمیر نے تقدم کو پسند نہ کیا اس لیے اس موقع پر پیچھے ہٹ گئے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ ان کی نماز میں آپؐ داخل نہیں ہوئے اپنے طور سے امامت کی نیت کی تھی جیسے مصنف خیر الکلام نے کہا ہے یہ شیعی آواز کے قریب ہے۔ فتح الباری ص ۲۹۷-۲۹۸ ج ۲ میں ہے حَتّٰی انہ صلّٰی خلف ابی بکرؓ۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت

ابوبکرؓ کے پیچھے نماز پڑھی۔ باب الرخصۃ فی المطر سے تھوڑا پہلے۔ پھر جب وہ بحکم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے اور برضاء حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پڑھا رہے تھے تو ان کی آپؐ نے اقتدار کیوں نہ کی ہوگی؟ اقتدا میں نماز پڑھنا تو مزید رضامندی کی دلیل ہے۔ اس میں لوگوں کو سبق بھی دینا پایا جاتا ہے۔ یہ باتیں ضمنی طور سے کی گئی ہیں۔ والعلم خیر کلہ واللہ الموفق ومنہ الھدایۃ۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ مصنف خیر الکلام نے صرف ایک دن ظہر کی نماز میں مسجد میں آنا لکھا ہے تاکہ انکار سہل ہو جائے۔ بے شک ظہر کی نماز صریحاً مروی ہے لیکن عشاء کی نماز مسجد میں خلف ابی بکرؓ پڑھنے کی بھی تصریح ہے۔

بخاری شریف ص۹۵ میں ہے: والناس عکوف فی المسجد ینتظرون النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لصلوٰۃ العشاء الاٰخرۃ فارسل النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الیٰ ابی بکرؓ بان یصلی بالناس۔ اور ص۹۹ میں ہے: مروا ابابکر اَنْ یُّصَلِّیَ بالناس۔ فلما دخل فی الصلوٰۃ وجد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی نفسہٖ خفۃ فقام یھادٰی بین رجلین .... الخ۔ یہ روایات ایک ہی واقعہ کا اظہار کرتی ہیں جو نمازِ عشاء سے متعلق ہے۔ بے شک خروج الیٰ صلوٰۃ الظہر بھی مروی ہے۔ لیکن لصلوٰۃ العشاء الاٰخرہ کی بھی تصریح ہے۔ اسی طرح بخاری ص۶۳۹/۲ میں ہے ثم طفقنا نصب من تلك القرب حتیٰ طفق لیشیر الینا ان قد فعلتن قالت ثم خرج الی الناس فَصَلّٰی بھم وخطبھم۔ بظاہر یہ واقعہ عشاء کا ہی ہے۔ اس میں اس کے جواب کی حاجت نہیں رہتی کہ آپ نے کیسے سُن لیا؟ یہ تو ظہر کی نماز تھی قرأت مخفی کی ہوگی۔ جواب یہ دیا گیا کہ شاید کوئی آیت اونچی پڑھ دی ہوگی۔ لیکن مصنف خیر الکلام نے اپنے مطلب کی خاطر صرف ظہر کا واقعہ بنایا ہے اور دوسری روایات میں اختصار کا دعوٰے کیا اور اس پر کوئی شہادت نہیں پیش کی۔ غرضیکہ جونسی صورت ہو نماز خلف ابی بکرؓ ہی پڑھی گئی۔ ان کی امامت کو کالعدم قرار دے کر نئے سرے سے امام

Scanned by CamScanner

بن کر تحریمہ نہیں کہا گیا۔ کسی محدّث نے ابنِ ماجہ یا مسند احمد کی مذکورہ احادیث کا یہ معنی نہیں کیا۔ مصنف خیر الکلام تو اپنے کو سلفی کہتے ہیں۔ سلف میں سے کسی بزرگ محدث کا حوالہ دیجئے۔ آپ کی ایسی بات تو کوئی بے علم مرید ہی مان سکتا ہے۔ خلف ابی بکرؓ نماز پڑھنے کا انکار مشکل پڑے گا۔

مزید سنئے! ایک دن فجر کی نماز بھی اسی مرض وفات کے زمانہ میں آپ نے مسجد میں آکر خلف ابی بکرؓ پڑھی۔ ہاں ایک رکعت کے بعد آپ پہنچے۔ صرف ایک رکعت امام کے ساتھ پائی۔ اس دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پیچھے نہیں ہٹے کیونکہ ایک رکعت پڑھ کر سلام نہیں پھیر سکتے تھے۔ فتح الباری ص ۲۰۹ ج ۲ میں ہے واستمرّ فی مرض موته صلی الله تعالیٰ علیه وسلم حین صلّی خلفه الرکعة الثانیه من الصبح کما صرح به موسیٰ بن عقبة فی المغازی. یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز کو برقرار رکھتے ہوئے پڑھتے رہے۔ جبکہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام دوسری رکعت صبح میں تشریف لاکر شریک جماعت ہوئے۔ اس کے بعد ص ۳۱۶ ج ۲ میں فرمایا: انه صلّی خلف ابی بکرؓ کما قدمنا۔ اسی طرح ص ۲۹۶ ج ۲ میں فرمایا: اٰخر صلوٰة صلاها النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم خلف ابی بکرؓ۔ حافظ ابن حجرؒ سب جگہ خلف ابی بکرؓ کی تصریح فرما رہے ہیں اور مصنف خیر الکلام فرماتے ہیں حضرت ابوبکرؓ کی امامت کو کالعدم قرار دے کر اپنی امامت کی نیت سے تحریمہ کیا اور نماز پڑھی۔ فوا اسفا۔ پھر حافظ ابنِ حجرؒ ص ۲۰۹ ج ۲ میں اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ اس نماز صبح والی میں جبکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جماعت میں شریک ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ پیچھے کیوں نہیں ہوئے؟ فرمایا: فکانه لما مضی معظم الصّلوٰة حسن الاستمرار ولما لم یمض هٰهنا الا الیسیر لم یستمر۔ یعنی جب صبح کی نماز کا اکثر حصّہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی شرکت سے پہلے پڑھا گیا تھا۔ اس لیے اس میں وہ پیچھے نہیں ہوئے۔ اپنی جگہ پر رہتے ہوئے نماز تمام کی۔ اور دوسری صورت میں جہاں اوّل رکعت کے درمیان آپ آپہنچے تھے اس میں پیچھے

Scanned by CamScanner

ہو جانا مناسب معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پوری نماز تمام کر سکیں گے۔ جیسے گزر چکا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس صبح کی نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے تھے اور خلف ابی بکرؓ نماز پڑھی۔ صرف ظہر کی نماز پر ہی اصرار کرنا جیسا کہ مصنف خیر الکلام کر رہے ہیں کم مائیگی کی علامت ہے۔ معلوم ہُوا کہ آپؐ نے علالت کی وجہ سے فجر کی نماز گھر میں بھی پڑھی اور مسجد میں تشریف آوری نہیں ہوئی اور کسی صبح کی نماز میں مسجد تشریف لائے اور باجماعت ایک رکعت ادا کر گئے جیسے ابھی گزرا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصنف خیر الکلام کا صبح کی نماز کے لیے مسجد جانے سے انکار کر دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ عشاء اور فجر کی نمازوں کے لیے مسجد جانے سے انکار کر دینا اور صرف ایک ظہر کے لیے جانا تحقیق کے خلاف ہے۔ صبح کی نماز کے لیے جانا اگرچہ بخاری میں نہیں ہے لیکن حافظ ابنِ حجرؒ موسیٰ بن عقبۃ فی المغازی کے حوالہ سے روایت نقل کرتے ہیں جو ثقہ راوی ہے اور اس پر گرفت نہیں کرتے۔

تنبیہ

۱: مصنف خیر الکلام نے ص۴۵۴ میں ابنِ ماجہ والی روایت اخذ رسول اللہ من القرأۃ من حیث کان بلغ ابوبکرؓ کے متعلق جو اس حدیث کی سند میں کلام کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ خیر الکلام ص۴۶۸ پر لکھتے ہیں۔ پہلی روایت جو ابنِ ماجہ کے حوالے سے لکھی گئی۔ اس کی سند میں ابو اسحاق سبیعی ہیں۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ان کو تیسرے درجے کے مدلسین میں شمار کیا ہے اور اس طبقہ کی روایات بدون تصریح سماع قبول نہیں ہوتیں۔ مگر صد افسوس کہ آپ کے اس ضابطہ کی اطلاع امام بخاریؒ کو نہ ہوئی انھوں نے شاید بے خبری میں ان کی روایات اپنی صحیح میں لائیں۔ بخاری ص۲۷۰ ج۲ میں ہے: عن اسرائیل عن ابی اسحاق عن زید بن ارقم۔ نیز گزر چکا ہے کہ حافظ ابنِ حجرؒ اس کو حسنٌ فرما رہے ہیں۔ حسنٌ مقبول ہی ہوتی ہے۔

۲: مصنف خیر الکلام نے ص۴۶۹ پر مزید لکھا کہ ایک روایت زیلعیؒ نے مُسندِ بزار کے حوالہ سے حضرت ابنِ عباسؓ سے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند

Scanned by CamScanner

ہیں قیس بن ربیع ہے جو ضعیف ہے۔ افسوس کہ انھوں نے آدھی بات تو نقل کر دی۔ اور بعد والے کلام سے نظر ہٹالی ہے کیونکہ سودا مہنگا پڑتا ہے کہ شاید پوری بات نقل کرنے پر کوئی ملامت ہی نہ کرے۔ علامہ محقق جمال الدین زیلعیؒ نے نصب الرأیۃ ص ۵۱-۵۲ ج ۲ میں فرمایا ہے۔ قلت رواہ ابن ماجہ من غیر طریق قیس: فقال حدثنا علی بن محمد ثنا وکیع عن اسرائیل عن ابی اسحاق عن الارقم بن شرحبیل عن ابن عباسؓ لما مرض رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فذکر (الی) قال ابن عباسؓ فاخذ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من القرأۃ من حیث کان بلغ ابوبکرؓ قال وکیع وکذا السنۃ۔ اور یہ ابنِ ماجہ ص ۸۸ باب صلوٰۃ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی مرضہ۔ میں مذکور ہے۔ یعنی یہ روایت قیس کے علاوہ اور طریقوں سے بھی مروی ہے۔ اس بات کو مصنف خیر الکلام شیرِ مادر سمجھ کر پی گئے ہیں اور ان کے بڑھاپے میں شیر خوار ہونے پر زیادہ تعجب ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے فتح الباری ص ۲۴۴ ج ۱ میں فرمایا: سماع اسرائیل عن ابی اسحاق فی غایۃ الاتقان للزومہ ایاہ لانہ جدّہ۔ یعنی اسرائیل کا روایت نقل کرنا ابو اسحاق سے نہایت صحیح اور قوی ہے۔ ہمیشہ ان کے ساتھ مصاحب رہا۔ ابو اسحاق ان کا جدِ امجد ہے۔ اسی طرح ترمذی ص ۲۹ میں ہے اسرائیل اثبت اضبط لحدیث ابی اسحاق بلکہ اسرائیل کا متابع بھی مسندِ احمد ص ۳۳۱ ج ۱ میں مروی ہے۔ راجح نصب الرأیہ ص ۵۱-۵۲ ج ۱۔

۳: مصنف خیر الکلام ص ۴۶۹ میں فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ یہ بخاری مسلم کی روایات (جن میں ظہر کا لفظ ہے) کے موافق کرنے کے لیے ان کی تاویل کرنی ہوگی۔ سبحان اللہ! ضد کا کوئی علاج نہیں۔ یہ "خوئے بدرا بہانہ ہائے بسیار" والی بات ہے۔ کیوں جناب بخاری شریف ص ۹۵ ج ۱ میں خرج لصلوٰۃ الظہر حصر کو چاہتا ہے کہ صرف ایک ظہر کے لیے ہی آپ مسجد کو گئے۔ کیا خروج للفجر اس کے منافی ہے اور کیا خروج للعشاء الاخرۃ بھی اس کے مخالف بنتا ہے کہ ان میں تاویل کی جائے اور کیا یہ

بخاری کی روایتیں نہیں ہیں ؟ ہاں آپ کا ضمیر چونکہ اس کو نہیں مانتا اور آپ کا مقصد چونکہ پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے آپ کو تاویل حسب منشأ اور من پسند کرنی پڑے گی۔

دوسری بات یہ کہ مصنف خیر الکلام نے گزشتہ ص۴۶۱ پر لکھا کہ مقتدی کی تکبیر تحریمہ امام سے مقدم ہو سکتی ہے۔ اس کا مأخذ ابوداؤد ص۱۶ ج۱ کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنابت کی حالت میں مسجد میں جاکر تکبیر تحریمہ پڑھی۔ پھر یاد آیا کہ میں نے غسل نہیں کیا پیچھے لوٹ گئے۔ آپ کی تکبیر کے ساتھ حضرات صحابہ کرامؓ نے بھی تکبیر کہی ہوگی۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب غسل کر کے پھر آئے۔ پھر تکبیر پڑھی۔ لیکن قوم کی تکبیر وہی سابقہ رہی۔ روایت میں نہیں ہے کہ انھوں نے تکبیر کا اعادہ کیا۔ اس میں مقتدی کی تکبیر کا امام سے تقدم پایا گیا۔ بے شک اس میں اگرچہ تقدم کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بخاری شریف کی روایت ص۸۸ میں ہے: اذا قام فی مصلّاہ انتظرنا ان یکبر انصرف مروی ہے اسی طرح مسلم شریف میں قبل ان یکبر مروی ہے کہ تکبیر پڑھنے سے پہلے آپ لوٹ گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابھی تکبیر نہیں کی گئی تھی۔ اب ہم کہتے ہیں کہ کیا ابوداؤد کی روایت بخاری مسلم کی روایت کے ہم پلّہ ہے جیسے خیر الکلام ص۴۶۹ کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔ اس واسطے بقول آپ کے بخاری مسلم کے موافق کرنے کے لیے اس کی تأویل کرنی ہوگی۔ یہی لفظ آپ کے ص۴۶۹ میں ہیں۔ یہاں اس کو جاری کر لیجیے۔ معلوم ہوا کہ آپ کا بیان خود آپ پر حجت بن گیا اور تقدیم تحریمہ مقتدی کا جواز جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے بالکل غلط نکلا کیونکہ اور خیر الکلام کی دکان کا مال کھوٹا ہی نکلا۔ صرف یہ نہیں بلکہ حدیث انما جعل الامام لیؤتم بہ کے بھی یہ خلاف ہے۔ عذر کے بہانے سے جواز بے دلیل بات ہے۔ ممانعت کی دلیل ہم نے پیش کر دی ہے۔ آپ اس کے خلاف شرعی دلیل پیش کریں۔ آپ کا یہ اجتہاد (یعنی عذر سے تقدم مقتدی امام پر جائز کہنا) دوسروں پر حجت نہیں بنتا۔ بالخصوص جب کہ خلاف کی حدیث صریح صحیح موجود ہے۔

Scanned by CamScanner

متفرقات و عجائبات

گزشتہ بات کے نمونہ کی چند اور باتیں بھی دیکھتے اور سنتے جائیں۔ گزشتہ بیان ہو چکا ہے کہ حنفیہ کثرھم اللہ تعالیٰ نے مقتدی پر فاتحہ پڑھنے کے لازم نہ ہونے پر بطور دلیل کے حسن الاسناد حدیث پیش کی ہے کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی بیماری کے زمانہ میں بحکم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھایا کرتے تھے۔ کسی روز ظہر کی نماز کے وقت یا عشاء کی نماز کے وقت افاقہ ہوا اور آپ مسجد میں تشریف لے گئے حضرت ابوبکرؓ امام صحابہ کرامؓ فاتحہ کے بعد سورۃ پڑھ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی نماز میں شامل ہو گئے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیچھے ہو گئے۔ آپؐ نے باقی قرأت پڑھ کر نماز تمام کی۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کل فاتحہ یا کچھ حصّہ نہ پڑھا نہ سُنا۔ صرف امام کی اقتدار کی وجہ سے امام کی قرأت آپؐ کے لیے کفایت کر گئی۔ مخالفین کہتے ہیں کہ بدون فاتحہ پڑھے نماز نہیں ہوتی۔ مگر یہ حدیث ان کے خلاف ہے۔ گزشتہ باتیں گزر چکی ہیں۔

اس کا پہلا[1] جواب مصنف خیر الکلام نے ایسا دیا جو کسی محدث کو خواہ شافعی المذہب ہو یا اور کوئی ہو نہ سوجھا۔ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز کو کالعدم قرار دے کر خود امام بن کر حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے نماز پڑھائی۔ اسکی تردید گزر چکی ہے۔ اور دوسرا[2] جواب بعض علمائے شافعیہؒ کا نقل کیا خود انہی کے الفاظ میں سنئے خیر الکلام ص۴۵۹ جو لوگ فاتحہ خلف الامام کو فرض سمجھتے ہیں ان میں سے بعض کے ہاں رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جاتی ہے اور ان میں سے بعض اس طرف گئے ہیں کہ جہری نمازوں میں اگر مقتدی پوری فاتحہ یا آدھی فاتحہ کے بعد آئے تو اس سے ساری فاتحہ یا آدھی ساقط ہو جاتی ہے۔ پھر ص۴۶۰ پر لکھتے ہیں یہ صورت مُستثنیٰ ہے۔ (یعنی لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کے عموم سے مستثنیٰ ہے) کیونکہ امام کی فاتحہ کے ساتھ تو مقتدی فاتحہ بلا تکلف پڑھ سکتا ہے۔ مگر دوسری صورت کے ساتھ پڑھنا اور استماع کرنا ذرا مشکل

ہے۔ پھر ص۴۶۰ پر لکھتے ہیں: ان کے ہاں یہ صورت مستثنیٰ ہے۔ غور فرمائیں کہ آدھی فاتحہ کا پڑھنا اور استماع کا حق ادا کرنا جب مشکل ہے کیونکہ استماع کامل توجہ کو کہتے ہیں اور خود پڑھنے سے کامل توجہ سُنی ہُوئی چیز کی طرف نہیں رہتی۔ امام رازیؒ سے نقل گزر چکی ہے فالاستماع یمنع عن القرأۃ۔ یہ بات جیسے آدھی فاتحہ میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کل فاتحہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ پھر آپ نے یہ کیسے کہا (امام کی فاتحہ کے ساتھ تو مقتدی فاتحہ بلاتکلف پڑھ سکتا ہے) علاوہ ازیں کہ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو حضرات محدثینِ کرامؒ نے اس کو کیوں چھوڑا ہے؟ امام ترمذیؒ کا قول بھی گزر چکا ہے۔ واختار اھل الحدیث ان لا یقرأ الرجل مع الامام۔ وہ تو سکتات میں پڑھنا بتاتے ہیں اور امام کے ساتھ فاتحہ پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت حافظ ابنِ حجرؒ کا قول بھی گزر چکا ہے کہ وہ امام کو حکم دیتے ہیں کہ فاتحہ کے بعد اتنا ٹھہرے کہ مقتدی فاتحہ پڑھ لیوے۔ ورنہ مقتدی پڑھنے میں ارتکاب منہی کرے گا۔ حوالہ گزر چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصنف خیر الکلام قوم کو ارتکاب منہی کی تعلیم دے رہے ہیں اور جمہور محدثینِ کرامؒ کے خلاف جانب کی تلقین کر رہے ہیں۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک۔

مصنف خیر الکلام کی دوسری بات کو بھی غور سے سوچیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جن سے فاتحہ کل یا اس کا کچھ حصّہ چھوٹ گیا۔ وہ امام کو رکوع میں تو مل جاتے ہیں اور جس نے رکوع کو امام کے ساتھ پالیا۔ اس کی رکعت ہو گئی۔ اس لیے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اگرچہ فاتحہ کل یا بعض چھوٹ گئی۔ لیکن قانون ادراک رکوع سے نماز صحیح ہو گئی۔ مدرک رکوع ضابطۂ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کے عموم سے مستثنیٰ ہے۔ خیر الکلام ص۴۵۹ رکوع میں شامل ہونے سے رکعت مل جاتی ہے۔ ہو جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ ضابطہ اگر آدھی فاتحہ چھوٹ جانے والے کے لیے قابلِ عمل ہے اور اس سے بلا فاتحہ پڑھے ہُوئے نماز ہو جاتی ہے تو کل فاتحہ کے لیے اس کو کیوں نہیں لیا جاتا مقتدی اگرچہ زبانی پڑھ سکتا ہے لیکن امام کے فاتحہ پڑھتے ہُوئے مقتدی کو جب منع کیا گیا ہے تو وہ شرعاً معذور ہے تو اس کو بھی مدرک رکوع کے ضابطہ میں کیوں نہیں لیا

Scanned by CamScanner

جاتا۔ اگر بعد الفاتحہ سورت کے زمانہ میں مقتدی کو تم روکتے ہو۔ جیسے کہ حافظ ابنِ حجرؒ فینصت فیما بعد الفاتحۃ فرمارہے ہیں۔ اور آپ لوگ بھی کہتے ہیں کہ استماع کرنا اور پڑھنا ذرا مشکل ہے جیسے ابھی گزرا اور کہتے ہو کہ جب رکوع مل گیا تو بلا فاتحہ پڑھے نماز ہو جائے گی۔ تو اوّل سے ملنے والے کے لیے بھی آپ یہی کیوں نہیں کہتے۔ استماع اس کو بھی پڑھنے سے روکتا ہے اور رکوع میں یہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جب یہ ضابطہ مدرک رکوع کے لیے نہیں تو مدرک صلوٰۃ کو کیوں ارتکاب منہی پر مجبور کرتے ہو۔

غور فرمائیں ھل قرأ معی احد منکم۔ قرأۃ مع الامام سے روکتا ہے اسی طرح فانتھی الناس عن القرأۃ مع الامام فیما جھر فیہ۔ بھی اسی کی شہادت دیتا ہے۔ خواہ یہ حضرت امام زہریؒ کا مقولہ ہو یا حضرت ابوہریرہؓ کا فرمان ہو۔ پھر اس کے بعد یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے ؟ جو خیر الکلام ص۴۶ میں کہا۔ امام کے فاتحہ کے ساتھ تو مقتدی بلا تکلف پڑھ سکتا ہے تو جس طرح رکوع کے اندر ملنے والے یا قریب رکوع ملنے والے فاتحہ تحقیقاً نہیں پڑھ سکتے۔ مصنف خیر الکلام بھی لکھتے ہیں کہ رکوع میں پڑھنے کی ممانعت آئی ہے۔ حالانکہ یہ شرعی عذر ہے۔ آپ اس کے لیے رکوع میں ملنے والوں کے لیے یہ ضابطہ کام میں لائے اور نماز صحیح کر دی تو بعینہٖ اسی طرح مع الامام فاتحہ پڑھنا خاص کر جہری نمازوں میں بھی یہ دلیل مذکور سے ممنوع ہے اس کو بھی اسی ضابطہ میں کیوں نہیں لیا جاتا اور آپ نے امام کی فاتحہ کے ساتھ تو مقتدی بلا تکلف پڑھ سکتا ہے کیسے کہہ دیا ؟ مصنف خیر الکلام کی دُکان کا یہ سامان بھی کھوٹا نکلا۔ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے پڑھنا بلا تکلف حدیث کے مخالف اور جمہور محدثین کے خلاف ہے۔

مقامِ حیرت

مقتدیوں کا فاتحہ کے درمیان امام سے ملنا یا سورت پڑھنے کے زمانے میں ملنا ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔ حضرت ابوبکرہؓ تو رکوع کے وقت ہی امام سے ملے تھے مصنف خیر الکلام نے ص۴۶ میں فرمایا۔ فاتحہ کے درمیان ملنے والوں کے لیے فاتحہ کا پڑھنا

Scanned by CamScanner

ذرا مشکل ہے۔ اسی طرح سورۃ پڑھتے ہوئے ملنے والوں کا پڑھنا اور استماع کرنا مشکل ہے اسی عذر کی وجہ سے بلا فاتحہ پڑھے رکوع کے مل جانے سے نماز کا ہو جانا کہا جاتا ہے یہ مستثنیٰ ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے۔ (ص ۴۶۰) یفترض علی المأموم قرأۃ الفاتحۃ خلف الامام الّا اذا کان مسبوقا بجمیع الفاتحۃ او بعضھا فان الامام یتحمل عنہ۔ یعنی جب تمام فاتحہ مقتدی سے چھوٹ جائے یا بعض حصّہ رہ جائے تو اس کی نماز بلا فاتحہ ہو جاتی ہے۔ امام کی پڑھی ہوئی فاتحہ اس کی ہو جاتی ہے کیونکہ مقتدی کا فاتحہ پڑھنا اس حال میں مشکل بن جاتا ہے۔ یہ صورت مستثنیٰ ہے۔ دوسری جانب نظر کریں تو حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کا مختار یہ ہے کہ امام فاتحہ تمام کرنے کے بعد اتنا ٹھہرے کہ مقتدی فاتحہ پڑھ لیں۔ اسی طرح امام نوویؒ شارح مسلم فرماتے ہیں۔ دوسری جگہ ان کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ کے درمیان آنے والوں اور ابتدا سے شامل ہونے والوں کی فاتحہ خوانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ وہ آہن کے سکتہ میں فاتحہ خوانی کریں اور ابتدا میں شامل ہونے والے امام کے ساتھ نہ پڑھیں۔ حالانکہ مصنف خیر الکلام ص ۴۶۰ میں بلا تکلف پڑھنا بتا رہے ہیں ہاں درمیان فاتحہ کے آنے والوں کا پڑھنا مشکل کہہ رہے ہیں۔ ان دونوں باتوں کو زیر نظر رکھ کر میں پوچھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تو یہ مشکل پیش آئی ہوگی پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے انھوں نے کیوں دریافت نہ کیا کہ حضرت ہم درمیان میں آنے والے فاتحہ کس طرح پڑھیں؟ اسی طرح بعد از فاتحہ سورۃ کے زمانے میں شریک جماعت ہونے والوں نے کیوں دریافت نہ کیا۔ آپ لوگ عوام کو بھی کچھ بتاتے ہیں اور کبھی کچھ۔ ہر روز تین جہری نمازوں میں لوگ کوئی فاتحہ کے درمیان ملتے ہیں۔ کوئی سورت کے پڑھتے وقت ملتے ہیں پھر حضراتِ صحابہ کرامؓ نے کیوں اس اشکال کا حل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اور حضراتِ تابعینؒ نے حضرات صحابہ کرامؓ سے دریافت نہ کیا؟ اس سے تو معلوم ہوا کہ وہ امام کے پیچھے فاتحہ خوانی کرتے ہی نہ تھے۔ نیز معلوم ہوا کہ فاتحہ خوانی کے جھگڑے بعد کی پیداوار ہے۔

السّادس من الادلة حدیث ابی بکرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آج کل تقریباً ہر نمازی جانتا ہے کہ امام رکوع میں ہو اور مقتدی اس میں شامل ہو جائے تو وہ رکعت ہو جاتی ہے اسی لیے ایسے وقت آنے والا جلدی کرتا ہے کہ امام سے رکوع میں مل جائے۔ اسی طرح حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے زمانے میں معلوم و مشہور تھا کہ مدرک رکوع مدرک رکعت ہو جاتا ہے، حضرت ابوبکرہؓ ایسے ہی وقت پہنچے اور رکوع کو پالیا۔ ایسے وقت ہر شخص تکبیر کہہ کر جھک جاتا ہے تاکہ رکوع میں مل جائے۔ انھوں نے غلطی یہ کی کہ صف سے کم و بیش قدم دو قدم پہلے ہی تکبیر کہہ کر جھکنے کے بعد صف میں پہنچے۔ تیزی سے آنے کی وجہ سے کچھ سانس بھی پھول چکا تھا۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو اس کا احساس ہو گیا۔ نماز کے بعد دریافت فرمایا کہ کون ہے، جس نے جلدی سے ملنے کی کوشش کی۔ حضرت ابوبکرہؓ (نفیع بن الحارث) نے فرمایا: انی خشیت ان تفوتنی الرکعۃ۔ یعنی مجھے خوف ہو گیا تھا کہ رکعت فوت ہو جائے گی۔ اسی لیے میں نے یہ جلد بازی کی۔ آپؐ نے فرمایا: زادك اللّٰه حرصاولا تعد۔ خدا تیری نیکی کی حرص زیادہ کرے لیکن ایسی جلد بازی پھر نہ کرنا۔ حضرت امام بخاریؒ جزء القرأت میں یہ روایت لائے۔ صلّی رسول اللّٰه صلّی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلّم صلوٰۃ الصبح فسمع نفسا شدیدًا وبهرا من خلفه (الیٰ) قال انی خشیت ان تفوتنی رکعۃ معك یہ بات حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے سُنی اور انکار نہیں فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بلا فاتحہ پڑھے مقتدی کی نماز ہو جاتی ہے ہاں اس کی ایسے وقت تیز رفتاری کی اصلاح فرما دی کہ آرام سے آیا کرو۔ رکعت کے پانے کے لیے ایسی عجلت نہ کیا کرو۔ آرام و سکون سے جماعت سے ملو۔

مصنف خیر الکلام نے اس سے بچاؤ کے مختلف حیلے اور بہانے بنائے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ یہ صورت مستثنیٰ ہے۔ ص۴۵۰، مجبوری سے ایسا کیا گیا۔ رکوع کی حالت

Scanned by CamScanner

میں امام کو پالے تو اس رکعت میں فاتحہ فرض نہیں ہوتی۔ کیونکہ رکوع میں قرآن پڑھنا منع ہے۔ اگر قیام میں فاتحہ پڑھ کر شامل ہو تو اس میں امام کی مخالفت ہوگی۔ یہ بھی منع ہے۔ اسی طرح خیر الکلام ص۴۵۹ میں لکھا۔ یہ صورت مستثنیٰ ہے کیونکہ امام کی فاتحہ کے ساتھ تو مقتدی بلا تکلّف پڑھ سکتا ہے، مگر دوسری سُورت کے ساتھ پڑھنا اور استماع کرنا ذرا مشکل ہے۔

الجواب : پہلی بات یہ ہے کہ پہلے گزر چکا کہ جیسے یہاں دوسری سُورتوں کے ساتھ پڑھنا اور استماع کرنا مشکل ہے اسی طرح فاتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی ذرا مشکل نہیں بلکہ خاصا مشکل ہے۔ تمام حضرات محدثینؒ جہری نمازوں میں فاتحہ خوانی سکتات میں کہتے ہیں جس کی کچھ تفصیل گزر چکی ہے اور مزید تفصیل انشاءاللہ تعالیٰ آنے والی ہے۔ بلا تکلف پڑھنے کی اجازت دینا صحیح حدیث اور جملہ حضرات محدثین کرامؒ کے خلاف ہے حتّٰی کہ قرآن کی نصِّ قطعی کے بھی خلاف ہے کما مرّ اور دوسری بات یہ ہے کہ جیسے رکوع میں پڑھنا منع ہے۔ خیر الکلام ص۴۵۔ اسی طرح خلف الامام قرأۃ کرنا بھی قرآن و حدیث دونوں میں ممنوع ہو چکا ہے۔ رکوع میں منع ہونے کی حکمت یہ کہی گئی ہے کہ یہ حالت تذلّل کی ہے یہ عبدیت کی شان ہے اور یہ قرآنِ کریم کے احترام کے خلاف ہے۔ اسی طرح خلفیت بھی عجز و انکساری کی شان رکھتی ہے اور یہ قرآن کے اعزاز کے خلاف ہے۔ اسی کی طرف حدیث میں اشارہ فرمایا گیا لعلکم تقرؤن خلف امامکم۔ وجہ انکار خلف الامام میں خلفیت ہی کو بنایا گیا ہے لہٰذا اس کو بھی مستثنیٰ بنانا ہوگا۔ رکوع اور خلفیت دونوں حالتوں میں قرأت شانِ قرآن کے مناسب نہیں۔ حدیث میں ممانعت آچکی ہے تفصیل گزر چکی ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ آپ لوگوں نے ضابطہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتٰب کے عموم میں مذکورہ بیانات کے مطابق تخصیص کر دی ہے۔ (۱) رکوع میں امام کو پانے والا (۲) آدھی فاتحہ پڑھے جانے کے بعد ملنے والا (۳) پوری فاتحہ پڑھے جانے کے بعد آنے والا مقتدی۔ ان تینوں کی نماز بلا فاتحہ ہو جاتی ہے۔ تو ان تخصیصات کے بعد عام ظنی ہو جاتا ہے۔ پھر حنفیہ کے بالمقابل اس حدیث کے

Scanned by CamScanner

مَن کے عموم کو قطعی ہونے کی رٹ کیوں لگائی جاتی ہے۔ خیر الکلام کے کئی صفحے اس پر بلا وجہ سیاہ کر دیئے گئے ہیں۔ رکوع میں پڑھنے کی ممانعت کی دلیل سے زیادہ قوی دلیل فاتحہ سنتے وقت مقتدی کو قرأت کرنے کی آچکی ہے۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ بیان گزر چکا ہے۔ اسی طرح صحیح اور صریح حدیث ممانعت کی ثابت ہو چکی ہے۔ انکار بے انصافی ہے۔

حدیث ابی بکرہؓ کی دوسری تأویل اور اس کی تردید

مصنف خیر الکلام نے صـ۴۵ پر لکھا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رکوع میں شامل ہونے سے رکعت نہیں ہوتی۔ ابنِ خزیمہؒ وغیرہ بعض حضراتِ شافعیہؒ کا یہی مذہب ہے۔ (الیٰ) اس حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ ابوبکرہؓ نے رکوع والی رکعت کا اعادہ نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرہؓ نے وہ رکعت پڑھی ہوگی۔

آہ! سبحان اللہ العظیم۔ یہ کیسے مزے کی باتیں ہیں حضرت ابوبکرہؓ اعادہ تو جب کرتے کہ امام ابنِ خزیمہؒ ان کا پیر ہوتا اور مُرید پیر کی پیروی کرتا ہی ہے اور اس کی بات پر چلتا ہے یا امام ابنِ خزیمہؒ ان کا مذہبی امام ہوتا اور یہ اس کے مقلد ہوتے۔ امام ابنِ خزیمہ شافعیؒ کی یہ بات تو اکثر شافعیہؒ بھی نہیں مانتے۔ وہ مدرک رکوع کو مدرک رکعت مانتے ہیں یا یہ ثابت کرنا ہوگا کہ حضرت ابوبکرہؓ کا مذہب وہی تھا جو امام ابنِ خزیمہؒ اور اس کے ہم نوا بعض شافعیہؒ کا ہے کہ وہ رکوع کے پالینے کو رکعت کا پالینا نہیں مانتے تھے۔ لہٰذا وہ رکعت انھوں نے اعادہ کی ہوگی جس میں وہ شامل ہوئے تھے۔ آپ لوگ اپنی اجتہادی بات کس دیدہ دلیری سے ان کے ذمہ لگا رہے ہیں کہ یہ رکعت انھوں نے اعادہ کی ہوگی اگرچہ حدیث میں مذکورہ نہیں۔ کیا یہ اقرب نہیں کہ راوی نے اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ انھوں نے پڑھی ہی نہیں بلکہ وہ مدرک رکوع کو مدرک رکعت جانتے تھے۔ نیز آپ کو یہ بات بھی ثابت کرنی ہوگی کہ حضرت ابوبکرہؓ مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا فرض کہتے تھے۔ کیونکہ کئی حضرات محدثینؒ فاتحہ کا پڑھنا مقتدی کے لیے مستحب کہتے ہیں اور بعض مُباح جانتے

ہیں عنقریب تذکرہ انشاءاللہ تعالیٰ آنے والا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں رکوع پانے والے کے لیے اعادہ رکعۃ کا ضروری نہیں رہتا۔ آپ مستحب اور مباح کے رہ جانے سے رکعت کا اعادہ کیسے ضروری کہہ سکتے ہیں؟ اس کا اعادہ کرنا تو ان حضرات کا مذہبی تعصب اجتہادی نظریہ اور اپنا ذہنی منصوبہ ہے۔ اس کو حضرت ابوبکرہؓ کے ذمہ کیسے تھوپ سکتے ہیں؟ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس رکعۃ کا اعادہ انھوں نے کیا ہوگا؟ اگرچہ مذکور نہیں۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ جزء القرأت کی حدیث میں ان کا مقولہ یہ مروی ہے۔ الی خشیت ان تفوتنی الرکعۃ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رکوع کے پانے کو وہ رکعت کا پالینا جانتے تھے۔ پھر اس کے اعادہ کرنے کا کیا معنیٰ؟ اگر آپ رکوع میں ملنے کو حکم دیں کہ اعادہ کرو تو شاید وہ یہ جواب دیں کہ آپ کے منہ کا ذائقہ خراب ہے اس کو درست کرو اور ہوش سے بات کرو۔ میں تو رکوع کو پالینے سے رکعت کا پالینا جانتا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ آپ کو دو چار لگا بھی دے۔ اس جگہ مصنف خیر الکلام کا صـ۴۵۱ پر حضرت ابوہریرہؓ کا یہ قول لکھنا بھی غلط ہے کہ وہ مدرک رکوع کو مدرک رکعت نہیں کہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فاتحہ کے نہ پڑھنے کی وجہ سے یہ نظریہ نہ رکھتے تھے بلکہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ مقتدی کے لیے امام کو فی الجملہ قیام میں پانا ضروری ہے جیسے کہ امام بخاریؒ نے جزء القرأت صـ۴۵ میں ذکر کیا ہے: لا تجزئ الا ان تدرک الامام قائما۔ لیکن یہ مسلک حضرت ابوبکرہؓ کا ہونا ثابت نہیں۔ بلکہ ان کے فرمان الی خشیت ان تفوتنی الرکعۃ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ رکوع مع الامام کے پانے کو رکعت کا پانا جانتے مانتے تھے۔ امام کو قیام میں پائے یا نہ۔ یہی عام حضرات محدثین کرامؒ کا قول نقل کیا جاتا ہے۔ بہرحال حضرت ابوبکرہؓ کا اعادہ کرنا اس رکعت کا جس میں امام کو رکوع میں پایا کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ مصنف خیر الکلام صـ۴۵۲ میں لکھتے ہیں کہ باقی رہا یہ سوال کہ اگر رکوع میں رکعت نہیں ملتی تو حضرت ابوبکرہؓ کو رکوع میں شامل ہونے کے لیے اتنی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے اس لیے تکلیف کی کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ رکوع پاکر فضیلت میں شامل ہو جائیں۔

(انھوں نے ابوبکرہؓ کے ساتھ رضی اللہ عنہ ایک جگہ بھی نہیں لکھا)۔ غور فرمائیں کہ ان کا یہ کہنا حضرت ابوبکرہؓ کے فرمان کے صریح خلاف ہے ان کا فرمان توانی خشیت ان تفوتنی الرکعۃ ہے۔ کہ میں نے یہ عجلت سے آنا اس لیے کیا ہے کہ مجھے رکعۃ کے نکل جانے کا خوف تھا۔ اس لیے میں نے جلدی رکوع میں ملنے کی کوشش کی۔ یہ صاحبِ واقعہ کا بیان ہے اور یہی صحیح ہے۔ فضیلت کا پانا اور اس کے لیے جلدی کرنا جیسا کہ مصنف خیر الکلام کہہ رہے ہیں ایک جعلی بات اور توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کے قبیل سے ہے۔

مزید افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ کی اس رکعت کے فاسد بنانے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ مصنف خیر الکلام نے قدم اور آگے بڑھایا جو کسی محدّث نے نہیں کیا کہ حضرت ابوبکرہؓ کی یہ نماز پڑھی ہوئی صحیح ہی نہیں ہوئی۔ (لاحول ولاقوۃ الّا باللہ) اس پر علمی زور لگایا اور یہ دعویٰ کیا کہ انھوں نے رکوع میں جاکر تکبیر پڑھی تھی۔ قیام کیا ہی نہیں۔ اس لیے وہ رکعت صحیح نہ ہوئی۔ ان کے الفاظ پڑھ لیجئے۔ خیر الکلام ص۴۵۳ یہ کہنا کہ ابوبکرہؓ نے قیام میں تکبیر کہہ کر رکوع کیا ہوگا۔ ایک فرضی بات ہے۔ ص۴۵۱ پر لکھا ہے کہ حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ ابوبکرہؓ نے قیام بھی کیا تھا محض رکوع میں شامل ہونے سے حنفیہ کے ہاں بھی نماز صحیح نہیں ہوتی۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ابوبکرہؓ نے قیام کیا تھا اس وقت تک حنفیہ بھی اس حدیث سے یہ استدلال نہیں کر سکتے۔

آہ! سبحان اللہ، پہلی بات تو یہ ہے کہ کج فہمی کے بیان پر جتنا بھی رونا رویا جائے بجا ہوگا۔ ذرا سی عقل والا بھی اس بیان پر ماتم کرے گا۔ اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیا الہام یا کشف ہوا کہ حضرت ابوبکرہؓ نے تکبیر تحریمہ قیام میں نہیں کی تھی۔ رکوع میں جاکر تکبیر کہی۔ اگر حدیث میں ہے تو بتائیں۔ حدیث میں تو رکع دون الصف ہے۔ راوی نے یہ قصور تو بیان کر دیا اور یہ کیوں نہ کہا فکبر بعد ما رکع۔ اگر یہ ہوا تھا تو اس کا بیان زیادہ اہم تھا کیونکہ اس میں ایک فریضہ کا ترک ہے اور رکعت کو فاسد کرنے والی چیز ہے رکع دون الصّف تو اس سے معمولی بات

Scanned by CamScanner

ہے یہ مفسد رکعت نہیں بنتا اس کو بیان کر دیا اور زیادہ قصور والی چیز کو چھوڑ دیا۔ یہ کیسے معقول ہے؟ اور دوسری[۲] بات یہ ہے کہ شاید ہی کسی جاہل پاکستانی کو آپ نے ایسا کرتے دیکھا ہو کہ اس نے رکوع میں پہنچ کر تکبیر تحریمہ کہی ہو۔ تکبیر کھڑے کھڑے کہہ کر ہی جھکا کرتے ہیں۔ تو ایک جلیل القدر صحابیؓ سے آپ کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ نماز کے فرائض سے بھی بے خبر تھے؟ ہاں رکوع دون الصّف جلد بازی میں کر لی کہ صف کو پہنچنے تک شاید امام سر رکوع سے نہ اُٹھا لے۔ آپ ان کی نماز کو فاسد بنانا چاہتے ہیں خدا تعالیٰ کا خوف کیجئے۔ اور تیسری[۳] بات یہ ہے کہ اصل صحت ہی ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ مسلمان بالخصوص حضراتِ صحابہ کرامؓ نماز علیٰ الوجہ الصحیح ہی ادا کیا کرتے تھے تکبیر تحریمہ کھڑے ہو کر کہنا یہی اصل معمول ہے۔ حضرت ابوبکرہؓ سے بھی یہی توقع ہے۔ ہمیں اس کے لیے حدیث پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ حدیث تو آپ کو پیش کرنی ہو گی، کہ آپ مدعی فساد صلوٰۃ ہیں۔ خلافِ ظاہر پر چل رہے ہیں مشہور ہے: النکتۃ للفار دون القار۔ یعنی عذرداری خلافِ ظاہر چال چلنے کے لیے بیان کی جاتی ہے۔ موافق ظاہر عمومی چال کے لیے صرف تبادر کافی ہوتا ہے۔ عدالت میں بیمار کی بیماری کا سرٹیفکیٹ ڈاکٹری پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی صحت کا سرٹیفکیٹ بھی مانگا گیا ہے کہ سند پیش کرو کہ فلاں تندرست ہے۔ آپ کی مذکورہ دونوں باتیں بالکل خلافِ اصول ہیں۔ قیام میں تکبیر کہہ کر رکوع کرنے کو فرضی بات کہنا بھی غلط ہے اور اس کے لیے حدیث کی طلب کرنا بھی خلافِ اصل ہے۔ اس لیے ہم نے کہا تھا کہ آپ کے اس بے مغز قول پر آپ کے مرید یا مقلد ہاں میں ہاں ملائیں تو ممکن ہے۔ عقل مند طبقہ تو اس چال سے بیزاری ہی کرے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور چوتھی بات یہ ہے کہ حضرات محدثین شافعیہؒ جو فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں ان کی اکثریت اس طرف ہے کہ رکوع کے پا لینے سے مع الامام رکعت مل جاتی ہے۔ اس نے فاتحہ نہیں پڑھی کیونکہ اس کی روایت بھی مروی ہے اور تقابل بھی شہادت دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرہؓ کے فرمان سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ خشیت ان

Scanned by CamScanner

تفوتنی الرکعۃ۔ جلدی مَیں نے اس لیے کی کہ رکعت مل جائے اور فوت نہ ہو جائے لیکن اس کو ضابطہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ سے وہ حضرات مُستثنیٰ قرار دیتے ہیں، جیسے مصنف خیر الکلام نے بھی ابتداء میں نقل کیا ہے۔ شاید بعد میں خیال آیا کہ مُستثنیٰ تو حنفی بھی کہہ دیں گے کہ مقتدی بھی اس ضابطہ سے مُستثنیٰ ہے کیونکہ قرآن اور حدیث کے دلائل قرأت خلف الامام کے ممانعت پر قوی ثابت ہیں۔ اس لیے ان کو استثناء والی بات پسند نہ آئی اور ان کو احناف کے ساتھ مخالفت ہی میں مزہ آتا ہے۔ اس لیے دوسرا قول لے لیا کہ فلاں کہتا ہے کہ رکوع کے پانے سے رکعت نہیں ملتی اور ان کی باتوں کو اپنایا کہ ضروریہ رکعت قضاء کی ہوگی۔ نماز کے بعد پڑھی ہوگی اور اس کو مزید پختہ کر دیا کہ انھوں نے قیام بھی نہیں کیا تھا۔ ویسے رکوع کو جھک گئے تھے۔ ضرور ہے کہ وہ رکعت نہیں ہُوئی۔ اس میں جلیل القدر صحابیؓ کے عمل کا بگاڑ۔ بلکہ عام جمہوری راستے کے خلاف ہوتا ہے تو پرواہ نہیں۔ غیر مقلدی اسی کو کہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ حافظ ابنِ حجرؒ کیا فرما رہے ہیں۔ انھوں نے فتح الباری ص ۲۵۹ ج ۲ میں اسی بات کی تائید کی کہ مدرک رکوع، مدرک رکعت ہو جاتا ہے۔ اسی کو قولِ جمہور فرما رہے ہیں۔ قال حجۃ الجمھور حدیث ابی بکرۃؓ حین رکع دون الصف فقال لہ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زادک اللہ حرصًا ولا تعد ولم یأمرہ بالاعادۃ۔ اس سے جیسے حضرت امام احمدؒ کے قول کی تردید ہوتی ہے۔ (کہ وہ خلف الصّف وحدہ نماز کو فاسد کہتے ہیں) کیونکہ حضرت ابوبکرہؓ نے خلف الصّف نماز کی ابتداء کی اور حضور علیہ السّلام نے اس کو اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ ولم یأمرہ بالاعادۃ۔ بلکہ وہی نماز جس میں رکوع میں ملے تھے صحیح قرار دے دی۔ اسی طرح اس سے ان لوگوں کا قول بھی ردّ ہو گیا۔ جو کہتے ہیں کہ انھوں نے قیام ہی نہیں کیا تھا۔ رکوع میں تکبیر کہی تھی۔ ایسی نماز صحیح نہیں ہوتی جیسے مصنف خیر الکلام نے کہا ہے۔ وجہ تردید یہی لم یأمرہ بالاعادۃ ہے۔ ان کی یہ نماز صحیح ہوئی جبھی اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ خاص کر جب یہ دیکھا جائے کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نماز میں اپنے پیچھے کے لوگوں کے رکوع و سجود سے خبردار ہوتے

تھے اور یہ خاص کیفیت آپؐ کو نماز میں حاصل تھی۔ بخاری ص۱۰۲ ج۱ میں ہے: مایخفیٰ علیّ رکوعکم ولا خشوعکم وانی لاراکم وراء ظھری کہ میں تمہیں پسِ پشت دیکھتا ہوں تمہارا رکوع وخشوع مجھ سے مخفی نہیں ہوتا۔ اسی طرح ص۱۰۱ ج۱ میں بھی ہے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ رکوع کا پانے والا ہے۔ ورنہ اس کی نماز کیسے صحیح ہوگئی؟ ولم یأمرہ بالاعادۃ کے بعد یہ کہنا کہ انھوں نے اعادہ کیا ہوگا۔ محض غلط تخیّل اور جعلی اور من مانی بات ہے۔ اس کے بعد ایک اور سوال بھی ہوگا۔

اور پانچویں۵ بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ نے بقول مصنف خیر الکلام ایک ایسا بھاری جرم کیا کہ اس سے ان کی نماز میں خلل آگیا۔ قیام فرض کے تارک بنے، اور موافق حدیث بخاری ص۱۰۲ ج۱ آپ نے اسے دیکھا بھی کیونکہ انی لاراکم آیا ہوا ہے پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس پر اسے متنبہ کیوں نہیں کیا؟ جواب کی فکر کیجئے کیا یہ تقریر علی الباطل نہیں بنتی؟ معلوم ہوا کہ یہ کہنا محض غلط بیانی ہے۔ خیر الکلام کی دکان کا یہ سودا بھی کھوٹا ہی نکلا۔ اگر رکوع کے پانے سے رکعت نہیں ملتی تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی تردید کیوں نہیں کی اور اگر آپ کے قول کے مطابق حضرت ابوبکرہؓ نے بلا قیام کیے جھک کر تکبیر کہی اور آپ نے اسے دیکھا بھی تو اس کی اصلاح کیوں نہیں کی؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے جس سے وہ بَری ہیں اور آپ کا یہ کہنا ظنوا المومنین خیرًا کے بھی خلاف ہے۔ خدا معاف کرے۔

السّابع من الادلۃ حدیث السترۃ وباللہ التوفیق

ابوداؤد شریف ص۶۹ میں ہے: اذا صلّی احدکم فلیجعل تلقاءَ وجھہٖ شیئًا۔ جب کوئی نماز ادا کرے تو اپنے چہرے کے سامنے کسی چیز کو رکھ دے۔ اسی کو سترہ کہتے ہیں۔ خواہ وہ درخت ہو یا ستون۔ لکڑی ہو یا لاٹھی وغیرہ ہو اور دوسری روایت میں ہے: اذا صلّی احدکم فلیصلّ الیٰ سترۃ ولیدنُ منھا۔ یعنی سترہ کے

قریب کھڑا ہو۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے آگے سے گزرنے والے کے لیے گناہ سے بچاؤ ہو جائے۔ نمازی کو اللہ تعالیٰ سے مناجات کرنے والا کہا گیا ہے۔ آگے سے کسی کے گزرنے سے اس میں خلل آتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ کہ نمازی کی حد بندی بھی ہو جاتی ہے کہ نمازی کو چاہیئے کہ دور دراز نگاہ نہ کرے۔ نگاہ محدود مقام کے اندر رکھے نووی شرح مسلم ص۱۹۵ میں ہے: ینبغی ان یدنو من السترۃ لا یزید ما بینھما علی ثلثۃ اذرع۔ نمازی اور سترہ کے درمیان تین ہاتھ سے زائد فاصلہ نہ ہونا چاہیئے مزید فرمایا: والمستحب ان یجعل السترۃ عن یمینہ او یسارہ ولا یصمد لھا۔ یعنی سترہ کو بالکل پیشانی کے سامنے نہیں رکھنا چاہیئے۔ بلکہ کسی قدر دائیں جانب یا بائیں جانب رکھے کہ اس کو سجدہ کرنے کا شبہ نہ پڑے۔ احد کم کا لفظ عموم کے لیے آتا ہے جیسے اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا۔ اس طرح معنی یہ بن گئے۔ من یصلّ فلیجعل تلقاء وجھہ شیئًا۔ من یصلّ فلیدن من السترۃ اس میں بظاہر امام مقتدی اور منفرد سبھی داخل ہیں۔ جو بھی نماز پڑھے اس کو اپنے سامنے سترہ رکھنا چاہیئے۔ لیکن تعامل بتاتا ہے کہ یہ صرف منفرد اور امام کا مسئلہ ہے۔ امام کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کے لیے سترہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہ ان کے لیے واجب ہے اور نہ مستحب۔ دیکھئے امام بخاریؒ ص۱۷۱ ج۱ میں یہ حدیث لائے کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منیٰ میں نماز پڑھا رہے تھے۔ آپ کے سامنے کوئی چیز (یعنی سترہ) نہ تھی اور میں آگے سے گزرا۔ مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ جس کی وجہ یہی بتاتے ہیں کہ ان کا گزرنا سترہ کے حدود سے باہر تھا لیکن قوم کے سامنے کچھ سترہ نہ تھا۔ امام کا سترہ قوم کا سترہ سمجھا گیا۔ اسی کو دیکھتے ہوئے امام بخاریؒ نے باب سترۃ الامام سترۃ من خلفہ ذکر کر دیا۔ کتاب کا ص۱۷۱ مطالعہ کر لیجئے: سترۃ الامام سترۃ لمن خلفہ کی حدیث بھی مروی ہے۔ لیکن امام بخاریؒ نے اس حدیث سے استنباط کو زیادہ قوی سمجھا۔ گویا امام کا سترہ بھی حکمی طور پر سمجھا گیا۔ یعنی جماعت کی نماز وحدانی نماز بن گئی جیسے کسی نے کہا ہے۔

Scanned by CamScanner

ے ہمہ عالم چہ ارواح وچہ اجسام
بود شخص معین عالمش نام

اسی کو دیکھتے ہوئے حضرات حنفیہ کثرھم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ امام کی قرأت بھی مقتدی کی قرأت ہے یعنی جیسے سترہ امام کا تحقیقاً مقتدی کا حکماً سترہ بن گیا ہے۔ اسی طرح امام کی قرأت حکماً قوم کی قرأت بن گئی۔ نماز اگرچہ متعدد اجزاء کا نام ہے لیکن بقیہ اجزاء توابع کے درجہ میں ہیں۔ قرأت قلب کا درجہ رکھتی ہے بقیہ اجزاء قالب کا درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام اور صفت خداوندی ہے جو سب سے عالیشان ہے اسی لیے اس میں وحدانیت کی شان رکھی گئی اور بقیہ اجزاء میں اشتراک بہتر ہے کیونکہ صفتِ خداوندی میں وحدت ہی مناسب ہے۔ ہاں انفراداً نماز پڑھیں تو سب پڑھیں۔ جیسے انفراداً نماز میں ہر شخص سترہ الگ رکھے گا۔ لیکن اجتماعی صورت میں وحدانی لحاظ رکھا جائے گا۔ جیسے سترہ کا تعدّد مناسب نہیں رکھا گیا اسی طرح قرأۃ قرآن میں تعدد کی بجائے وحدت کی شان ملحوظ رکھی گئی ہے اور اس کی ادائیگی شکر گزاری اور احسانِ خداوندی ہے کہ اس نے اپنا کلام پڑھنے اور سُننے کا موقع دیا ہے۔ یہ لازماً ہر شخص کو الگ کرنا ضروری ہے اور یہ موقع شناسی عقل مندی ہے برعکس اس کے یہ بیوقوفی ہے کہ یہ کہا جائے کہ "جب امام نے قرأت کی تم نے نہ کی اور صرف سنتے رہے تو رکوع وسجود بھی امام کرے تم دیکھتے رہو"۔ یہ خالص جہالت ہے۔ کیونکہ شریعت میں جماعت کی صورت میں مقتدی کو قرأت سے ممانعت کی گئی ہے اور اس پر قرآن اور حدیث کی شہادت صادقہ آچکی ہے۔ تم رکوع وسجود کی رکاوٹ بحالتِ جماعت بتاؤ کہ یہ نہ کرو۔ صرف دیکھتے رہو۔ الحاصل حدیث سترۃ الامام سترۃ لمن خلفہ اور بیان حضرت ابنِ عباسؓ کو دیکھتے ہوئے حدیث اذا صلی احدکم فلیجعل تلقاء وجھہ شیئاً جس میں احدکم کے لفظ میں تعمیم ہے اور ابوداؤد ص۱۰۱ ج۱ کی روایت میں ہے۔ اذا صلّی احدکم الیٰ سترۃ فلیدن منھا میں تطبیق کی پہلی صورت یہ ہے کہ اس ضابطۂ شرعیہ سے کہ سترہ سامنے ہو۔ اوّل صورت یعنی جماعت والی نماز مستثنیٰ ہے۔

Scanned by CamScanner

جماعت کی صورت میں امام سے دائیں اور بائیں کافی دُور تک لوگ کھڑے ہوتے ہیں سو گز بلکہ اس سے بھی زائد فاصلہ پر ہوتے ہیں۔ مگر شارع علیہ السّلام نے ان کو اپنے سامنے سترہ رکھنے کا امر نہیں کیا اور امام کا سترہ ان سے دُور ہوتا ہے۔ اس کی طرف ان کا منہ ہو نہیں سکتا۔ تو ان کو اس ضابطہ فلیجعل تلقاء وجهه شیئاً سے مستثنیٰ قرار دے دیا ہے اور حدیث حضرت ابن عباس رضؓ اس کی شہادت دیتی ہے۔ جیسے لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب سے مدرک رکوع کو مستثنیٰ کہا جاتا ہے بلکہ بعض حضراتِ شافعیہؒ نے جس شخص سے بعض فاتحہ چھوٹ جائے یا سورت کے پڑھنے کے زمانے میں آنے والے کی کل فاتحہ چھوٹ جائے۔ ان دونوں صورتوں کو مذکورہ ضابطہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ... الخ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ مصنف خیر الکلام کی کتاب سے حوالہ گزر چکا ہے اور ہم نے عرض کیا ہے کہ جیسے یہ صورتیں مستثنیٰ ہیں اسی طرح فاتحہ کو ابتداء سے پانے والا بھی مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ وہ بھی امام کی قرأت کو سنتے ہوئے استماع نہیں کر سکتا۔ استماع کامل توجّہ سے سُننے کو کہتے ہیں اور وہ اپنی قرأت کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ سب باتیں گزر چکی ہیں اور دوسری[۲] صورت توجیہ اور تطبیق کی یہ کی جا سکتی ہے کہ کہا جائے کہ اذا صلی احدکم فلیجعل تلقاء وجهه شیئاً کا ضابطہ صرف منفرد یا امام کا مسئلہ ہے اور ان کو یہ حکم ہے اور جماعت کا حکم دوسری حدیث سترۃ الامام سترۃ لمن خلفہ میں بیان فرما دیا گیا ہے۔ دونوں ضابطے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس صورت میں کوئی ان میں تضاد نہیں پیدا ہوتا۔ جماعت کے لیے یہ ضابطۂ عمل ہے اور منفرد و امام کے لیے وہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں بعض حضرات نے توجیہ کی ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ لاصلوٰۃ الّا بفاتحۃ الکتاب یا دوسرا لفظ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کو اگر عموم پر رکھا جائے اور مقتدی کو بھی اس عموم میں لے لیا جائے تو دوسری صحیح اور صریح حدیث انما جعل الامام لیؤتمّ بہ فاذا کبّر فکبّروا واذا قرأ فانصتوا مقتدی کو فاتحہ کے پڑھنے سے منع کرتی ہے اور ان دونوں میں اختلاف پیدا ہوگا۔ اس

Scanned by CamScanner

اختلاف کو رفع کرنے کے لیے حضرت امام احمدؒ نے حضرت جابرؓ کا فرمان نقل کیا کہ یہ حدیث لاصلوٰۃ اِلّا بفاتحۃ الکتاب صرف منفرد نماز پڑھنے والے کے لیے ہے۔ یہ مقتدی کے بارے میں نہیں ہے: ان ھٰذا اذا کان وحدہ۔ ترمذی ص۷۲ امام بھی منفرد کے انداز میں ہوتا ہے۔ اسی طرح ابو داؤد ص۱۱۹ ج۱ میں حضرت امام سفیانؒ بن عیینہؒ کا قول نقل کیا گیا ہے جو اس حدیث کے راوی ہیں۔ اس وقت واذا قرأ فانصتوا کی روایت سے جس میں جماعت کا مسئلہ ہے۔ کوئی اختلاف نہیں رہتا۔ جماعت کا یہ مسئلہ ہوا اور انفرادی حالت کا وہ سابقہ جناب پیغمبرِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی انفرادی نماز کا مسئلہ بیان کیا اور کبھی جماعت کی صورت کا۔ الغرض سترہ کی حدیث اور فاتحہ خلف الامام والی دونوں میں دو طرح کے الفاظ مروی ہیں بعض دونوں کو عام رکھ کر جماعت کی صورت کو مستثنیٰ کہتے ہیں اور بعض دونوں کا محل الگ الگ بنا دیتے ہیں جیسے میں نے ابھی عرض کر دیا۔ انصاف ناظرین وقارئین کا اپنا کردار ہے۔ اس کے بعد دوسری جانب بھی نظر کیجئے۔ مصنف خیر الکلام نے دلیل ثالث ص۶۳ اور دلیل رابع ص۶۸ کے درمیان ص۶۵ پر اس سترہ والی حدیث کا تذکرہ کر دیا۔ خدا جانے انھوں نے کیا مناسبت سمجھی ان کے گھر والے ہی اس کو جانتے ہوں گے۔ الفاظ کی گردان تو ان کی کتاب میں بہت ملے گی لیکن ثمرہ شاید ہی کسی کو ملے۔ ص۶۵ پر لکھا (ایسا سترہ جو امام کے آگے ہے وہ سب کے آگے ہے۔) جناب امام کا سترہ امام کے لیے تو تحقیقاً ہے لیکن مقتدیوں کے لیے محض حکماً اور بجعل الشرع سُترہ ہوتا ہے۔ کہ قوم یعنی مقتدیوں کو اسی پر اکتفاء کرنی چاہیئے۔ ورنہ اس میں تلقاء وجھہ کی شان کہاں ہے؟ وَلْیَدْنُ مِنْھا کہاں پایا گیا ہے جیسا کہ بالکل عیاں ہے۔ وہ سب کے آگے تو صرف حکماً ہے۔ حنفیہ آپ کی یہی بات فاتحہ میں بھی جاری کریں گے۔ (فاتحہ جو امام نے پڑھی ہے وہ سب کی طرف سے پڑھی ہے۔ یہی ہماری مراد ہے۔ دیکھئے کہ جب سترہ مقتدیوں کا حکمی طور سے ہی سترہ ہے اور اصل سترہ امام کا ہے تو اسی طرح فاتحہ امام کی پڑھی ہوئی حکمی طور سے مقتدیوں کی بھی ہے پھر ان کی نماز بلا فاتحہ کیسے ہوئی؟ مصنف خیر الکلام نے سترہ کو کعبہ سے تشبیہ دے کر

Scanned by CamScanner

کہا ہے ص۶۵ (جس طرح کعبہ ایک ہے نمازی متعدد اسی طرح جماعت کی صورت میں ایک سترہ جو امام کے آگے ہے وہ سب کے آگے ہے۔ ان الفاظ کی گردان سے ان کے گھر والوں کو شاید کچھ تسلّی ہُوئی ہو لیکن ہمیں تو کوئی مناسبت ہی نظر نہیں آتی۔ کعبہ میں تو امام اور اس کے مقتدی دونوں نماز میں خاص جہت کعبہ کی طرف منہ کرنے کی نیت کرتے ہیں اور فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ۔ پر عمل کیا جاتا ہے۔ جہت کعبہ دونوں کا حقیقی طور سے قبلہ ہوتا ہے اور نماز میں حقیقی طور سے سترہ صرف امام کے سامنے ہوتا ہے نہ سترہ کی طرف لوگوں کا منہ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس کی نیت کرتے ہیں۔ ہاں شرعی حکم کے مطابق سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ امام کے سامنے ہونا ہمارے لیے بھی کافی ہے ہمیں مستقل سترہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن نماز میں جہت کعبہ کی طرف ہر ایک کا رُخ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ امام کے سامنے جو کعبہ ہے وہ ہمیں بھی کافی ہے اور مکہ مکرمہ میں جہاں کعبہ دکھائی دیتا ہے جیسے مسجدِ حرام میں نماز پڑھتے وقت تو وہاں ہر نمازی کا عین کعبہ شریفہ کی طرف حقیقۃً مُنہ ہونا ضروری ہے۔ وہاں یہ نہیں کہ امام کا ہے تو سب کا ہے لیکن سترہ میں یہ بات نہیں، دکھائی بھی دے جب بھی اس کی طرف رُخ نہیں کیا جاتا۔ آپ کی بیان کردہ تشبیہ دونوں طریقہ سے صحیح نہ ہُوئی۔ پھر اس بات کا کیا فائدہ؟ یہ محض طفل تسلّی ہُوئی۔ عاقل کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے۔ مگر ضد کا کوئی علاج نہیں۔

چنانچہ اسی ضد اور ناسمجھی کی بنا پر صاحبِ توضیح الکلام نے بھی ص۱۰۸ پر اپنے آپ کو اور جاہل معتقدین کو ایک ورق سیاہ کر کے تسلّی دینے کی سعیٔ لاحاصل کی ہے چونکہ ان صاحب کی کوئی خاص علمی حیثیت نہیں۔ نیز یہ ہمیشہ ایسی ابحاث میں اپنے حضرت الاستاذ مصنف خیر الکلام کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں اور قارئین کو اپنے دامِ مکاری میں پھنسانے کے لیے حضرت الاستاذ کے کلام میں لفظی ہیر پھیر کر کے نیز انہی کی عبارات میں تقدیم و تاخیر کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں اور اس دجل و فریب کے باوجود بھی چونکہ ان کی کم علمی کا ظرفِ خام عین چوراہے میں پھوٹ جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

اس لیے ان بے چاروں کے ساتھ ہمیں تعرض کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں اور ان کا پارۂ غضب چڑھانے کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے۔ جب انکے استاذ کی تاویلاتِ خودِ ساختہ کارگر نہ ہوئیں تو یہ کس شمار میں ہیں؟ خدا تعالیٰ ان کو مغلوب الغضب ہو کر سوچنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے سوچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس مقام پر پہنچ کر مصنف خیر الکلام فاضل جماعت کی دیانتداری اور علمی ذمہ داری کا اندازہ بھی کر لیجئے کہ قوم کو کیسے اندھیرے میں ڈال گئے ہیں؟ خیر الکلام ص۴۹۱ پر لکھا بالفرض اگر حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ صحیح بھی ہو۔ تب بھی اس کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ امام کی قرأت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے۔ (مختصراً) اور پھر اس پر حضرت مولانا عبدالحیؒ کی عبارت کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ مولانا عبدالحیؒ لکھنوی نقل فرماتے ہیں۔ ومعنی کون قرأۃ الامام قرأۃ حکمیۃ للمقتدی ان الشارع جعلہ فی حکم القاری لقرأۃ امامہ واعطاہ ثوابہ۔ بحوالہ عمدۃ القاری ص۴۹۱ مشہور ہے کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ مصنف خیر الکلام نے ص۶۲ میں جامع البیان کی عبارت لکھی اور اس کا یہ ترجمہ کیا۔ کسی کو دوسرے کے فعل کا ثواب نہیں ملتا... الخ اور یہاں حدیث مذکور کے معنی کی تحریف کر کے لکھتے ہیں۔ اس کا مفہوم اس قدر ہے کہ امام کی قرأت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے۔ دونوں باتوں میں ایک ہی سچی ہو سکتی ہے۔ یہ ان کی اس عبارت کے سلسلہ میں پہلی غلطی ہے اور دوسری غلطی یہ کی ہے کہ حضرت مولانا عبدالحیؒ کا کلام اپنی بات کی تائید کے لیے پیش کیا کہ اس کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ امام کی قرأت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے حالانکہ مولانا مرحوم کی عبارت میں دو باتیں ہیں۔ ۱: ان الشارع جعلہ (المقتدی) فی حکم القاری۔
۲: واعطاہ ثوابہ۔ مگر مصنف خیر الکلام نے اپنی دائیں آنکھ کو بند کر دیا ہے۔ کیوں جناب! ان کی عبارت میں ان الشارع جعلہ فی حکم القاری لقرأۃ امامہ کا لفظ بھی ہے یا نہیں؟ اور کیا اس جملہ میں امام کے

Scanned by CamScanner

پڑھنے کو حکماً مقتدی کا پڑھنا نہیں کہا گیا ؟ پھر آپ نے صرف ثواب کا ملنا کیوں کہا؟ واعطاہ ثوابہ تو معطوف ہے۔ یہی کچھ حنفیہ کرامؒ بھی فرماتے ہیں جو ان کے مولانا عبدالحیؒ نے فرمایا ہے اور آپ نے اس کو چھپا لیا بلکہ کھا لیا ہے کہ مقتدی کا وظیفہ بجائے قرأت کے استماع اور انصات خلف الامام شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے بنایا اور بتایا ہے اور مقتدی حکماً قاری ہے اور اس میں خاص و غیر معمولی شرعی مصلحت اور حکمت مرعی ہے لہٰذا مقتدی کی نماز فاتحہ سے خالی نہ ہوئی۔ جیسے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ معرکۂ بدر میں حاضر نہ ہونے کے باوجود بدری شمار کیے جاتے ہیں کیونکہ ان کو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے بعذر خاص گھر پر رہنے کا حکم دیا تھا اور وہ بحکم شرع حاضریٔ جنگ سے ممنوع ہوئے اور اس کے باوجود بدری بھی بنے، اور غنیمت کا حصّہ بھی پایا۔ اسی طرح مقتدی بعذر شرعی قرأت خلف الامام سے منع کیے گئے ان کو امام کی قرأت کے وقت فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کا حکم دیا گیا۔ لہٰذا یہ بھی قاری ہی کہے جائیں گے اور ان کو باقاعدہ ثواب بھی ملے گا۔ حکماً قاری ہونے اور ثواب ملنے میں کوئی منافات نہیں ہے۔ آپ لوگوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ قاری صرف امام ہے۔ کیا حضرت عثمانؓ بدری نہیں ہیں ؟ اور کیا وہ بدر کے میدان میں حاضر تھے ؟ یہ حکمی طور کی حاضری ہے تو وہ جس طرح بحکم الشرع وہ بدری ہیں اسی طرح مقتدی کو شارع نے فی حکم القاری فرمایا ہے۔

اس کے بعد خیر الکلام صـ۶۲ کے الفاظ کو پڑھیں۔ فرائض میں جہاں نیابت کا ذکر ہے وہاں عذر شرط ہے مقتدی معذور نہیں وہ قرأت کر سکتا ہے پس امام کے پڑھنے سے وہ کیسے بریٔ الذمہ ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ یہ تو "زمین جنبد بجنبد نہ جنبد گل محمدؐ" والا قصہ ہے۔ قرأت کر سکنے سے کیا مراد ہے ؟ اگر بدنی صحت اور زبان کی طاقت سے قرأت کرنا مراد ہے تو رکوع کی حالت میں ملنے والے کے لیے آپ نے کیسے یہ کہہ دیا ہے کہ اس سے قرأت فاتحہ کی ساقط ہو جاتی ہے۔ آپ نے صـ۴۵ پر یہ لکھا ہے "رکوع میں قرآن پڑھنا منع ہے" یہ منع تو شرعی عذر ہے

ایسا عذر تو مقتدی کے لیے بھی واذا قرأ فانصتوا کی حدیث میں آچکا ہے۔

الحاصل شرعی عذر دونوں میں ہے اور زبانی صحت اور طاقت سے پڑھنا دونوں میں ہوسکتا ہے، پھر مدرک رکوع کو مستثنیٰ کرنا اور بدونِ فاتحہ پڑھے ہوئے اس کی رکعت کا ہو جانا اور ابتداءً فاتحہ میں ملنے والے کے لیے نفسِ قدرت کا ہونا اور اس کا معذور نہ ہونا۔ کہ اس کی نماز نہ ہوگی اور مدرک رکوع کے بارے کہنا کہ اس کی رکعت ہو جائے گی دونوں میں وجہ فرق کیا ہے؟ مگر وجہ فرق معقول ہو صرف ہوائی فائر نہ ہو۔

اعذار فاسدہ کا بیان اور تحریف حدیثِ نبوی صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم

کبھی ضد اور عناد انسان کو غیر شعوری طور پر ایسی بے اعتدالی پر آمادہ کر دیتے ہیں کہ عقلمند حیرت میں رہ جاتا ہے۔ ابھی آپ کے سامنے مثال آرہی ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہٗ قرأۃ۔ اسکی متعدد سندیں ہیں مصنف خیر الکلام نے ص۴۲۷ میں فرمایا (کہ حفاظ حدیث نے یہ حدیث مرسل بیان کی ہے: شعبہؒ، سفیانؒ ثوری، ابنِ عیینہؒ سب مرسل بیان کرتے ہیں۔ کیوں جناب! آپ کی ترمذی والی حدیث جو ابنِ اسحاقؒ عن مکحولؒ عن محمودؓ بن الربیعؓ عن عبادہؓ کی سند سے مروی ہے، اسے پانچ حفاظ حدیث مرسل ہی بیان کرتے ہیں۔ سب سند مکحولؒ عن عبادہؓ نقل کرتے ہیں۔ بیہقی کو دیکھ لیں تفصیل انشاءاللہ تعالیٰ اپنے موقع پر آنے والی ہے۔ تو وہ کیسے مستدل بنی؟ پھر ص۴۷۳ پر آپ یہ لکھتے ہیں: "اس جواب میں یہ کمزوری ہے کہ جابرؓ کا ذکر شاذ ہے کیونکہ جماعت نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ شاذ روایت میں راوی کے ثقہ ہونے کا ذکر کرنا صحیح نہیں ہوتا۔"

مصنف خیر الکلام اپنے گھر کا حال بھی دیکھ لیں: ابنِ اسحاق والی مذکورہ روایت میں محمود بن الربیع کا ذکر شاذ ہی ہے۔ موقع پر تفصیل آئے گی۔ پانچ راوی حدیث کی سند مکحولؒ عن عبادہؓ مرسل طور سے نقل کرتے ہیں اور چار راوی مکحولؒ عن نافعؒ بن محمودؓ عن عبادہؓ نقل کرتے ہیں۔ محمد بن اسحاق کی روایت ان سب نو (۹) حضرات کے مخالف اور شاذ ہے

Scanned by CamScanner

تفصیل اپنے موقع پر آنے والی ہے۔ اس کے بعد آپ کا محمد بن اسحاق کو بزور ثقہ ثابت کر کے گلو خلاصی کرانا بالکل بے قاعدگی ہے اور اگر وہ آپ کے ہاں ثقہ ہو بھی تو بقول آپ کے شاذ روایت میں راوی کے ثقہ ہونے کا ذکر کرنا صحیح نہیں ہوتا۔ خیر الکلام ص۴۷۳ کی عبارت کو پھر پڑھ لیں۔ اور نافع بن محمود مجہول من الثالثہ ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے تصریح کی ہے، موصول صرف ابنِ اسحاق بیان کرتے ہیں لہٰذا یہ شاذ ٹھہری۔ اس کے علاوہ ترک القراءۃ خلف الامام کا مسئلہ صرف اسی حدیث سے ثابت نہیں۔ بلکہ وہ تو آیتِ کریمہ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا اور حدیثِ نبویؐ وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا اور دیگر صحیح احادیث سے ثابت ہو چکا ہے۔ یہ حدیث من کان لہ امام ... الخ تو تائیدی درجہ میں ہے۔ مصنف خیر الکلام فاضل جماعت نے بالکل بے سود کتاب کے صفحات سیاہ کر کے اپنے ہاتھوں کو تھکایا ہے اور سُنئے! ص۴۷۴ میں انھوں نے لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ جس قدر حافظہ کی ضرورت ہے ان کا مقام اس سے نیچے ہے۔ مصنف خیر الکلام کے اس عناد، بغض اور خالص جھوٹ پر ہزار بار افسوس۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کو دُنیا میں ایسی مقبولیتِ عامہ حاصل نہ ہوتی مگر ان کا مذہب ہر زمانہ اور ہر جگہ میں سُورج کی طرح روشن پایا گیا ہے اور غیر مقلدوں کا جماعتی وجود تو انگریزی دَور سے پہلے کہیں نظر نہیں آئے گا اور انہی ممالک میں ان کا وجود ہے جو بلاواسطہ یا بالواسطہ انگریز کے زیرِ اثر رہے ہیں، اب بھی ماشاءاللہ وُہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ اکثر ملکوں میں تو ان کا نام ونشان ہی نہیں ملتا۔ ہاں ہندوستان سے بھاگے ہُوئے کہیں کہیں ملیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی باتیں بعض متعصبین شافعیہؒ نے کہہ دی ہیں اور یہ لوگ ان کو اپنی جھولی میں ڈالے ہوئے ہیں۔ السہم المصیب فی کبد الخطیب اسی ضرورت سے لکھی گئی ہے۔ ایک شخص نے مجھے کہا کہ اگر تقلید ضروری ہوتی تو امام بخاریؒ کیوں نہ کرتے؟ میں نے اسے کہا کہ جب تم امام بخاریؒ کے درجہ تک پہنچو گے تم بھی نہ کرنا۔ لیکن اگر شارح بخاری حافظ ابنِ حجرؒ کے مقام تک پہنچ سکے تو پھر بھی کرنی پڑے گی۔ وہ اس تبحرِ علمی کے باوجود تقلید سے مستغنی نہیں ہُوئے۔ اپنے کو شافعی المسلک بنائے رکھّا اور آج کے زمانہ کے غیر مقلدین ان کی تصنیف "بلوغ المرام" پڑھ کر

کسی کو اپنے سے بڑا نہیں سمجھتے جو وکیل کے درجہ میں نہیں ہوتے مگر چیف جسٹس ہائیکورٹ بن جاتے ہیں اور بڑوں پر تنقید کر کے خود بڑا بننا چاہتے ہیں۔ تقلید یہی چیز ہے کہ ماتحت عدالتوں کو ہائی کورٹ کے فیصلوں کی پابندی کرائی جاتی ہے۔ کتابیں تو غیر مقلدوں کے پاس بھی ہوتی ہیں لیکن ان کی سمجھ اور چیز ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی جماعت کی تقلید کرتے ہیں خواہ علمی حیثیت اس کو حاصل ہو یا نہ ہو۔ یہ باتیں ضمنی طور سے آگئی ہیں۔ آگے فاضل اہلِ حدیث کی کرم فرمائی ملاحظہ کریں۔ انھوں نے خیر الکلام ص۴۹۴-۴۹۵ میں لکھا ہے: قیل یحتمل ان المراد من کان لہ امام فلیقرأ لقرأتہ فان قرأۃ الامام قرأۃ لہ فلیقرأ لنفسہ اور اس سے پہلے ص۴۹۱ پر لکھتے ہیں۔ بالفرض اگر یہ حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ الامام صحیح بھی ہو تب بھی اس سے فاتحہ خلف الامام کی نفی نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی لفظ نہیں جس سے ممانعت کا مفہوم نکلتا ہو، اس کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ امام کی قرأت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے... الخ۔ گزشتہ گزر چکا ہے کہ یہ حدیث ثواب ملنے کے بارے میں نہیں آئی بلکہ حدیث نفس قرأت امام کا جو تحقیقی قرأت ہے حکمی طور سے مقتدی کی قرأت ہونا بتا رہی ہے۔ جیسے کہ پہلے امام کا سترہ تحقیقاً مقتدی کا سترہ بن جانا بتایا گیا ہے سترۃ الامام سترۃ لمن خلفہ۔ یعنی امام کے سامنے اگر سترہ ہو تو مقتدی کو سترہ رکھنے کی حاجت نہیں۔ وہی امام کا سترہ ہی شرعی طور پر مقتدی کا سترہ قرار دیا گیا ہے۔ جیسے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں تھا کہ صرف امام کے سامنے سترہ تھا۔ قوم کا سترہ وہی سمجھا گیا۔ اسی طرح قرأت صرف امام کرے گا اور وہی مقتدی کی قرأت بھی سمجھی جائے گی۔ کیونکہ مقتدی کو تحقیقی قرأت کرنا استماع مأمور اور انصات لازم نقصان دِہ بنتا ہے۔ اس لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب کی ادائیگی کی ذمہ داری مقتدی کے لیے اسی حکمی قرأت میں قرار دے دی گئی ہے۔ اسی لیے مقتدی کے لیے وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے بعد اٰمِیْن کہنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ حکمی قرأت میں اس کی شمولیت ہو جائے۔ جیسے کہ حضرت موسےٰ علیہ السّلام نے رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰی اَمْوَالِھِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کی بددعا کی اور حضرت ہارون علیہ السّلام نے اس پر آمین کہی تو فرمانِ الٰہی نازل ہوا قَدْ اُجِیْبَتْ

دَعْوَتُكُمَا اس میں دونوں کو دعا کنندہ کہا گیا ہے۔ حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام نے صرف آمین کہی تھی۔ معلوم ہُوا کہ آمین کہنے والا حکماً قاری ہوتا ہے۔ فتح الباری ص۱۷۸ ج۲ میں حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا: كَانَ مُوْسٰى دَاعِيًا وَهَارُوْنَ مُؤَمِّنًا۔ رواہ ابن مردویہ یعنی حضرت موسیٰؑ نے دُعا کی اور حضرت ہارون علیہ السّلام نے آمین کہی۔ (علیہما الصّلوٰۃ والسّلام) اور ظاہر ہے کہ امام دُعا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ بصیغہ جمع پڑھتا ہے۔ اسی طرح اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ جمع کے صیغوں سے دُعا استعانت کرتا ہے یہ قرأت دعا کی جو کلامِ الٰہی میں ہے صرف اپنے لیے ہی نہیں کرتا بلکہ آمین کہنے سے اس پر قوم کے دستخط بھی ثبت ہو گئے۔ قوم کو خود عرض و معروض کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ یہی معنی ہیں فرمانِ رسالت کا قرأۃ الامام قرأۃ لہٗ۔ اس صورت میں قرآن کریم کا ادب احترام استماع اور انصات بھی حاصل ہو گیا اور مقصد میں قوم کی شمولیّت بھی ہو گئی۔ اپنے پڑھنے سے استماع و انصات میں بھی کمی آتی ہے۔ غور فرمائیں کہ امام بن کر حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی پڑھی ہُوئی یہ دُعا قوم کے لیے بہتر ہے یا ہر ایک کی اپنی اپنی دُعا بہتر ہے؟ اس کے بعد اس کے کیا معنی کہ اے مقتدی تو خود پڑھ امام نے تو اپنے لیے پڑھا ہے؟ من کان لہ امام فلیقرأ لنفسہٖ۔ یعنی امام کی قرأت تو اپنے لیے ہے، اے مقتدی تم خود اپنے لیے دعا مانگو اور قرأت کرو۔ (خیر الکلام ص۴۹۴) اس کے علاوہ یہ بھی سوچیں کہ آپ تو اس میں مقتدی کو حقیقی قرأت کرنے کا حکم دیتے ہیں کہ امام کے ساتھ وہ خود بھی پڑھا کرے پھر حضور علیہ السّلام نے ضابطۂ جماعت و امامت بیان کرتے وقت یہ الفاظ کیوں نہ فرمائے انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا، واذا قرأ فاقرؤا لقرأتہٖ۔ جیسے آپ نے کہا ہے اس کو چھوڑ کر آپؐ نے اذا قرأ فانصتوا کیوں فرما دیا؟ یہ تو فاقرؤا لقرأتہٖ کے منافی ہے۔ بلکہ یہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ کے بھی مخالف ہے۔ امام رازیؒ کی عبارت کو پھر سے دیکھیں جس کی گزشتہ نقل گزر چکی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھیں کہ سترہ کے مسئلہ میں امام بخاریؒ نے ص۱۰۷ ج۱ میں سترۃ الامام سترۃ لمن خلفہ کا ترجمۃ الباب قائم کیا ہے جس کا

Scanned by CamScanner

دوسرا عنوان من کان لہ امام فسترۃ الامام لہ سترۃ ہوگا اس میں لَہٗ کی ضمیر جو خبر کی جانب میں ہے مَنْ کی طرف راجع ہے جو ابتدأ میں آچکا ہے اور وہ مقتدی سے تعبیر ہے یعنی صحیح بن جاتے ہیں۔ جیسے امام بخاریؒ کے بیان میں ہے یہ ضمیر یہاں امام کی طرف راجع نہیں ورنہ سترۃ الامام لِلْامام کے معنی بن جائیں گے۔ اس میں کوئی تقدیر کی حاجت نہیں رہتی تو اس طرح فاتحہ والے کلام مذکور میں کیوں نہیں کیا جاتا؟ کیوں وہاں دو جگہ فلیقرأ لنفسہٖ مقدر مانا گیا ہے اگر مقدر ہی نکالنا ہے تو لا یقرا یقرأ تہٖ نکالنا چاہیئے کیونکہ قرأت نہ کرنے کے قوی دلائل موجود ہیں۔ ھل قرأ معی احد؟ بطریقِ انکار۔ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا۔ وغیر ذٰلک۔ جن کا ذکر ہو چکا ہے یعنی من کان لہ امام فلا یقرأ لقرأتہٖ فان قرأۃ الامام قرأۃ للمأموم اولمن خلفہٖ یہی صحیح بنتا ہے۔

الحاصل: حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہٗ قرأۃ۔ کلام تام ہے ضمیر جزا میں جو خبر مبتدا بھی ہے۔ مَنْ کی طرف راجع ہے اور مَنْ سے مُراد مقتدی ہے۔ معنی یہی ہیں۔ امام کی حقیقی قرأت مقتدی کے لیے حکمی قرأت ہو جاتی ہے اس کو مستقل قرأت کی حاجت نہیں ہے۔ یہی حضرت مولانا عبدالحیؒ کے کلام کی مراد ہے جو خیر الکلام کے ص۴۹۱ میں نقل کیا گیا ہے یعنی کون قرأۃ الامام قرأۃ حکمیۃ للمقتدی لان الشارع جعلہٗ فی حکم القاری لقرأۃ امامہ۔ آپ کا یہ شاہد آپ کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔ اسی کا گزشتہ شکوہ بھی کیا گیا تھا کہ مصنف خیر الکلام اس کو کھا پی گئے ہیں اور اس کا معطوف واعطاہ ثوابہ ذکر کر گئے ہیں اور معطوف علیہ کو چھپا گئے ہیں۔

اطلاع: مذکورہ حقائق معلوم ہو جانے کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ مصنف خیر الکلام فاضل جماعتِ اہلِ حدیث کا ص۴۹۵ پر یہ لکھنا: "ضمیر کا ظاہر ہونا ضروری نہیں، بلکہ ضمیر مقدر بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے البر منوان بدرھم ضمیر مقدر ہے یعنی منہ بدرھم" اسی طرح جو لکھتے ہیں: پس فلیقرأ جو مقدر نکالا گیا ہے اس میں ضمیر موجود ہے۔ یہ دونوں باتیں بے سُود کہی گئی ہیں یا انھوں نے مقام کو نہیں سمجھا یا مغالطہ دے رہے

ہیں۔ گزشتہ تقریر میں یہ نہیں کہا گیا کہ ضمیر جملہ جزائیہ میں ضرور مذکور ہوتی ہے یا خبر جملہ مبتدائیہ ہو تو اس میں ضمیر کا لفظوں میں ہونا ضروری ہے تاکہ کہا جائے کہ منوان بدرھم میں کہاں مذکور ہے؟ اسی طرح آیتِ کریمہ میں ضمیر مقدر نکالی گئی ہے اور زمخشری نے بھی تقدیر نکالی ہے ایسے ہی ہم بھی نکال سکتے ہیں۔ فلیقرء نفسہ جیسے مصنف خیر الکلام ص۴۹۵ میں کہہ رہے ہیں۔ یہ سب باتیں بے محل اور عجلت پر مبنی ہیں۔ یہ مقدر کرنا محض مطلب سازی کے لیے کیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ حنفیہ کرام کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ جزاء یا خبر جملہ ہو تو اس میں ضمیر مبتدا کی طرف رابطہ ہوتی ہے اور وہ ضمیر فقرأۃ الامام قرأۃ لہٗ میں موجود ہے۔ اس کا مرجع لفظ مَنْ صدر میں ص۴۹۱ مذکور ہے۔ جس کا معنے قرأۃ الامام قرأۃ لِلمقتدی بن جاتا ہے۔ یہ بنفسہٖ کلام تام ہے، کسی تقدیر کی حاجت نہیں۔ تم نے لہٗ کی اس ضمیر کو امام کی طرف راجع کر دیا۔ رابطہ مبتداء سے کٹ گیا۔ اسی لیے کسی نے فلیقرء اوّل جملہ مَنْ کان لہ امام میں خبر بنا کر مقدر کہہ دیا۔ اسی طرح آخر میں پھر یہ لفظ مقدر نکال دیا۔ یہ دونوں بلا ضرورت نکالے گئے۔ جیسے سترۃ الامام لمن خلفہٗ ٹھیک ہے۔ بعینہٖ اسی طرح قرأۃ الامام قرأۃ لمن خلفہ بھی ہو گیا۔ اسی طرح دوسرا عنوان من صلّی مع الامام فسترۃ الامام لہٗ سترۃ۔ من صلّی مع الامام فقرأۃ الامام لہٗ قرأۃ بھی ہے۔ اگر سُترہ والے عنوان میں لہٗ کا مرجع امام نہیں ہے تو قرأت والے میں بھی یہی کچھ کرنا ہوگا۔ سمجھ کے ساتھ انصاف کی بھی ضرورت ہے۔ حافظ ابنِ کثیر مفسّر کبیر رحمہ اللہ تعالیٰ ص۳۲ ج۱ میں فرماتے ہیں: فَدَلَّ[1] عَلٰی اَنَّ مَنْ اَمَّنَ عَلٰی دُعَاءِہٖ فَکَاَنَّمَا قالہ ولھٰذا قال من قال ان المأموم لایقرء لان تامینہٗ علیٰ قرأۃ الفاتحۃ بمنزلتہ قرأتھا۔ یعنی مقتدی کا امام کی قرأت کے بعد آمین کہہ دینا ایسا ہے جیسے اُس نے خود قرأت کر دی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مقتدی قرأت نہ کرے یہ آمین کہنا ہی قرأت ہے۔ جیسے حضرت ہارون علیہ السّلام کے قصّہ میں گزرا۔

---

[1] فَدَلَّ ذٰلِکَ

الثامن من الادلة قرأة التشهد فی قیام الثالثة

ابوداؤد باب من قام من الثنتین ولم یتشهد ص۱۴۸ میں ہے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے کسی نماز میں دو رکعتوں پر بیٹھنا تھا سہو ہو گیا، تیسری کے لیے کھڑے ہو گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم بھی تابعداری میں کھڑے ہو گئے تشہد کا پڑھنا رہ گیا۔ بعض صحابہ کرامؓ نے فوت شدہ تشہد کھڑے ہوئے پڑھ لیا۔ یعنی تیسری رکعت کے قیام میں فاتحہ کی جگہ انھوں نے اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ ... الخ پڑھا۔ روایت میں ہے کَانَ مِنَّا الْمُتَشَهِّدُ فِیْ قِیَامِهٖ۔ ہم میں سے بعض نے قیام میں تشہد پڑھا۔ امام تو اس وقت فاتحہ پڑھتا ہو گا کہ تیسری رکعت ہے اور انھوں نے فوت شدہ تشہد پڑھا۔ انداز دونوں کا برابر ہے امام فاتحہ سے فارغ ہوا ہو گا۔ یہ تشہد سے فارغ ہوئے ہونگے، اس کے بعد رکوع کیا ہو گا۔ اس صورت میں ان مقتدیوں نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ فاتحہ کا پڑھنا ہر رکعۃ میں فرض کہا جاتا ہے

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فتح ص۶۴ ج۲ میں فرماتے ہیں: واستدل بہٖ علیٰ وجوب الفاتحۃ فی کل رکعۃ بناءً علیٰ ان کل رکعۃ صلوٰۃ وفی روایۃ لاحمد وابن حبان وافعل ذٰلک فی کل رکعۃٍ۔ ہر رکعۃ میں فاتحہ پڑھا کرو۔ اب اوّل سوال یہ ہے کہ ان حضرات صحابہ کرامؓ کی یہ نماز کیسے ہوئی؟ فاتحہ اس رکعت میں نہیں پڑھی گئی۔ دوم یہ کہ ان حضرات کو فاتحہ کی جگہ تشہد پڑھنے کا خیال کیسے آیا؟ فرض فاتحہ کو چھوڑ کر تشہد کا پڑھنا کیسے معقول ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات فاتحہ خلف الامام پڑھنے کے قائل ہی نہیں تھے اسی لیے تیسری رکعت میں بجائے خاموش رہنے کے فوت شدہ تشہد کا پڑھنا خیال میں آیا۔ یہ بھی خیال فرمائیں کہ تیسری رکعت سری نماز ہے اس میں وہ جب فاتحہ خلف الامام پڑھنے کے قائل نہیں تھے تو جہری رکعات میں امام کے پیچھے کیسے فاتحہ پڑھتے ہوں گے؟ اس میں استماعِ واجب کا نقصان بھی آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حضرات صحابہؓ فاتحہ خلف الامام کے قائل ہی نہیں تھے۔

کہا جاتا ہے حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سہو نماز میں رحمتِ خداوندی سے ہوا

Scanned by CamScanner

کہ لوگ سہو کے مسائل اس سے معلوم کرلیں گے ۔ ہمارے خیال میں ان حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا سہو (تشہد قیام میں پڑھنا) بھی اسی انداز میں ہُوا کہ لوگ معلوم کرلیں کہ فاتحہ خلف الامام فریضہ نہیں ہے تارک فاتحہ کی نماز ضائع نہیں ہوتی ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اپنے عموم پر نہیں ۔ مقتدی اس عموم میں نہیں لیا گیا ۔ اسی لیے حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے الا ان یکون وراء الامام کی استثنا نقل کی ہے ۔ اسی لیے مؤطا امام مالکؒ میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا عمل ترک الفاتحہ خلف الامام نقل کیا گیا۔ بخاری کی یہ روایت پڑھ کر لوگوں کو دھوکہ میں ڈالنا دیانت داری نہیں ۔ واللہ اعلم ۔

تنبیہ : خیر الکلام ص۴۵۲ میں ہے ۔ امام قیام کا متحمل نہیں ہوتا کیونکہ وہ رکن ہے اب سوال ہوگا کہ اگر قیام کا متحمل اس لیے نہیں کہ وہ رُکن ہے ۔ تو قرأت کا کیسے متحمل ہوسکتا ہے حالانکہ وہ بھی ان کے ہاں رکن ہے ۔ یہ کہنا کہ حنفیہ کو اپنا مذہب سمجھنے میں غلطی لگی، دھوکہ لگا ہے ۔ یہ محض غلط بیانی کی ہے ۔ صاحب الدار اعلم بما فیہ کا مقولہ مشہور ہے ۔ مسلّم اصُول ہے حنفیہ کو دھوکہ نہیں لگا ، دھوکہ آپ کو لگا ہے آپنے مدار صرف رکنیت پر رکھ دی اور دوسروں پر اینٹ پتھر پھینکنے شروع کر دیتے حنفیہ کہتے ہیں کہ قرأت کا عمل ثابت ہے اور قیام کا ثابت نہیں ۔ بدون فاتحہ کے مقتدی کی نماز ہوجاتی ہے ۔ خواہ کہو مقتدی مستثنیٰ ہے اس پر فرض نہیں ، خواہ کہو مقتدی سے ساقط ہوجاتی ہے ۔ آپ کا یہ کہنا کہ امام قرأت کا کیسے متحمل ہوسکتا ہے حالانکہ وہ رکن ہے ۔ یہ محض مغالطہ ہے ۔ آپ کا گواہ آپ کے خلاف شہادت دیتا ہے ۔ کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ فاتحہ مقتدی پر فرض ہے ۔ لیکن اگر مقتدی بعض فاتحہ پڑھے جانے کے بعد امام سے ملا یا کل فاتحہ کے بعد آیا تو ان دونوں صورتوں میں امام اس کی فاتحہ کا متحمل ہوجاتا ہے ۔ وہ فاتحہ مقتدی کی بھی بن جاتی ہے ۔ ص۴۶۰ اِلّا اِذَا کَانَ مُستَجمعًا بجمیع الفاتحۃ اَو بِبَعضِھَا فان الامام یحتمل عنہ ۔ گزشتہ گزر چکا ہے کہ جب بعض فاتحہ یا کل کے پڑھے جانے کے بعد آنے والے کے لیے امام کی قرأۃ بس کرتی ہے تو اوّل سے ملنے والے کے لیے

بھی کفایت کرسکتی ہے کیونکہ اس وقت مقتدی کا پڑھنا استماعِ مامور میں اور انصات واجب میں نقصان دہ بنتا ہے۔ یہ بھی عذر ہے۔

التاسع من الادلۃ کون قرأۃ الفاتحۃ فی الجماعۃ کالمبایعۃ

شریعت کے اصول سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی حالات کے مسائل کا اجتماعی سے فرق کیا گیا ہے۔

۱ ستترۃ: میں آپ نے معلوم کرلیا کہ اکیلے نماز پڑھنے والے کو حکم دیا گیا کہ اپنے سامنے سترہ رکھے تاکہ سامنے سے کسی گزرنے والے کو حرج نہ ہو اور نماز میں نگاہ کی حد بندی بھی ہو جائے لیکن جماعت کی صورت میں صرف امام کے سامنے ہونے پر اکتفا کی گئی۔ مقتدی کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ تفصیل گزر چکی۔

۲ اسی طرح سلام دینا عند الملاقاۃ: اگر انفرادی طور سے ہو تو جواب واجب ہو جاتا ہے اِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَا اَوْ رُدُّوْھَا کا حکم دیا گیا لیکن اگر جماعت پر سلام دیا جائے تو سب کو جواب دینا لازم نہیں رہتا۔ ایک کا جواب دے دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ نووی مسلم شریف ص۲۱۳ میں ہے کہ ہر سننے والے کو مستقل جواب دہی (جواب دینے) کی ضرورت نہیں رہتی۔ حالانکہ آیتِ کریمہ کے الفاظ بظاہر ہر سننے والے کو حکم دیتے ہیں۔ لیکن جماعت کو مثل شخص واحد کے سمجھ کر ایک کی جواب دہی کافی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حنفیہ کرام قرأت فاتحہ کے بارہ میں کہتے ہیں کہ لفظ حدیث کے لَاصلوٰۃ لمن لم یقرأ اگرچہ بظاہر عام سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اجتماعی صورت میں ایک امام کی قرأت پر اکتفا کا حکم دیا گیا: اذا قرء فانصتوا۔ اس وقت عموم الفاظ کی رٹ لگانا بے کار ہوگا۔ کیا فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَا میں عموم اور شمول پر دلالت نہیں؟ کیا آپ ہر سلام کے سننے والے پر جواب دہی واجب بتا سکتے ہیں۔

۳ اسی طرح بیعت کا مسئلہ بھی ہے۔ کوئی شخص کسی شیخ کی بیعت کرنا چاہے۔ کلماتِ بیعت کے بولنے ہوں گے۔ اگر ایک جماعت کی بیعت کا مقام ہو تو ان کے ایک

نمائندہ کی تعبیر سب کی جانب سے کافی ہو گی۔ امام بھی قوم کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ سب کی جانب سے کہتا ہے۔ نمائندگی کرتا ہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ میں حاجت کا سوال بھی سب کی جانب سے کرتا ہے پھر آخر میں سب لوگ آمین کہہ کر دستخط بھی کر چکتے ہیں، درخواست بھی جب سب کی ایک ہی ہے تو سب کو الگ الگ پیش کرنے کی حاجت ہی کیا رہی ؟ ہاں اظہارِ عبدیّت سب نے کرنا ہے۔ رکوع سجود اظہار عبدیّت ہے۔ یہ آدابِ شاہی سب نے ادا کرنے ہیں۔ یہ جہالت کی بات نہ کہیں کہ قرأت جب امام کے سپرد کر دی گئی تو رکوع وسجود بھی وہی کرے تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ایسی کھری باتیں اگرچہ ضدّی طبائع کو پسند نہیں ہوتیں لیکن اس کی وجہ سے حق گوئی کو نہیں چھوڑا گیا، نہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ منصف مزاج لوگ بھی دُنیا میں بستے ہیں۔ سورت فاتحہ میں خداوند تعالیٰ کی صفت وثناء کر کے سب کی جانب سے اس سے حاجت طلب کی گئی۔ اس کے بعد اسکی شکر گزاری کے لیے رکوع وسجود کیا گیا۔

اس کے بعد ایک واقعہ بطورِ مثال کے عرض کرتا ہوں تاکہ ضدّی لوگوں کے لیے بھی سامانِ عبرت بن جائے۔ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ کے بعد وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ آچکا ہے ہم نا اُمّید نہیں ہیں۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی۔

ایک موقع پر حضور نبیٔ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لیتے ہُوئے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی: اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنَاتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ ... الخ۔ اس کے خاتمہ پر فرمایا: اَنْتُنَّ عَلٰی ذٰلِکَ۔ (تم سب اس عہد پر ہو) سب کو یہ قبول ہے۔ سب نے جواب دینا تھا کہ ہمیں یہ عہد قبول اور منظور ہے۔ بیعت جبھی تمام ہوتی کیونکہ خطاب پوری جماعت کو ہے۔ اَنْتُنَّ عَلٰی ذٰلِکَ۔ لیکن جواب صرف ایک عورت نے سب کی نمائندگی کرتے ہُوئے دیا: نَعَمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ۔ اس کا نَعَمْ کہنا سب کی جانب سے بیعت کرنا سمجھا گیا۔ بخاری شریف صـ ۱۳۳ ج ۱ میں قَالَتْ اِمْرَأَۃٌ وَّاحِدَۃٌ نَعَمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ لَمْ یُجِبْہُ غَیْرُھَا۔ یعنی اس ایک عورت نے جواب دیا باقی خاموش

رہیں۔ یہاں بقیہ عورتوں کی جانب سے سکوت محض ہے پھر بھی سب کی جانب سے اس کو بیعت کرنا سمجھا گیا۔ یہ اس اجتماعی حال کا حکم ہے کہ سب کا کلام حکمی طور پر سب جانب سے معتبر ہو گیا لیکن مقتدی جماعت میں امام کو نمائندہ بنا کر درخواست بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں اور اس کے آخر میں سب آمین بھی کہہ دیتے ہیں یہ صریح نطق کے درجہ میں بن جاتا ہے۔ جب ان عورتوں کا سکوت بمنزلہ نطق بن گیا۔ تو آمین بھی کہہ دیا جائے تو کیوں حکمی قرأت نہ بنے گی۔ پہلے یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰی اَمْوَالِهِمْ کی دُعا پڑھی تھی اور حضرت ہارون علیہ السّلام نے آمین کہی تھی۔ (یعنی حضرت ہارون علیہ السّلام نے صرف آمین کہی) لیکن قرآن حکیم نے دونوں کو داعی کہہ دیا اور اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فرمایا گیا۔ اسی طور سے مقتدی کا آمین کہنا۔ یہی اس کا پڑھنا ہو گا۔

العَاشر مِنَ الادِلّة ترك القرأة خلفُ الامَام

قوله علیه الصّلوٰة والسّلام: "من کان له امام فقرأة الامام له قرأة"۔

(او کما قال)

اس حدیث کا تذکرہ گزشتہ اگرچہ ضمنی طور سے گزر چکا ہے لیکن فریقِ ثانی نے اس کے متعلق شکوک و شبہات کا جال بچھا رکھا ہے اس لیے اس کا مستقل تذکرہ مناسب معلوم ہُوا اور اس کو آخر میں اس لیے لایا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ حدیث مدار مسئلہ نہیں۔ اس باب میں صرف یہی حدیث ہوتی تو شکوک کچھ مفید بن جاتے۔ لیکن اصل مسئلہ کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے جن کا تذکرہ ہو چکا ہے اس کے باوجود ان شبہات کے ازالہ کے لیے کچھ معروضات پیش کرنی ضروری ہو گئیں تاکہ عوام کو حقیقتِ حال معلوم ہو جائے اور کسی کے فریب میں نہ آئیں۔ واللہ الموفق۔ ومنہ الہدایت۔

غیر مقلدین کا ہمیشہ سے یہ اصول ہے کہ حضراتِ حنفیہ کی اصل دلیل کو چھوڑ کر کسی ضعیف کو ان کی دلیل بتا کر عوام کو دھوکہ میں ڈالنے کے لیے اسکی تردید کرتے رہتے ہیں۔ تراویح کے

مسئلہ میں اسی راستہ پر چلے۔ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا متفقہ اجماعی تعامل جس کو تمام اُمّت نے معتبر سمجھا۔ ترمذی شریف میں اس کا تذکرہ موجود ہے کہ اہلِ حرمینِ شریفین کا یہی تعامل تھا۔ اس کو چھوڑ کر ایک ضعیف حدیث کو غیر مقلدین مسئلہ کی دلیل بتا کر اس میں شبہات ڈال کر لوگوں کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں اسی طرح مسئلہ قرأت خلف الامام میں بھی یہی چال چلی۔

مصنف خیر الکلام فاضل اہلِ حدیث نے صـ۴۸ پر لکھّا کہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ تعالےٰ نے دارِ قطنیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس حدیث (من کان لہ امام) کے جمیع طرق ضعیف ہیں اور حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ خاموش گزر گئے۔ حنفیہ کرام کثرھم اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس دعوٰی کی تردید کی گئی کہ ان کا یہ قول خلاف واقع اور باطل ہے۔ مصنف خیر الکلام کو یہ بات گراں گزری۔ مبہم انداز میں اس کی جواب دہی کی۔ (یہ بہت ذمہ داری کی بات ہے اس کے لیے کچھ علم کی بھی ضرورت ہے) شاید علم حدیث کے ٹھیکہ دار آپ لوگ ہی ہیں۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ آیا ہوا ہے۔ جرح معین متعین کرتے تو ہم جوابدہی کرتے۔ اجمال کا جواب اسی قدر ہے کہ ہم اپنی جانب سے تردید نہیں کرتے بلکہ گزشتہ صحیح بخاری صـ۱۰۴ کے حاشیہ سے بعض اجلّہ محدّثین کا فرمان نقل کر چکے ہیں۔ اسنادہ علیٰ شرط الشیخین دارقطنی کے تعصب کا تذکرہ تو انشاءَ اللہ تعالیٰ حضرت محقق جمال الدّین زیلعی رحمہ اللہ تعالےٰ کے کلام میں آئے گا۔ رہا حضرت حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس پر خاموشی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ان کی ایسے مقام میں خاموشی طبیعت بن چکی ہے۔ دیکھئے فتح الباری صـ۳۸۴ ج۲ میں فاتحہ کے فرض ثابت کرنے کی دلیل لکھی: وَلِاَحْمَدَ مِنْ طَرِیْقِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ سُوْرَۃَ الْقُشَیْرِیِّ عَنْ رَجُلٍ عَنْ اَبِیْہِ لَا تُقْبَلُ صَلٰوۃُ لَا یُقْرَأُ فِیْھَا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ سبحان اللہ! نہ رَجُلٍ کا پتہ نہ اَبٌ کی تعیین۔ نہ ذات کا علم، نہ صفتِ عدالت کا تذکرہ اور دلیل فرضیت فاتحہ کی بتا کر آپ خاموش گزر گئے۔ حالانکہ خود "نخبۃ الفکر" میں جوانِ کا اصولِ حدیث میں رسالہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ راوی اگر عن ثقۃٍ بھی کہے تو اس کا اعتبار بھی نہیں ہوگا۔ لِاَنَّہٗ یحتمل ان یکون ثقۃ عندہ لا عند غیرہ۔ لیکن فتح الباری میں جب مفید مطلب حدیث آگئی تو رَجُلٌ عَنْ اَبِیْہِ بھی حجت کے مقام میں بیان کر گئے۔ سبحان اللہ!

Scanned by CamScanner

اگر ایسی روایت کو کوئی حنفی دلیل بناتا تو کیا کچھ کہا جاتا ؟ یہ بات صرف میں نہیں کہتا بلکہ مصنف خیر الکلام بھی ایک موقع میں یہی بات کہہ رہے ہیں۔ خیر الکلام ص۵۶۱ میں رواہ الطبرانی فی الکبیر کے بعد ہے وفیہ رجل لم یسم (راوی کا نام نہیں لیا گیا، یعنی مجہول ہے جس میں راوی مجہول ہو وہ ضعیف ہوتی ہے) ایسی مجہول الحال اور ساقط روایت تو متابعات میں بھی معتبر نہیں ہوتی۔ لیکن حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس کو دلائل میں ذکر کر گئے کہ اس میں مفید مطلب لفظ ہے یعنی لا تقبل صلوٰۃ ... الخ۔ یہ بیان تنقیص کے طور پر نہیں کیا گیا۔ مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ غیر مقلدین ایسے مقامات کی باتیں جن بڑوں کی طرف منسوب کر کے منوانے کی کوشش کرتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ وہ بھی کبھی مذہبی پاسداری میں علمی ذمہ داری کو بھول جاتے ہیں۔ ابھی آپ کو ایک مثال بتائی گئی ہے۔ یہ بات پہلے بھی آ چکی ہے کہ حضرت امام دارقطنیؒ کا روّیہ تو ادر بھی نرالا ہے۔

۲ــــ اگر حضرت حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ یا حضرت امام دارقطنیؒ اس کے بعض رجال کی کمزوری کی وجہ سے اسکے ضعف کا حکم کرتے ہیں تو ان سے زیادہ ضعف کے اقوال محمد بن اسحاق راوی حدیث قرأت خلف الامام میں پائے جاتے ہیں اور ان کو علیٰ شرط الشیخین یا احدھما میں سے ہونے کا شرف بھی حاصل نہیں ہے۔ اس کی روایت کو اگر بعض کی توثیق کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے حسنؒ کہا جا سکتا ہے تو قرأۃ الامام قرأۃ لمن خلفہٗ والی روایت جس کے بیان کرنے والی راوی علیٰ شرط الشیخین بھی ہیں۔ ان کی توثیق کے بعد وہ تو بدرجہ اُولیٰ صحیح بھی بن سکتی ہے۔ دونوں کے راویوں کا موازنہ کیجئے اور منصفانہ فیصلہ کیجئے۔

محمد بن اسحاق کی روایت میں جس قدر خرابیاں ہیں جن کا بیان آنے والا ہے کہ اس کا حسنؒ ہونا بھی نہایت مشکل ہے۔ حدیث مَنْ کَانَ لَہٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَۃُ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَاءَۃٌ میں تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ اگر یہ ضعیف ہے تو محمد بن اسحاق والی اضعف ہے ــــ امام ترمذیؒ کا حسنؒ فرمانا باوجود متساہل ہونے کے ان کا اپنا ذاتی نظریہ ہے ورنہ وہ دوسری روایات کے مخالف ہو کر شاذ ہی ہے۔ بیان آنے والا ہے۔

۳ــــ "مَنْ کَانَ لَہٗ امام ... الخ" والی حدیث کلامِ تام ہے۔ خبر جملہ ہے اس میں

Scanned by CamScanner

ضمیر مبتدأ (من موصولہ) کی طرف لوٹنے والی پائی جاتی ہے۔ یعنی لہٗ قرأۃ جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھتا ہو۔ امام کی قرأت اس کی قرأت بن جاتی ہے اس کو مستقل قرأت کی حاجت نہیں رہتی جیسے جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھتا ہے تو امام کا سُترہ اس کا سُترہ بن جاتا ہے۔ مقتدی کو مستقل طور سے اپنے لیے سترہ رکھنے کی ضرورت نہیں سترۃ الامام سترۃ لمن خلفہ کی طرح قرأۃ الامام قرأۃ لمن خلفہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس پورے کلام واضح المراد کے علّامہ سندھی رحمہٗ اللہ تعالیٰ نے خلاف ظاہر دو الگ الگ جملے بنا دیئے ہیں۔ من کان لہ امام کی جو مبتدا ہے یہ خبر مقدر نکالی فلیقرء لنفسہ تاکہ فاتحہ خلف الامام پڑھنا ثابت ہو جائے یہ پیوند لگانا محض مطلب سازی کے لیے بلاضرورت کیا۔ اگر یہ مراد ہوتی ہو حدیث معروف انما جعل الامام لیؤتم بہ اذا کبر فکبروا کے بعد واذا قرء فاقرءُوا فرماتے۔ جیسے کہ علامہ سندھیؒ نے امر کا صیغہ فلیقرء لنفسہ مقدر نکالا ہے حالانکہ اس کے بجائے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اذا قرء فانصتوا فرمایا ہے رمسلم شریف اور نسائی میں یہ آچکا ہے۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فَاِنَّ قِرَأَۃَ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَأَۃٌ کی ضمیر امام کے راجع کر دی کہ امام کی قرأت تو اسی کی اپنے لیے قرأت ہے۔ اے مقتدی تو خود اپنے لیے قرأت کہہ، دوبارہ پھر آخر میں انھوں نے بلاضرورت فلیقرء لنفسہ مقدر نکالا۔ دونوں جگہ پیوندکاری سے مطلب سازی کی۔ مصنف خیر الکلام کو بھی اسکی ضرورت تھی اُٹھا کر تھیلے میں ڈال دیا۔ یہ نہ دیکھا کہ شارع حضرت علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فاتحہ کے ساتھ بعض روایات میں سورۃ ملانے کا حکم بھی دیا ہے۔ لاصلوٰۃ الّا بفاتحۃ الکتاب کے ساتھ وَمَا زَادَ، فَمَا زَادَ، فَصَاعِدًا۔ کا فرمان بھی ہے بعض جگہ وشیء معھا بھی فرمایا۔ امام نے تو دونوں کو پڑھا۔ فاتحہ کے ساتھ سورۃ یا چند آیات بھی ملائیں۔ اپنی ذمہ داری پوری کی اگر مقتدی کی ذمہ داری بھی یہی ہے کہ امام کی پڑھی ہوئی قرأت مقتدی کی نہیں بنتی تو وہ اپنی قرأت خود کرے گا تو دونوں کو وہ بھی پڑھا کرے۔ لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب آیا ہوا ہے تو اس کے ساتھ فما زاد بھی اسناد حسن سے مروی ہے۔ امام صاحب اسی پر عمل

کرتا ہے۔ اسی طرح منفرد بھی یہ سب کچھ کرتا ہے۔ آپ نے مقتدی کو کیوں یہ چھٹی دے دی کہ فاتحہ اور سورت میں سے فاتحہ پڑھ لے اور سورت کو رہنے دے۔

مصنف خیر الکلام نے مطلب کو نہ سمجھتے ہوئے علامہ سندھیؒ کی عبارت کی تاویل کی جو تحریف کے انداز میں ہے اس کی توجیہ یہ کی کہ خبر میں ضمیر مقدر نکالی جاسکتی ہے جیسے مشہور مقولہ البر الکرّ منہ لبستّین درھما میں منہ کی تقدیر مانی گئی ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہاں الکرّ لبستّین درھما خبر جملہ ہوتے ہوئے مبتدار کی ضمیر سے خالی ہے اس لیے اس میں منہ کا لفظ رابطہ نکالا گیا۔ لیکن حدیثِ نبویؐ میں من کان لہ امام کے بعد قرأۃ الامام لہ قرأۃ کے جملہ میں ضمیر مبتدار کے طرف عائد موجود ہے۔ یہاں تقدیر کی کیا ضرورت ہے اور اس مطلب سازی کے لیے کیا داعیہ ہے؟ صحیح عضو کو بیمار بتا کر پٹی لگانا کونسی عقل مندی ہے۔ بیمار اور تندرست کا فرق نہ کرنا جہالت کہا جاتا ہے۔

مصنف خیر الکلام نے اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کی آیتِ کریمہ سے لوگوں کو بتایا کہ امام کی قرأت مقتدی کی نہیں ہوسکتی اس کو خود پڑھنا ضروری ہے۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو فاتحہ کے بعد ضم سورۃ میں بھی یہی کچھ کہنا ہوگا، وہاں مقتدی سے سورۃ کے ملانے کو ساقط کرنے کا بہانہ بنانا محض افسانہ ہے اس کے لیے شرعی صحیح اور صریح دلیل یعنی نص اور حدیثِ نبویؐ پیش کرنی ہوگی۔ حنفیہ تو کہتے ہیں کہ شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا فرمان وَاِذَا قَرَءَ فَاَنْصِتُوْا ثابت ہے کہ مقتدی نہ فاتحہ پڑھے نہ مازاد۔ آپ صرف فاتحہ پڑھواتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حدیث آئی ہے: لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یقرأ۔ لیکن اسی حدیث کے ساتھ زیادت فَصَاعِدًا مسلم شریف میں مروی ہے۔ اس کے علاوہ اور الفاظ بھی ثابت ہیں۔ ولہٰذا مقتدی کو بھی چاہیئے کہ وہ سب کچھ پڑھے جو امام اور منفرد پڑھا کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ علامہ سندھیؒ اور ان کے تابعدار مصنف خیر الکلام کو خلف الامام فاتحہ خوانی کی محبت نے اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا حُبُّکَ الشَّیْءَ یعمی ویصمّ آپ نے مبتدار من کان لہ امام کی خبر بلا وجہ مقدّر نکالی یعنی فلیقرء لنفسہ اس کو سرّی جہری سب میں معتبر رکھا کہ امام اپنی قرأت کرتا ہے تم اپنی کیا کرو۔ ان کو شرم نہ آئی

کہ حضرت امام زہری رحمۃ اللہ تعالیٰ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تعامل فانتہی الناس عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما جھر فیہ نقل فرمارہے ہیں کہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے فاتحہ پڑھنے سے رُک گئے جب کہ آپؐ کی ناراضگی پڑھنے پر انھوں نے دیکھی سُنی۔ اس کے مناسب تو تقدیر یہ بنتی ہے: من کان لہ امام فلا یقرء، یہی تقدیر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان کے مطابق بھی بنتی ہے: لَاقِرَأَۃَ مَعَ الْاِمَامِ فِیْ شَیْءٍ۔ بلکہ یہی فرمانِ خداوندی کے مطابق وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ۔ جیسے حضرت امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر میں گزشتہ گزرا کہ استماع کامل توجہ سے سننے کو کہتے ہیں اپنے پڑھنے میں امام کی قرأت کی طرف پوری توجہ نہیں رہتی۔ ولہٰذا لازم ہے کہ مقتدی امام کے ساتھ قرأت نہ کرے۔ اس لیے فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ کا اصل مقصد لَاتَقْرَءُوْا عِنْدَ قِرَأَۃِ الْاِمَامِ ہی ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے اور ان کی یہ عبارت بھی گزر چکی ہے: تحصّل قراءۃ المامموم یفضی اِلیٰ ترک الاستماعِ المأمور یعنی (مقتدی کا قرأت کرنا استماع مامور واجب کے خلاف ہے) اس کلام کا تقاضا بھی یہی ہے: من کان لہ امام فلا یقرأ معہ۔

اگر آپ کی عقل اور فہم یہ کہتی ہے لاصلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب ضرور مقتدی کو شامل ہے اس لیے فلیقرء لنفسہٖ کی تقدیر حدیث میں نکالنی چاہیئے تو میں کہوں گا کہ آپ کی فہم و دانش سے حضرت جابر بن عبداللہ جلیل القدر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی بات اولیٰ و اقرب ہے کہ وہ الّا ان یکون وراء الامام فرمارہے ہیں کہ فاتحہ کا پڑھنا امام کے پیچھے نہیں کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد عرض یہ ہے کہ ہمیں علامہ سندھیؒ کی پیش کردہ دوسری جزو میں بھی کلام ہے کہ معنی یہ ہیں قرأۃ الامام للامام۔ یعنی امام کی قرأت تو امام ہی کے لیے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حنفیہ کثرھم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ امام کی قرأت اگرچہ تحقیقاً امام کی ہے لیکن حکمی طور سے یہی

قرأت مقتدیوں کی بھی سمجھی گئی ہے۔ ان کو مستقل قرأت کی حاجت نہیں۔ جیسے سُترہ امام کا جو حقیقتاً امام ہی کے سامنے ہوتا ہے لیکن وہ حکمی طور پر مقتدیوں کا بھی سمجھا گیا ہے ان کو مستقل قرأت کی حاجت نہیں ہے اور ان کو الگ الگ سُترہ کی تکلیف نہیں دی گئی۔ کیونکہ اگر مقتدی خود بھی قرأت کریں جب کہ امام بھی قرأت کرتا ہے تو لازمی طور امام کی قرأت کے سننے میں خلل آتا ہے پوری توجہ سے نہیں سُنی جائے گی اور یہ بات یقیناً کلام الٰہی کے اکرام واحترام کے خلاف ہے اس ضرورت سے مقتدی کا سننا ہی کافی سمجھا گیا۔ اسی کو حکمی قرأت کہا جاتا ہے۔ اس لیے شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے مقتدی کو اذا قرأ فانصتوا کا حکم دیا۔ یہی مقصد حدیث نبوی کا ہے۔ من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ ۔ یعنی تکفیھم قرأۃ الامام۔ اس طرح قرأۃ الامام قراءۃ للمأموم کا معنی بن کر مفید جملہ بن گیا۔ بخلاف اس کے کہ وہ معنی کیے جائیں جو کہ فاضل سندھیؒ نے کیے ہیں کہ قرأت امام کی امام کے لیے ہے۔ خبر کے جانب سے فائدہ جدید کچھ بھی نہ ہُوا۔ جیسے کہو غلام زیدٍ غلامٌ لہٗ یا سَیْفُ زیدٍ سیفٌ لہٗ۔ الغرض مبتدا قرأۃ الامام میں اضافت علم مخاطب پر دلالت کرتی ہے کہ وہ بخوبی اس سے امام کی قرأت سمجھتا ہے۔ اس کے بعد قرأۃ الامام کے حکم میں فائدہ نہ رہا تو صاحب جوامع الکلم اور افصح العرب کے کلام کا مصداق یہ کیسے بنا؟ دیکھئے! شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے جنگِ بدر کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کی اہلیہ حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیماری کی وجہ سے گھر رہنے کا حکم دیا۔ مصلحتِ وقتی کا تقاضا یہی تھا اس کے باوجود کہ وہ جنگ کے میدان میں نہیں گئے ان کو بدری کہا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لک اجر من شھد بدرًا وسھمہ بھی فرمایا۔ اسی طرح مقتدی جب بضرورت احترام و اکرامِ سماعِ کلام خداوندی پڑھنے سے روکا گیا اور مقتدی بعذر شرعی رُکا تو اس کو قاری کا حکم دے دیا گیا۔ اس کا سماع حکمی قرأت سمجھا گیا۔ یہ بات پہلے بھی آچکی ہے۔ مقام کی مناسبت سے پھر ذکر کر دی گئی ہے۔ بخاری شریف ص۲۰ میں ہے عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثا حتی تفھم عنہ۔ اس بیان

سے ایک اور بات بھی معلوم ہوئی وہ یہ کہ مصنف خیر الکلام نے آیتِ کریمہ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی سے یہ سمجھا اور سمجھایا کہ قرأت امام کا فعل ہے یہ اسی کا ہوا اس سے مقتدی قاری نہیں بنتا اسکی نماز بلا فاتحہ پڑھے ہوئے نہیں ہوگی۔ اگر مُراد یہی ہے، تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ معرکہ جنگ بدر میں نہ تھے۔ جنگی کچھ کام نہیں کیا پھر ان کو حاضرین جنگِ بدر میں سے کیوں شمار کیا گیا؟ سہم کیوں دیا گیا؟ جنگ تو کی نہیں۔ بلکہ اجر بھی کہاں پا سکتے ہیں جب کہ کام کیا ہی نہیں؟ جو جواب آپ اس کا دیں گے وہی پورا مقتدی میں جاری کرنا ہوگا۔ اگر کہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ رکاوٹ باذن الشارع ہوئی۔ بعذرِ خاص ہوئی تو قرأت خلف الامام میں مقتدی کی رکاوٹ بھی بحکم خداوندی فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ اور بحکم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا قرء فانصتوا ہوئی۔ اس میں بھی خاص مصلحت شرعیہ سببِ حکم ہے اور اس میں بھی۔ علامہ سندھیؒ کا یہ کہنا کہ امام نے تو اپنی جانب سے قرأت کی ہے یہ مقتدی کی کیسے بن سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جنگ بدر میں لڑائی کرنے والوں نے بھی اپنی جانب سے (جنگ) لڑی ہے تو پھر یہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کیسے بن گئی؟ ما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

الحاصل: مقتدی کا قرأت سے رُکنا جب حکم شرعی کے بجا آوری سے ہوا اور اس کے استماع وانصات ہی کو بجائے قرأت منظور کیا گیا تو اس کو قاری ہی سمجھا گیا۔ یہی معنی ہیں حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کی اس عبارت کے جسے مصنف خیر الکلام نے ص ۴۹۱ میں نقل کیا انّ الشّارع جعلہ فی حکم القاری لقرأۃ اِمَامِہٖ، اس جعلہ فی حکم القاری کا معنی یہی ہے کہ اس نے حقیقتاً اگرچہ قرأت نہیں کی لیکن اس کے بجائے بحکم الشارع استماع وانصات کیا ہے یہ امتثال حکم بمنزلہ قرأت ہی ہوا۔ اور یہ حکم شرعی ایک خاص مصلحت اور حکمتِ غامضہ کی وجہ سے ہُوا۔ اور وہ احترام الٰہی ہے یہی ادب سکھایا گیا۔ اس لیے اس کو لَا صلوٰۃ لمن لم یقرء کے ضابطہ سے مستثنیٰ کرنا پڑے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ علامہ سندھیؒ کا حدیث من کان لہ امام ہیں خبر فلیقرء لنفسہٖ کا نکالنا بے جا ہے۔ قاری جب قرآن سُناتا ہے تو ایسے وقت کامل خاموشی

Scanned by CamScanner

حق شرعی ہے اگر ایسا ہوتا تو قرآنِ کریم میں یوں آتا: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فاقرءوا۔ کیونکہ نزول آیت کریمہ کا جماعت مفروضہ کے بارہ میں ہے۔ مقتدیوں سے اگر پڑھوانا مقصود ہوتا تو یہی مختصر لفظ آتے اِسْتَمِعُوْا ، اَنْصِتُوْا۔ طویل کلام کی کیا ضرورت تھی ؟ جیسا کہ گزشتہ گزر چکا ہے۔ اس لیے فلیقرأ مقدر نکالنا غلط ہی ہے۔

مصنف خیر الکلام نے اس جگہ ایک اور لطیفہ بیان کیا۔ اس کو بھی دیکھتے جائیے۔ خیر الکلام صـ۱۹۱ پر فرماتے ہیں (اس حدیث کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ امام کی قرأت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے)۔ سبحان اللہ ! جب آپ مقتدی کو کہتے ہیں کہ تم قرأت اپنے لیے خود کرو۔ کیونکہ امام کی قرأت تو امام ہی کے لیے ہے اس نے قرأت اپنے لیے کی ہے تو اس وقت امام کی قرأت کا ثواب مقتدی کو کیسے مل سکتا ہے ؟ امام کا پڑھنا عمل خیر ہے اور وہ اس نے صرف اپنے لیے کیا ہے تو اس کا ثواب بلا نیت کیے ہوئے مقتدی کو ملنا آپ کیسے کہہ ہیں ؟ ہاں اگر یہ کہتے کہ امام نے قرأت کی مقتدی نے استماع کیا اور یہ استماع عمل خیر ہے اور اس کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے۔ تو بات معقول بن جاتی بہر حال حدیث میں تو قرأۃ الامام قرأۃ لہ ہے۔ آپ ثواب قرأت معنی کرتے مضاف نکالتے ہیں۔ اس تقدیر کی کیا ضرورت ہے ؟ یہ تو من مانی شریعت بن جاتی۔ غلط چال چلنے سے ٹھوکریں لگتی ہیں۔ صراطِ مستقیم کو چھوڑنا اسی کو کہتے ہیں۔

دیکھئے مؤذن اذان دیتا ہے جس نے اس کی اذان کا استماع کیا، نہایت غور سے اس کو سنا اس کو تو اس فعلِ خیر کا ثواب ملے گا۔ لیکن اس وقت جو لوگ اپنی باتوں میں لگے ہوتے ہیں کیا ان کو بھی اس اذان کا ثواب ملتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔ آپ کے مذہب کے مطابق مقتدی اپنی قرأت میں لگا ہوا ہو گا تو اس کو امام کی قرأت کا ثواب کیسے ملے گا ؟ نہ امام نے اپنے فعل قرأت کے ثواب بخشنے کی نیّت کی۔ نہ مقتدیوں نے توجّہ سے اسے سُنا تو ویسے ان کو ثواب کیسے ملے گا ؟ انما الاعمال بالنّیّات تو آپ کو یاد ہو گا، نہ اذان دینے والے نے اپنی اذان کے ثواب کی نیّت کی کہ لوگوں کو پہنچے۔ نہ امام نے قرأت کرنے میں یہ نیّت کی، نہ ثواب بخشا نہ بخشایا، پھر قرأت کا ثواب لوگوں کو کیسے آپ نے

کس قاعدہ سے پہنچنا بیان کیا؟ اس عقدہ کشائی کا انتظار ہے۔

یہ اسی طرح کی بے معنی بات ہے جیسے فاضل مصنف خیر الکلام نے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں کہا کہ حضرت ابوبکرہؓ نے جلدی سے رکوع میں جانا اس لیے نہیں کیا کہ رکعت مل جائے۔ فاتحہ نہ پڑھنے سے رکعت کہاں ملتی ہے؟ ہاں یہ جلدی جانا اس لیے کیا کہ رکوع کا ثواب مل جائے۔ یہ ثواب ملنے کی تاویل جعلی اور توجیہہ القول بما لا یرضیٰ بہٖ قائلہٗ کے قبیلہ کی بات ہے وہ تو خود فرماتے ہیں انی خشیت ان تفوتنی رکعۃ معک۔ یعنی مجھے رکعت کے چھوٹ جانے کا خطرہ ہوا اس لیے میں نے یہ جلد بازی کی اور فاضل مصنف کہتے ہیں کہ یہ جلد بازی رکوع کے ثواب کے لیے کی تھی کہ رکوع کا ثواب مل جائے۔ یہ تو من چہ گویم وطنبور من چہ گوید والی بات بن جاتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ آپ جانتے ہیں کہ سجدہ کا مقام رکوع سے اونچا ہے اس کے پانے کی فضیلت اور ثواب بھی زائد ہی ہوگا لیکن کبھی کسی صحابی تابعی نے سجدہ کے لیے ایسی جلد بازی نہیں کی۔ اگر ثوابِ رکوع حاصل کرنے کے لیے اس طرح جلدی جانا ہوتا تو سجدہ کے لیے بھی بطریقِ اولیٰ ایسا کیا جاتا۔ بات صرف یہ ہے کہ رکوع کے ملنے سے رکعت کا ملنا ہو جاتا ہے اس لیے یہ جلد بازی کی جاتی ہے بالکل واضح بات ہے۔ لیکن فاتحہ خلف الامام پڑھنے کے شیدائیوں پر اندھیرا بن گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رکوع کا ثواب پانے کے لیے اس طرح جانا کیا۔ کسی نے یہ حیلہ سازی کی کہ یہ رکعت ان کی نہیں ہوئی اس کی قضا کی ہوگی۔ اگرچہ مذکور نہیں۔ یہ مہمل بات ہے۔ خود صاحبِ واقعہ کے فرمودہ بیان کے خلاف ہے انی خشیت ... الخ کہ مجھے رکعت کے فوت ہو جانے کا خطرہ تھا تب مَیں نے ایسا کیا تو آپؐ کی تقریر سے اس رکعت کا پا لینا اور صحیح ہونا ثابت ہُوا۔

حدیث من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کی زد سے بچنے کا ایک اور طریقہ

فاضل مصنف خیر الکلام نے صـ۴۹۲ میں امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ کی بات نقل کی

Scanned by CamScanner

کہ یہ حدیث مُرسَل منقطع ہے حجّت نہیں بن سکتی۔ (یہ حدیث حجاز اور عراق کے اہلِ علم کے ہاں ثابت نہیں۔ کیونکہ یہ مُرسَل ہے۔) سبحان اللہ! کیا ہی عجب عذر لنگ ہے۔ جواب سُنیے:

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ حدیث مدارِ مسئلہ نہیں۔ اصل مسئلہ کتاب اللہ اور سُنّتِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ گزشتہ مفصّل بیان گزر چکا ہے۔ فی الحال یہ عرض کرنا ہے کہ فریقِ ثانی کے علماً اور فضلاً کو اپنے گھر کی طرف بھی نظر کرنی چاہیئے۔ نزاع امام کے پیچھے مقتدیوں کی فاتحہ خوانی کا ہے۔ امام بخاریؒ صحیح بخاری میں ایک بھی صریح حدیث اس بارہ میں نہیں لائے۔ صرف عمومات سے استدلال کیا ہے۔ اگر کسی حدیث کی سند میں کچھ ضعف ہوتا ہے تو امام بخاریؒ مجہول کے صیغہ سے ترجمۃ الباب میں اس کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔ یُرْوٰی عن فلانٍ۔ یذکر عن فلان۔ باب وجوب القرأۃ للامام والمأموم میں اشارہ تک نہیں کیا نہ کوئی آیتِ کریمہ لائے ہیں۔ جس سے یہ مسئلہ اشارہ کے طور سے سمجھا جاتا۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے پاس اس مسئلہ کی کوئی روایت صحیح نہیں جس کو محلِ استدلال میں لائیں ہماری حدیث اذا قرء فانصتوا صحیح مسلم میں آچکی ہے صحیح بھی ہے اور صریح بحق مأموم بھی ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فتح الباری میں اخرجہ مسلم فی صحیحہ من حدیث ابی موسیٰ الاشعریؓ فرما دیا ہے۔

ہاں امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ جزء القرأت کے رسالہ میں کچھ حدیثیں لائے ہیں۔ جن میں سب سے بہتر محمد بن اسحٰق کی وہ روایت ہے جس کو امام ترمذیؒ نے ص ۱۷ ج ۲ محمد بن اسحاق عن مکحول عن محمود بن الربیع کے طریقہ سے نقل کیا ہے اور اس کو حسنٌ فرما گئے ہیں مگر محققین حضرات کا خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ حدیث مُرسل اور منقطع ہے۔ امام ترمذیؒ کی سند شاذ ہے جو سب کے خلاف ہے۔ حضرت امام بیہقیؒ نے صاف فرمایا رواہ اھل الشام مُرسَلاً۔ پھر پانچ رواۃ کے نام لیے کہ یہ سب مکحول عن عبادہؓ نقل کرتے ہیں۔ ابنِ اسحاق کی سند مکحول عن محمود بن الربیع عن عبادہ پانچوں کے خلاف ہے اور چار اور راوی مکحول عن نافع بن محمود عن عبادہؓ نقل کرتے ہیں اور نافع بن محمود مجہول ہے اس کے علاوہ یہ کہ

محمد بن اسحاق اور مکحول دونوں مدلّسین میں سے ہیں۔ اور روایت عَنْ کے طریقہ سے کر رہے ہیں۔ مدلّس کی روایت بصیغہ عَنْ مشکوک ہوتی ہے۔ امام شعبہؒ فرماتے ہیں: الزنا اھون من التدلیس اھ (نووی شرح مسلم ص ۱۶۳ ج ۱) اور مولانا مبارک پوری صاحبؒ نقل کرتے ہیں قال شعبۃ التدلیس حرام والمدلس ساقط العدالتہ اھ (تحفۃ الاحوذی ص ۱۱ ج ۱)

یہ اجمالی باتیں ہیں عنقریب انشاء اللہ مفصّل بیان آنے والا ہے۔ اس لیے ہم نے کہا کہ اپنے گھر کا حال بھی دیکھو۔

فائدہ: مصنف خیر الکلام نے ص ۴۹۲-۴۹۳ میں حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ سے بچنے کا ایک اور راستہ اختیار کیا ہے کہ اگر بالفرض یہ روایت ثابت بھی ہو جائے تو اس کے مقابل فاتحہ کی فرضیت والی بھی ثابت ہے۔ تو اس صورت میں تطبیق یہ دی جائے گی کہ اوّل کے عموم سے فاتحہ کو مستثنیٰ کرنا ہوگا، جیسے زمین کو مسجد اور طہور کہا گیا۔ لیکن مقبرہ حمام کو مستثنیٰ کیا گیا۔ بحوالہ جزء القرأت۔ (مختصراً)

الجواب: مشہور ہے کہ ہر شخص اپنے مطلب کی بات کہتا ہے بیان میں کبھی چالاکی بھی کر جاتا ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مدعی کے بیان کے بعد فیصلہ نہ کیا جائے جب تک مدعیٰ علیہ کا بیان سُن نہ لو، دوسری جانب کی عذر داری سُن کر صحیح فیصلہ ہوگا۔ شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا یہ ارشاد اصُولِ حکمت سے ہے دیکھئے میں نے گزشتہ کہا تھا کہ محل نزاع امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا، نہ پڑھنا ہے۔ فریق ثانی کے علمأ کہتے ہیں کہ بلا فاتحہ پڑھے ہوئے مقتدی کی نماز نہیں ہوتی لیکن دلیل خاص مقتدی کے بارہ میں فاتحہ کے فرض ہونے کی ایک بھی صحیح اور صریح پیش نہیں کرتے، اور نہ کر سکتے ہیں۔ مصنف خیر الکلام نے بھی چالاکی سے کام لیا۔ کہتے ہیں کہ مقابل فاتحہ کی فرضیت کی بھی ثابت ہے۔ ہم فاتحہ کی فرضیت بحق مقتدی کی دلیلِ صحیح اور صریح پوچھتے ہیں اور یہ فاتحہ کی فرضیت والی یعنی لاصلوۃ الاّ بفاتحۃ الکتاب کو پیش کرتے ہیں اور اس میں مقتدی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور اگر محمد بن اسحٰق عن مکحول والی کو دلیلِ فرضیت کہتے ہیں۔ تو وہ صرف حَسَن درجہ کی ہے۔ جیسے کہ ترمذیؒ کے کلام میں گزرا اور ہم حَسَن

Scanned by CamScanner

بھی نہیں مانتے اور حَسَن کا درجہ و مقام صحیح سے کم ہے۔ صحیح کے بالمقابل یہ ساقط الاعتبار بن جاتی ہے۔ یہی اصولِ حدیث کا مقررہ قانون ہے۔

ہم نے صحیح مسلم کی صحیح اور صریح آوردہ روایت اِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا کو پیش کیا ہے تم بھی اس کے بالمقابل صحیح اور صریح روایت لاؤ گے حب تطبیق کا راستہ لینا ہوگا۔ کیونکہ صحیح اور غیر صحیح یا صحیح وحسن کا کیا تقابل؟ رہا عام عنوان کی حدیث یعنی فاتحہ کی فرضیت والی جو آپ کہتے ہیں وہ صحیح ہے لیکن عموم میں تخصیص کا احتمال ہوتا ہے۔ اس عام میں پہلے بھی تخصیص ہو چکی ہے اس لیے اس کو اب صحیح مسلم شریف والی روایت کے ذریعہ سے مخصوص کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ وہ صحیح اور صریح ہے۔ آپ نے الٹا راستہ لیا کہ من کان لہ امام والی مخصوص کرتے ہیں کہ اس میں قرأۃ الامام قرأۃ لہ سے مراد ماسوی الفاتحہ ہے کہ فاتحہ تو مقتدی ضرور پڑھے ہاں ما زاد علی الفاتحہ قرأۃ الامام قرأۃ لہٗ کہتے ہیں۔ یہ دعویٰ تب صحیح ہوگا کہ خاص مقتدی کے بارہ میں صریح فاتحہ کا فرض ہونا آپ بتائیں۔ ورنہ آپ کی یہ تطبیق غلط ہے اس حسن کو صحیح کے مقابل میں ساقط کرنا ہوگا۔ خاص کے اثبات کے لیے عموم کی روایت کو ایسے موقع میں لوگوں کے سامنے پڑھنا اور پیش کرنا دھوکہ ہی ہے۔ دیکھئے حدیث میں ہے: عن ابی ھریرۃ کان النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم یکبر کُلَّمَا خَفَضَ وَرَفَعَ۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی سر کو نیچا کرتے نماز میں یا اُٹھاتے تکبیر پڑھا کرتے تھے۔ یہ عام عنوان ہے۔ کلّما کا لفظ عموم میں صریح بھی ہے حالانکہ حدیث سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے جب سر اٹھاتے تھے سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ پڑھا کرتے تھے۔ تکبیر اس وقت نہ پڑھا کرتے تھے۔ ایسے ہی مقتدی اس وقت رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ۔ پڑھا کرتا ہے۔ اللہ اکبر نہیں کہتا تو ان دونوں صورتوں کو اس عموم سے نکالنا ہوگا۔ کوئی شخص ایسے موقع میں کان یکبر کلّما خفض و رفع کی رٹ لگائے تو وہ احمق ہی ہوگا۔ اسی طرح جب مقتدی کے بارہ میں خاص فرمانِ رسولؐ اِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا صریح آچکا ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا۔ اس کے بالمقابل

Scanned by CamScanner

اس وقت عمومی عنوان لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ پڑھنا بے اُصولی نہیں تو اور کیا ہے ؟ آپ جانبین کے دلائل کا موازنہ کریں اور فیصلہ کریں۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

تطبیق جب دی جاتی ہے کہ دو حُجّتیں مُسَاوِی درجہ کی ہوں۔ ترمذی کی روایت حسن درجہ کی مسلم شریف کی صحیح کے بالمقابل کیسے قبول کی جاسکتی ہے ؟۔ ایسے حالات میں ترجیح دی جاتی ہے۔ صحیح کو لیا جاتا ہے اور مقابل کو چھوڑا جاتا ہے۔ انصاف کا فیصلہ تو یہی ہے۔ ضد کا علاج نہیں۔ یقدم ما فی الصحیحین علیٰ غیرھما مسلّم قانون ہے۔ عام کی خاص کے مقابل تخصیص ہی کیا کرتے ہیں۔ دیکھئے کُلَّمَا خفض و رفع کو مخصوص ماسوٰی رکوع کے کیا گیا ہے یا نہیں ؟ لوگوں کے سامنے خاص کر عام طبقہ والوں کے سامنے اس عام عنوان والی حدیث کو بخاری کے نام سے پیش کرنا علمی امانت کے خلاف اور خیانت ہے۔ جیسے عوام کے سامنے بخاری کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی روایت کان یکبر کلما خفض و رفع پڑھو اور ان کو رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے تکبیر کہنے پر آمادہ کرو اور یہ کہو کہ یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔ بخاری شریف میں دیکھ اور پڑھ لو یہ لوگوں سے خالص فریب کاری ہوگی اسی طرح مسلم وغیرہ کی خاص صحیح اور صریح حدیث اذا قرأ فانصتوا کو چھوڑ کر عام ضابطہ والی حدیث کو جو مخصوص ہو چکی ہے عوام کے سامنے پڑھنا مغالطہ ہی میں ڈالنا ہے۔

وما علینا الا البلاغ۔

تکملۃ البیان فی المتفرقات

گزشتہ ادلّہ کے بیان میں بعض ضروری باتیں سوال کی وجہ سے چھوڑ دی گئی تھیں کہ اصل مقصد میں دُوری اور اُلجھن پیدا نہ ہو جائے۔ اب عرض کرتا ہوں۔ کمال سوٰی محنت کے حاصل نہیں ہوتا۔ اسی کی طرف مسلم شریف ص ۲۲۳ ج ۱ میں یحییٰ بن کثیر کا فرمان نقل کرنے

سے اشارہ کیا ہے: "لَا یُسْتَطَاعُ الْعِلْمُ بِرَاحَةِ الْجِسْمِ"۔ یعنی آرام طلبی سے علم حاصل نہیں ہوتا۔ اسی کو بعض اہل حقائق نے بیان کیا لا یعطیك بعضه حتّٰی تعطیه کلّك۔ تم جب تک سب کچھ علم کے حوالے نہیں کرو گے اس کو نہیں پا سکتے تم سب کچھ اس کا کر دو جب وہ اپنا کچھ حصّہ تمھیں دے گا۔

سُنئے! امام بخاریؒ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان ایک مسلّم حقیقت ہے۔ اسکے باوجود دور اندیشی نہ کرتے ہُوئے بخاری شریف میں حنفیہ پر جگہ جگہ اعتراضات کر گئے ہیں جس کے حسبِ موقع نہایت محققانہ جوابات دیئے گئے ہیں۔ امام موصوف نے جزء القرأت کے رسالہ میں اس موقع میں جو اعتراض کیا ہے اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو امام بخاریؒ کے نام سے ان کے اعتراضات کی وقعت میں پھنسایا جائے۔ اَللّٰھُمَّ ارنا الحق حقّا وارزقنا اتباعه۔

اعتراض کی تقریر اس طرح کی کہ حنفیہ کہتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے امام کی قرأت کے زمانہ میں وہ خاموش ہو کر سُنے، قرأت نہ کرے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص امام کو فاتحہ یا سورت پڑھتے ہوئے پائے۔ جماعت میں داخل ہو وہ سُبْحٰنَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ ... الیٰ اخرہٖ پڑھے۔ قرآن سے ثنا خوانی کو انھوں نے اہمیّت دی ہے۔ قرآن چھڑایا اور ثنا کے پڑھنے کا حکم دیا۔ فرمایا: فالقراٰن اھون من الثناءِ عندھم۔

الجواب ومن اللہ التوفیق والھدایۃ۔ (۱) امام بخاری رحمۃ اللہ تعالےٰ نے حقیقتِ حال کو نہیں پایا اور بلا وجہ اعتراض کر دیا۔ وجہ یہ ہے کہ مذکورہ روایت جو حضرت امام بخاریؒ کی بیان کردہ ہے حنفیہ کرام کے نزدیک مرجوح قول ہے، مختار نہیں، مختار وہ ہے جو علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فتاویٰ میں لکھا کہ امام کی قرأت کے وقت آنے والا امام کے ساتھ نماز میں داخل ہو کر خاموش کھڑا رہے، ثنا خوانی نہ کرے۔ امام کی قرأت کے زمانہ میں ثنا خوانی اور فاتحہ خوانی دونوں نہ کی جائیں۔ پس اعتراض رفع دفع ہو گیا۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی عبارت یہ ہے: ص ۴۵۶ ج ۱ فی النھر عن الصغریٰ ادرک

الامام فی القیام یثنی مالم یبدء فی القرأۃ وقیل فی المخافتۃ یثنی وھو ضعیف۔ یعنی امام کو قیام میں ملے تو ثنا پڑھے جبکہ امام نے قرأت شروع نہیں کی۔ امام قرأت کر رہا ہو تو اس وقت ثنا نہ پڑھے۔ ہاں یہ کہا گیا ہے کہ سرّی نمازوں میں ثنا خوانی کر لیا کرے لیکن یہ لطیف ضعیف ہے۔ دوسری جگہ ص ۳۶۱/۱ ج میں فرمایا: قرأ سبحانک اللھم الّا اذا شرع الامام فی القرأۃ سواء کان مسبوقا او مدرکا وسواء کان امامہ یجھر بالقرأۃ اوّلاً۔ فانّہ لا یاتی بہ۔ یعنی سبحٰنک اللّٰھم مقتدی کو پڑھنا ہے لیکن امام قرأت میں شروع ہو گیا تو ایسے وقت ثنا نہ پڑھے۔ خواہ اوّل سے امام کے ساتھ ملا ہوا ہو یا بعد میں ملا ہو۔ امام جہر سے قرأت کرتا ہو یا مخفی کسی صورت میں ثنا نہ پڑھے۔ اور ایسا ہی دیگر محققین احنافؒ نے لکھا ہے اس سے حضرت امام بخاریؒ کا اعتراض رفع ہو گیا۔

(۲) خلف الامام فاتحہ پڑھنے کی ممانعت اس کے اھونیت (بے قدری) کی وجہ سے نہیں جیسے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بلکہ یہ ممانعت اس کی جلالتِ شان اور عظمتِ مکان کی وجہ سے کی گئی ہے کہ خلفیت ایک طرح ذلّت کی شان ہے۔ تقدّم کو عزّت اور تأخر کو ذلت سمجھا جاتا ہے۔ شاید اسی کی طرف فرمان نبویؐ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں اشارہ ہے: لعلّکم تقرءون خلف امامکم شاید تم لوگ قرأن کو امام کے پس پشت پڑھا کرتے ہو۔ فرمایا فلا تفعلوا الا بامت کیا کرو۔ یہ قرأت خلف الامام کی ناپسندیدگی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کہنا بے جا اور غلط ہے کہ انھوں نے اونچا پڑھا تھا ورنہ لعلّکم کیوں فرماتے؟ صاف نہی فرما دیتے۔ دیکھئے رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم اور سجدہ میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی تین تین مرتبہ پڑھا جاتا ہے لیکن قرآن کی آیات کا رکوع میں یا سجود میں پڑھنا منع ہے، مکروہ ہے۔ یہ حکم اھونیت قرآنِ کریم پر دلالت کرتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ عظمتِ شان قرآن کا پتہ دیتا ہے کہ سجدہ اور رکوع عجز و تذلل کی حالت ہے۔ بندہ کی شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس عجز و انکساری سے منزہ مانا جاتا ہے اسی لیے ان میں سُبْحَانَ

ربی العظیم اور اعلیٰ کہا جاتا کہ اے اللہ تو اس عجز سے پاک ہے اور ہمارے لیے یہ فخر ہے اسی طرح خلف الامام کی حالت بھی تذلل اور تأخر کی شان ہے اس میں قرآن کا پڑھنا مناسب شان نہیں خاص کر جب کہ قرآن کریم کو امام کا لقب دیا گیا ہے تو امام کو مأموم کی جگہ میں نہ رکھا جائیگا۔ پہلے بیان گزر چکا ہے۔

مزید سنئے! کہ جنابت کی حالت میں تسبیح، تہلیل اور اذکار پڑھنے جائز ہیں: کان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یذکر اللہ فی کل احیانہ آیا ہوا ہے، لیکن جنبی اور حائض کو قرآن پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے: لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیئاً من القرآن۔ ترمذی شریف ص۴۵ میں آچکا ہے یعنی کہ حیض والی عورت اور جنبی شخص قرآن کریم کی تلاوت نہیں کر سکتا یہ اس لیے کہ یہ حالتِ نجاست مناسب شانِ رفیع کلام الٰہی نہیں کہ اس میں وہ قرآن کریم کی تلاوت کرے لیکن عام ذکر اذکار، تسبیح تہلیل پڑھ سکتے ہیں۔

الحاصل: اس حکمِ امتناعی میں جلالت شان قرآن کریم ملحوظ ہے۔ اسی طرح خلف الامام ہونا بھی مناسب شان نہیں کہ قرآن امام ہے اور امام کا حق تقدم ہے نہ کہ تأخر۔ جب تنظیمی مقام ہوتا ہے تو عظیم المرتبہ کو آگے کیا جاتا ہے جیسے صفِ اول میں شیوخ کا حق اور صفِ ثانی میں نوجوانوں کا، اس کے بعد نسأ کا حق ہوتا ہے۔ قرآن کی عظمت شان کا حق بھی یہی ہے کہ محلِ عظمت میں پڑھا جائے وہ امام کا مقام ہوتا ہے۔ جب کہ قرآن کو امام کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ خلفیت کا مقام اس کے مناسب شان نہیں بنتا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ایک اور اشکال کیا ہے کہ حنفیہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا منع کرتے ہیں۔ حالانکہ امام کی قرأت کے وقت فجر کی سنتوں کی اجازت دیتے ہیں کہ پڑھ لیا کرو۔ مقتدی کو اس وقت پڑھنے سے منع کرنا اور ایسے وقت میں آنے والے کو سنتوں کی اجازت دینا کیسے درست ہوا؟

پہلا جواب: ومن اللہ التوفیق والھدایۃ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ

اللہِ اَوْ فُوْا ۔ آپ سوچیں کہ حدیث شریف میں مقتدی کو حکم دیا گیا ہے ۔ اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا گزشتہ تفصیل گزر چکی ہے۔

قرآن کریم میں وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کا حکم بھی مقتدی کے بارہ میں ہے اور اصل نزول اس کا امامت کے مسئلہ میں ہے ۔ گزشتہ بحوالہ تفسیر ابنِ کثیرؒ[1]، ابنِ جریرؒ[2]، امام نسائیؒ[3]، یہی بیان مفصل آچکا ہے ۔ انصات خالص خاموشی کو چاہتا ہے ۔ اَنَا خَطِیْبُهُمْ اِذَا اَنْصَتُوْا کی حدیث ثابت ہو چکی ہے ۔ اسی طرح استماع کامل خاموشی سے سُننے کو کہتے ہیں جس میں زبان کو حرکت بھی نہ دی جائے ۔ مقتدی کو امام کی اقتداء کے بعد اس حکم کی پابندی کرنی ہوتی ہے ۔ جن لوگوں نے کہا کہ انصات کرتے ہوئے پڑھ بھی سکتا ہے اس کی مفصل تردید گزر چکی ہے ۔ لیکن نماز سے خارج کوئی قرآن کی تلاوت کرے اس وقت خاموشی استحباب کے درجہ میں ہے ۔ لازم نہیں ۔

دوسرا جواب[2] : گزشتہ بحوالہ ابنِ جریر ص ۱۶۳ ج ۹ گزر چکا ہے کہ حضرت عطاءؒ اور حضرت عبیدؒ بن عمیرؒ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور وہیں کوئی واعظ قرآن کریم کا وعظ کر رہا تھا، کسی نے ان دونوں کو کہا: اَلَا تَسْتَمِعَانِ ؟ تم سُنتے نہیں ۔ انھوں نے فرمایا: اِنَّمَا ذٰلِكَ فِی الصَّلٰوةِ ۔ یعنی خاموشی کا حکم نماز کی صورت میں ہے ۔ نماز سے خارج استماع واجب نہیں ۔ اس بیان سے روز روشن کی طرح معلوم ہُوا کہ سنتوں کا پڑھنے والا چونکہ امام کی نماز میں داخل نہیں لہٰذا وہ اپنا ضروری کام کر سکتا ہے ۔ جب ضروری باتیں کرنا ممنوع نہیں ہیں ۔ ابھی معلوم ہُوا ، تو سُنتوں کا پڑھنا بالخصوص فجر کی سنتیں جو اوروں سے زائد مؤکّد ہیں ۔ لا تترکوھما وان طردتکم الخیل ۔ (طحاوی ص ۱۸۲ ج ۱) آچکا ہے ۔ ان کا پڑھنا جائز ہوگا ۔ انصات کے حکم وجوبی کی پابندی صرف مقتدی کو ہے نہ باہر کے لوگوں کو ۔

اس سے مصنف خیر الکلام کے اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو گیا کہ وہ کہتے ہیں کہ قرأت کے وقت جب خالص خاموشی کا حکم ہے تو آنے والے کو تکبیر کا پڑھنا بھی ممنوع ہونا چاہیئے ۔ جواب مشکل ہے ۔ جواب ابھی معلوم ہُوا کہ تکبیر کہنے والا ابھی نماز میں داخل

Scanned by CamScanner

نہیں ہوا وہ اس حکم میں نہیں آتا۔ جواب آسان ہے لیکن انصاف کی ضرورت ہے۔ ضد اندھا کر دیتی ہے۔ اشکال مسئلہ کی حقیقت نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔

تیسرا الزامی جواب یہ ہے: کہ فریقِ ثانی خطیب کے خطبہ کے وقت جو شخص مسجد میں داخل ہو تو کہتے ہیں کہ وہ تَحِیَّۃُ الْمَسْجِدْ پڑھ کر مسجد میں بیٹھے کہ حدیث میں ہے:

اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِد فَلْیُصَلِّ رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ اَنْ یَّجلس۔ جب خطبہ کے زمانہ میں سُنتیں پڑھ سکتا ہے۔ آپ حکم دیتے ہیں تو نماز کی قرأت کے وقت آنے والا شخص وہ سُنتیں کیوں نہیں پڑھ سکتا؟۔ خیر الکلام صـ۱۶ پر میں نقل کیا ہے کہ حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: فمصلی التحیۃ منصت یجوز ان یطلق علیہ انہ منصت (فتح الباری صـ۵۰ ج۱)۔ دوسروں پر اعتراض کرتے وقت اپنے گھر کی طرف بھی دھیان کر لینا ضروری ہے۔ خاص کر جب کہ مصنف خیر الکلام بار بار لکھتے ہیں۔ (شور و غل کرنا منع ہے۔ قرأت بشوشہ منع ہے۔) سنتیں پڑھنے والا کوئی شور و غل تو نہیں کرتا۔ اسے آپ کیسے روک سکتے ہیں؟

چوتھا جواب: اور یہی تحقیقی جواب ہے کہ فجر کے وقت امام کی قرأت کے زمانہ میں آنے والے کا سنتیں پڑھنا حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔ فتاویٰ صـ۱۶۹ ج۱ مولانا عبدالحی صاحبؒ میں ہے کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ اِنَّہٗ کَانَ یَدْخُلُ الْمَسْجِدَ والنّاس فی صفوف فی صلوۃ الفجر فیصلی فی ناحیۃ المسجد ثم یدخل مع القوم۔ یعنی حضرت ابو الدرداءؓ صبح کی نماز کے لیے مسجد آتے اور دیکھتے کہ مسجد میں لوگ جماعت سے نماز پڑھتے ہیں اور جماعت ہو رہی ہے تو مسجد کے کسی کنارے میں جا کر سُنتیں پڑھ کر جماعت میں داخل ہوتے تھے۔

اسی طرح حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کا عمل نقل کیا جاتا ہے۔ فتح الباری صـ۱۰۳ ج۲ میں ہے صَلَّحَمَّۃُ اِنَّہٗ قَصَدَ المسجد فسمع الاقامۃ فصلی رکعتی الفجر فی بیت حفصۃ ثم دخل فصلی مع الامام۔ یعنی کسی موقع میں حضرت ابنِ عمرؓ مسجد کو صبح کی نماز کے لیے جانے لگے اتنے میں اقامت کی آواز سُن لی۔ تو حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنی ہمشیرہ کے گھر جا کر سنتیں پڑھ کر پھر مسجد میں گئے اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابنِ مسعودؓ کا عمل نقل کیا جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

اس سے معلوم ہوا کہ ممانعت خلف الامام مع الامام قرأت کی ہے۔ سنتیں پڑھنا مسجد کے کونہ میں یا صف سے دور ہو کر ممنوع نہیں۔ ہاں قریب صف میں کھڑے ہو کر سنتیں پڑھنا مکروہ ہے۔ حنفیہ دُور دراز ہی صبح کی سنتیں پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

گزشتہ بیان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جس روایت میں اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ آیا ہُوا ہے اس سے مراد قریب جماعت کے کھڑے ہو کر سُنتیں پڑھنا مراد ہے کہ ایسے حالات میں سُنتیں نہ پڑھنا مناسب ہے۔ لیکن دُور دراز پڑھ سکتا ہے جیسے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم کے تعامل سے معلوم ہُوا۔ اور وہ بھی صرف فجر کی سُنتیں پڑھنا اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ ان کی تاکید اوروں سے زائد آئی ہُوئی ہے اور ایک رکعت کے پانے والا مدرک سمجھا جاتا ہے اس لیے فجر میں دو رکعت پڑھنے کی گنجائش ہے۔ فلا صلوٰۃ الّا المکتوبۃ میں یہی ناپسندیدگی مراد ہے وہ بھی اس صورت میں کہ جماعت کے قریب ہی پڑھتا ہو۔ حضرت حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ ص ۲۸۹/۲ فتح الباری میں فرماتے ہیں: باب اذا اقیمت الصلوٰۃ لما لم یقطع النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰتہ واقتصر علی الانکار دلّ ان المراد نفی الکمال یعنی جس شخص نے یہ سنتیں قریب صف ہی میں پڑھیں۔ آپؐ نے اس پر انکار تو کیا ہے جس سے ناپسندیدگی معلوم ہوتی ہے لیکن نماز توڑنے کا حکم نہیں دیا۔ اس شخص نے وہیں نماز پڑھ لی تو اس بات نے یہ پتہ دیا کہ لا صلوٰۃ الّا المکتوبہ سے نفی اصل نماز کی مقصود نہیں بلکہ کمال کی نفی مُراد ہے یعنی معمولی کراہت مراد ہے۔ اگر مکروہ تحریمی کا درجہ ہوتا تو نماز توڑ دینے کا حکم فرماتے۔ لیکن یہ بھی اس وقت ہے کہ قریب ہی صف میں پڑھے۔ دُور پڑھنے میں کوئی کراہت نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

مصنّف خیر الکلام کی نافہمی یا کجروی

خیر الکلام ص ۳۹۹ میں لکھتے ہیں: "بعض حنفیہ کے کلام میں تعارض ہے۔" ایک جگہ لکھتے ہیں۔ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ اس پر جب تکبیر تحریمہ کا اشکال کیا گیا تو اس وقت یہ کہہ دیا: آیت کا مصداق اور مخاطب ہر ایسا شخص ہے جو امام کی اقتدا

کر چکا ہو۔ (مختصراً)۔ یعنی یہاں تخصیص کردی۔ ان دونوں باتوں میں تعارض ہے۔

الجواب : اگر یہ بات قصورِ فہم سے کہی گئی تو اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق دے اور اگر تنگ نظری اور کجروی سے کی گئی ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ تعارض کچھ نہیں۔ آیتِ کریمہ کا شانِ نزول صلوٰۃِ مفروضہ ہونے کا معنی یہ نہیں کہ اس سے مختص ہے بلکہ اس کا اصل مورد ہونا مراد ہوتا ہے۔ نماز کے علاوہ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں بھی یہ حکم معتبر ہوگا۔ یعنی فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کا حکم سامعینِ خطبہ کو بھی شامل ہوگا۔ یہ عموم کے معتبر ہونے کا معنی ہے۔ اس کے مطابق بعض احادیث میں نزلت فی الخطبہ آبھی چکا ہے۔ لیکن نماز اور خطبہ جمعہ اور عیدین کے علاوہ ہر جگہ خارجی احوال میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ حکم معتبر نہیں کیا یعنی عموم بالغًا ما بلغ معتبر نہیں رکھا گیا اس لیے اس حکم کو تکبیر[1] تحریمہ کی رکاوٹ میں اعتبار نہ کیا جائے گا۔ اسی طرح[2] فجر کی سنتوں کی رکاوٹ میں اس کو پیش نہ کیا جائے گا۔ یا درسِ[3] قرآن میں جب ایک پڑھتا ہے تو دوسروں کے لیے خاموش رہنے کا حکم اس آیت سے نہیں لیا جائے گا۔ شمول جب ہوتا ہے کہ عموم کے لیے کلّما کا لفظ استعمال کیا جائے۔ اذا کے لفظ میں ایسا عموم نہیں ہوتا۔ بلکہ کہا جائے گا کہ یہ حکم یعنی وجوب استماع و انصات مخصوص ہے۔ نماز کے ساتھ یا نماز اور خطبہ جمعہ عیدین کے ساتھ۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں جیسے مصنف خیر الکلام نے اعتراض میں تعارض کا ہونا کہا اور عموم میں یہ تخصیص سلف صالحینؒ نے کی ہوئی ہے جیسے حضرت عطاؒ رحمہ اللہ تعالیٰ اور عبید بن عمیر رحمہ اللہ تعالیٰ کے قصہ میں حضرت ابنِ جریر رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ وہ باتیں کر رہے تھے کسی نے ان سے کہا: اَلَا تَسْتَمِعَانِ اِلَى الذِّكْرِ تو فرمایا انما ذلك فی الصلوٰۃ یعنی استماع کا وجوب نماز میں ہے۔ ہم تو خارج از نماز ہیں۔ یہاں یہ حکم نہیں۔ جب باتیں کرنا منع نہ ہوئیں تو مقتدی کا آنے کے وقت[1] اللہ اکبر کہنا کیسے منع ہو سکتا ہے؟ سنتیں[2] فجر کی پڑھنا جب کہ امام قرآن پڑھتا ہو کیسے روکا جا سکتا ہے؟ درس[3] قرآن میں ایک کے قرآن پڑھتے وقت دوسروں کے لیے استماع کا حکم کیسے واجب کیا جا سکتا ہے؟ یہ باتیں نافہمی پر مبنی ہیں۔

Scanned by CamScanner

ہاں قرآنِ کریم میں کلّما قُرئ القراٰن فاستمعوا آتا تو عموم صریح ہو جاتا۔ اس میں تمہیں کہنے کی گنجائش نکل آتی کہ تکبیر کیسے پڑھی کلّما آیا ہُوا ہے سنتیں کیسے پڑھتے ہو؟ کُلّما قرئ القراٰن فاستمعوا لہٗ آیا ہُوا ہے مگر درحقیقت یہ بھی مغالطہ ہی بنتا۔ کلّما میں بھی تخصیص آجاتی ہے۔ ابھی گزر چکا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کرتے ہیں کان النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم یکبر کلما خفض و رفع۔ حالانکہ سمع اللہ لمن حمدہ۔ ربنا لک الحمد میں ایسا نہیں ہوتا لیکن آیتِ کریمہ میں تو اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا ہے۔ اذا میں عموم نہیں ہوتا جیسے کسی نے کہا: اِذَا دَخَلْتِ الدّار فانت طلق۔ تو ایک ہی دفعہ دخول دار سے طلاق پڑتی ہے۔ دوسری، تیسری دفعہ سے نہیں پڑتی ہاں کلّما کا لفظ کہا گیا ہو تو ہر دفعہ دخول سے طلاق پڑ جاتی ہے۔ فاضل مصنف کے تینوں اعتراض اگر ضد پر مبنی نہیں تو نافہمی ضرور ہے مگر ان کی قوم ہے جو اپنوں کی باتوں کا تول وزن نہیں کرتی۔

الحاصل: کلّما اور مَتٰی موجبہ کلیہ کے لیے آتے ہیں ان میں عموم افراد کا ہوتا ہے اور اذا عموم کے لیے موضوع ہی نہیں ہے۔ سلم العلوم کو اُٹھا کر دیکھیں فرمایا۔ اِنْ و اِذَا للاھمال یعنی اِنْ اور اذا قضیّہ مہملہ بنتا ہے اور مہملہ جُزئیہ کے درجہ میں ہوتا ہے۔ قد یکون کے معنوں میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں کلّما قرئ یا متٰی قرئ نہیں آیا۔ حدیث میں اذا قرأ فانصتوا اور قرآنِ کریم میں اذا قرئ القراٰن۔ ان کا مصداق نماز میں امام کا قرآن پڑھنا ہے یا خطیب کا خطبہ جمعہ و عیدین میں پڑھنا۔ ان میں خاموشی کا حکم بیان کیا گیا۔ تکبیر تحریمہ اور درسِ قرآن اس کا مصداق نہیں ہیں۔

فاضل مصنف خیر الکلام کی خوش فہمی یا ناانصافی۔ ص ۴۱۰-۴۱۱ پر نظر ڈالیے۔ قوم کو کیسے سبق دے رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان حدیث میں ہے: مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ ھُدًی کَانُوْا عَلَیْہِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدَلَ۔ کوئی قوم بے انصافی پر اُتر آئے اور بلا دلیلِ خاص اُلجھاؤ پر آجائے تو یہ اس کی گمراہی کی نشانی ہے اعاذنا

اللہ من الغوایۃ والضلالۃ ۔فرماتے ہیں ۔

خلاصہ : ۱ : وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مقتدی فاتحہ نہ پڑھے۔کیونکہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید پڑھتے وقت اور کچھ بھی کہا جاسکتا ہے ۔ سبحان اللہ ! کیسی دلیری سے یہ افتراء کیا گیا ہے۔جنابِ مَن ! صرف ایک آیت بتائیں کہ اس میں قرآنِ مجید پڑھتے ہُوئے کچھ کہنے پڑھنے کی اجازت پر دلالت ہو ۔ آپ امام کے ساتھ ہی فاتحہ پڑھتے ہیں اور اس کی قوم کو تلقین کر رہے ہیں اور حوالہ قرآنی آیات کا دے رہے ہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پڑھتے ہُوئے اور سُنتے ہُوئے اور کچھ پڑھ سکتے ہیں۔ اس مضمون کی ایک آیت پیش کیجئے۔کیا ان سے وہ آیاتِ ثلاثہ مراد ہیں جو آپ نے پیوند لگا لگا کر ان کو فاتحہ خلف الامام کی دلیل بنایا ہے کیا ان میں یہ دلالت ہے کہ قرآن پڑھتے ہُوئے اور سُنتے ہوئے کچھ اور پڑھا جاسکتا ہے۔ ایک حرف ان میں اس مطلب پر دلالت کرنے والا نہیں پایا جاتا۔عوام کو دھوکہ میں نہ ڈالیں اور اگر اس سے وہ آیات مُراد ہیں جن کے بعد کچھ پڑھنے کا سبق دیا گیا ہے۔مثلاً اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی اس کے بعد سُبْحٰنَكَ اللّٰھُمَّ بَلٰی کہا جاتا ہے۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِیْنَ کے بعد بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ، پڑھا جاتا ہے۔ وَغَیْرُ ذٰلِكَ تو یہ بھی فریب ہے کیونکہ یہ جواب آیاتِ مذکورہ کے بعد دیا جاتا ہے۔ عین قرأت کے وقت نہیں پڑھا جاتا۔ آیتِ کریمہ میں اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ۔ الآیۃ۔ سوال ہے۔ جواب سوال کا ہمیشہ سوال کے ختم ہونے کے بعد دیا جاتا ہے۔ درمیان میں بولنا تو بے قاعدگی ہے اور بیوقوفی کہی جاتی ہے آپ تو کہتے ہیں قرآن پڑھتے ہوئے اور کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ شاید آپ نے قوم کو یہی بے قاعدگی کا راستہ سکھایا ہو۔ دیکھئے قرآن جب وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ کا حکم دیتا ہے اور استماع کامل خاموشی سے سُننے کو کہتے ہیں۔ پڑھنا اس کے منافی ہے۔ جیسے مفصل بیان گزر چکا ہے تو قرآن اس کے اُلٹ کیسے حکم دے سکتا ہے؟

Scanned by CamScanner

یا اجازت دے سکتا ہے کہ قرآن پڑھنے کے وقت بھی تم کچھ اور کام کر سکتے ہو۔ کیا یہ قرآنِ کریم سے بے توجہی نہیں بنتی ؟

۲ : اگر قرآن پڑھتے اور سُنتے ہُوئے قرآن یا کچھ اور پڑھا جا سکتا ہے اور قرآنی آیات اجازت دیتی ہیں جیسے مصنف خیر الکلام کا قول ہے تو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو حضرت جبریل امین کے قرآن پڑھنے کے وقت کیوں منع کیا گیا۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام کو تو لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ فرمایا گیا کہ آپ قرآن پڑھتے سُنتے ہُوئے زبان نہ ہلائیں اور آپ ص ۴۱۰-۴۱۱ پر کھلی چھٹی دیتے ہیں کہ قرآن کی متعدد آیات دلالت کرتی ہیں کہ قرآن پڑھتے ہوئے تم بھی کچھ اور کہتے جایا کرو۔ سبحان اللہ ! اللہ تعالیٰ نے تو فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ فرمایا جس کی تفسیر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اِسْتَمِعْ وَاَنْصِتْ سے فرما گئے ہیں اور آپ اس کے خلاف چلتے ہیں۔ دیکھئے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے بعد سکھایا گیا ہے کہ آمین کہا کرو۔ لیکن یہ کہنا پڑھنا، آیت کے خاتمہ کے بعد وقفہ میں ہوا کرتا ہے اس لیے اذا قال وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے بعد فاء تعقیبیّہ لاکر فرمایا فقولوا آمین۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کے بعد لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نِّعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ کہنا سکھایا گیا ہے لیکن یہ بھی آیت کے خاتمہ کے بعد۔ اسی طرح اور جگہوں میں بھی غور فرمائیں ص ۴۱۱ کہ اگر قرآن پڑھتے وقت اور کچھ بھی کہا جا سکتا ہے اور قرآن کی متعدد آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔ تو حضراتِ محدثین کرامؒ نے اس کو کیوں چھوڑ کر یہ حکم دیا۔ واختار اهل الحديث ان لا يقرأ الرَّجُلُ مَعَ الْاِمَامِ اِذَا جَهَرَ بِهٖ۔ (ترمذی) اور فَانْتَهَى النَّاسُ عَنِ الْقِرَاْةِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (ترمذی) کیوں نقل کیا گیا۔

مصنف خیر الکلام نے ص ۴۱۱ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو قرأت خلف الامام کا قائل بنایا۔ حالانکہ گزشتہ مؤطا امام مالکؒ کے حوالہ سے نقل گزر چکی ہے کہ وہ اس کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے جزء القرأت ص ۴۶ میں فرمایا کہ رکوع کے ملنے سے رکعت کا ملنا وہ لوگ کہتے ہیں کہ جو قرأت فاتحہ خلف الامام

Scanned by CamScanner

کے قائل نہیں ہیں۔ ان حضرات میں سے حضرت[۱] ابنِ مسعود، حضرت[۲] زید بن ثابت، حضرت[۳] ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نام گنے ہیں۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کا فتویٰ مسلم شریف ص۲۱۵ میں ہے۔ لاقرأة مع الامام فی شیء اسی طرح خیر الکلام ص۱۱۴ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی قرأت خلف الامام کے قائلین کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ ان کا فتویٰ نسائی شریف ص۱۴۶ میں مذکور ہے کہ وہ فرماتے ہیں ما اری الامام اِذَا اَمَّ القَوْمَ اِلَّا کَفَاھُمْ۔ یعنی امام کی قرأت مقتدی کو کافی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قائلین قرأت خلف الامام میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک مغالطہ ہے جو بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح خیر الکلام ص۳۴۴ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قائلین فاتحہ خلف الامام میں شمار کیا گیا ہے اور یہ غلط ہے ابھی امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ کی جزء القرأت ص۴۶ کا حوالہ گزرا۔ مصنف خیر الکلام نے ص۴۰۶-۴۰۷ پر پہنچ کر فاتحہ خلف الامام پڑھنے کی دلیل بیان کی اور اس میں قوم کو دھوکہ دیا۔ ممکن ہے کہ دھوکہ نہ دیا ہو وہ خود بھی اس دھوکہ میں پڑے ہوں۔ ضَلُّوْا فَاَضَلُّوْا والا معاملہ ہو۔ بات کوئی ایسی گہری نہیں کہ وہ نہ سمجھے ہوں۔ ہر چہ باداباد۔ غلطی کی نشاندہی کرتا ہوں۔ ص۴۰۶ میں لکھا کہ ایک صحابیؓ نے آپؐ کے پیچھے نماز میں یہ کلمات کہے۔ اللہ اکبر کبیرًا والحمد للہ کثیرًا وسبحان اللہ بکرۃً واصیلًا (مختصر) آپؐ نے اس کو پسند کیا۔ دوسرے شخص نے الحمد للہِ حمدًا کثیرًا طیّبًا مّبارکًا فیہ... الخ کہا تو آپؐ نے فرمایا کہ بارہ[۱۲] فرشتوں نے ان کلمات کے لکھنے کے لیے جلدی کی۔ (مسلم ص۲۱۹ ج۱، نسائی ص۱۰۴ ج۱) اس کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپؐ کے پیچھے جب ایسے کلمات پڑھ لیتے تھے جو نماز کی صحت کے لیے شرط نہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی مدح کرتے اب یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے فاتحہ سے لوگوں کو روکا ہوگا۔ انتہیٰ۔

یاد رہے کہ دوسرے شخص کے یہ کلمات مصنف خیر الکلام نے نہیں لکھے۔ میں نے لکھ دیئے تاکہ پتہ چل جائے۔ انھوں نے مجمل ہی لکھا ہے اور امام نسائی (ص۱۰۴ ج۱ میں) اللہ

اکبر الحمد لِلّٰہِ حَمْدًا کثیرا طیّبًا مبارکًا فیہ۔ کے الفاظ بین الدعاء بین التکبیرۃ والقرأۃ میں نوع آخر من الذکر بعد التکبیر کے تحت لائے ہیں اس سے بالکل واضح ہے کہ یہ کلمات قرأۃ سے پہلے تکبیر تحریمہ کے بعد پڑھے گئے۔ فاضل اہلِ حدیث کے استدلال کا حاصل یہ ہُوا کہ جب ایسے کلمات آپؐ کے پیچھے مقتدیوں نے جماعت میں پڑھے اور آپؐ نے منع نہیں فرمایا تو فاتحہ کا پڑھنا کیونکر منع ہوگیا ؟

الجواب : استدلال تو نہایت مختصر اور آسان ہے مگر اس کی قیمت بیت العنکبوت کے برابر بھی نہیں ہے۔ قیمت کیسے ہو ؟ ٹھگی کی بات کو کون سُنتا اور مانتا ہے ؟ خدا جانے مصنف نے بے سوچے سمجھے یہ لکھ دیا ہے یا لوگوں کو پاگل سمجھے بیٹھے ہیں۔ دیکھئے بات تو یہ ہو رہی ہے کہ جب امام قرآن مجید کی قرأت و تلاوت کرتا ہو تو ایسے وقت اُسے نہایت ہی غور و توجّہ سے سُنا جائے نہ بھی سُنے تو قرآن کریم کی عظمت کے پیش نظر خاموش رہے کہ حکم یہی ہے نہ یہ کہ اپنی الگ قرأت میں لگ جائے اور امام کی قرأت کی طرف پورا دھیان اور التفات ہی نہ کرے اور اس طرح اس میں نقص اور کمی آجائے اور یہ قرآن کریم کی عزت و عظمت اور شان کے منافی ہے۔ قرآن کریم اسی کی ہدایت دے رہا ہے۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا۔ یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اس وقت تم پوری توجّہ سے اُسے سُنو۔ حدیث بھی یہی فرماتی ہے اذا قرأ فانصتوا جب امام قرأت کرے تو تم خاموش ہو جاؤ اور زبان بند کر دو۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ یہ بتائیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جن دو صحابہ کرامؓ نے یہ بالا کلمات پڑھے تھے، کیا یہ امام کی قرأت کے وقت پڑھے گئے تھے کہ ان کی ممانعت آپؐ نے نہیں فرمائی بلکہ آپؐ نے ان کو پسند کیا ؟ یہ کلمات تو انھوں نے ثنا کی جگہ اور قرأت سے پہلے پڑھے تھے جیسا کہ امام نسائی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تبویب سے عیاں ہے اور سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ... الخ۔ ثناء کی جگہ اور متعدد ادعیہ اور اذکار کا ذکر نسائی میں موجود ہے اس وقت پڑھنے سے کون روکتا ہے ؟ آپ کا جی چاہے تو پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے صحابیؓ

Scanned by CamScanner

کے کلمات جن کو بارہ[۱۲] فرشتے لینے آئے تھے آپ کی دلیل نہیں بن سکتے۔ اس لیے کہ ان کا پڑھنا بھی تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان ہُوا تھا جیسا کہ مبوب الواب مسلم حضرت امام نوویؒ نے ان کلمات پر یہ باب قائم کیا ہے۔ باب مایقال بین تکبیرۃ الاحرام والقرأۃ۔ (ص ۲۱۹/۱ ج) کیا یہ امام کی قرأت کا زمانہ ہے ایسے رنگ میں استدلال کرنے والے سے بس یہی کہنا جا سکتا ہے کہ ہوش سے بات کیا کریں۔ بے محل بات کرنے والے کے لیے یہی سبق بہتر ہے۔ اس بیان میں مصنف خیر الکلام نے دونوں جگہ چالاکی سے کام لیا ہے اور دونوں جگہوں کے کلمات کا محلِ وقوع بیان نہیں کیا۔ صرف مجمل انداز سے کہہ دیا کہ صحابہ کرامؓ آپؐ کے پیچھے جب ایسے کلمات پڑھ لیتے تھے... الخ۔ آپؐ کے پیچھے ایسے کلمات پڑھے گئے۔ بارہ[۱۲] فرشتوں والے کلمات کا سرے سے ذکر ہی نہیں کرتے کہ شاید کسی کو پتہ نہ لگ جائے کہ یہ تو امام کی قرأتِ قرآن کے زمانہ میں نہیں پڑھے گئے تھے تو اس سے استدلال کیسا؟ حق بات کو چھپایا نہیں کرتے۔ ہمیشہ کھوٹی چیز پر ہی پردہ ڈالا جاتا ہے اور اسی سے دھوکہ دینے والا کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ کلمات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے حضراتِ صحابہ کرامؓ نے پڑھے لیکن یہ بتائیں کہ کہاں پڑھے؟ کیا یہ آپؐ کے پیچھے قرأتِ قرآنِ کریم کے زمانہ میں پڑھے تھے؟ یہ بتانا آپ کے ذمہ ہے کیونکہ آپ مُدعی ہیں۔ ہم نے یہ تفصیل عوام کو سمجھانے کے لیے کی ہے۔ مصنف خیر الکلام کے جواب کے لیے تو اتنی ہی بات کافی ہے کہ ہوش سے باتیں کریں۔ بحالتِ نیند باتیں نہ کیا کریں کیونکہ نائم مرفوع القلم ہوتا ہے۔ حسب حدیث رفع القلم عن ثلاثہ عن النائم حتّٰی یستیقظ الحدیث۔ (ابوداؤد ص ۲۴۸/۲، والترمذی ص ۱۷۱/۱ والجامع الصغیر ص ۲۴/۲ وقال صحیح)

تخصیصِ عام اور نسخِ حکم کا بیان

اس کے بیان کی ضرورت اس لیے محسوس ہوگی کہ مصنف خیر الکلام نے اس کے بیان میں کئی اوراق سیاہ کیے ہیں اور قواعد بازی سے فاتحہ خلف الامام کا راستہ نکالا ہے

لیکن آپ جانتے ہیں کہ شارعِ عام کو چھوڑ کر بند گلی میں جانے والے کو کہا جاتا ہے کہ پیچھے مڑ جاؤ۔ چلنے میں آپ نے غلطی کی ہے۔ پہلے چند اصولی باتیں مقام کی تشریح کے لیے عرض کرتا ہوں۔ بعد میں مقصد کا تذکرہ کروں گا۔ واللہ الموفّق، ومنہ الھدایۃ۔

تخصیص کا معنی قَصْرُ الْحُکْمُ عَلٰی بَعْضِ الْاَفْرَادِ کرتے ہیں۔ یعنی عام کے بعض افراد پر حکم کو بند کر دینا جیسے مشہور مثال اقتلوا المشرکین ولا تقتلوا اھل الذمہ یعنی قتل کا حکم اہلِ ذمہ کے علاوہ دیگر مشرکین کے لیے ہے اس کو تخصیص بالکلام المستقل کہا جاتا ہے۔ استثناء کو تخصیص بغیر المستقل کہتے ہیں۔ دونوں میں اصل حکم بالکلیہ رفع نہیں ہوتا۔ ہاں کچھ تغییر ہو جاتی ہے اور نسخ رفع الحکم بالکلیّہ کو کہتے ہیں جیسے کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور الا فزوروھا کہ اجازتِ زیارتِ قبور سے نہی کا حکم منسوخ ہو گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ حکم اٹھانے والی دلیل اصل کے برابر درجہ کی ہو گی یا اس سے فائق اور قوی۔ کیونکہ ضعیف دلیل قوی کو رفع نہیں کر سکتی پھر جیسے استثناء موصول ہوتی ہے۔ اسی طرح دلیلِ تخصیص بھی موصول ہی ہوتی ہے اگر متأخر آجائے تو اس کو نسخ کہتے ہیں۔ توضیح میں فرمایا کل ما ھو تفسیر لصحۃ متراخیا۔ یعنی جو نصّ شرعی کسی حکم کی تفسیر اور تشریح کے درجہ میں ہو تو وہ متراخی بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ بیان محض بنتی ہے ہاں جس میں تغییر ہو وہ موصولاً ہی ہو گی۔ فرمایا کل ما ھو تغییر لا یصحّ اِلّا موصولاً اتفاقا کالاستثناء۔ یعنی کوئی آیت یا حدیث تفسیر کے درجہ کی ہو تو وہ متراخی بھی ہو سکتی ہے لیکن جس میں تغییر ہو وہ موصول ہی ہو گی جیسے مستثنیٰ۔

(۲) جب دو آیتیں یا حدیثیں یا آیت اور حدیث ایسی آجائیں کہ ان کے حکموں میں اختلاف ہو اور تاریخ معلوم نہ ہو تو ان کو باہم مقارن ہی سمجھا جائے گا اور دونوں کے حکموں میں مناسب مقام و حال توجیہ کی جائے گی کہ تخالف رفع ہو جائے۔ حاشیہ توضیح تلویح ص ۴۹۶ میں ہے ان مجھول التاریخ محمول علی المقارنۃ یعنی تاریخ معلوم نہ ہو تو بلا وجہ مقدّم مؤخّر نہیں بنایا جائے گا۔ بلکہ موصول بنا کر مسائل نکالے جائیں گے۔ مثالوں کے بیان میں طول ہو گا۔

Scanned by CamScanner

(۳) عبارت شافعیہ عام قطعی کہتے ہیں اور دلیل مخصوص منہ البعض بیان کرتے ہیں اور حنفیہ کرام اس دلیل تشاہد کو تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ کثیر التعداد عام قطعی پائے جاتے ہیں۔ مَامِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اس وِنْ کو استغراقیہ کہتے ہیں جو نص عموم میں ہوتا ہے۔ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ۔ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ وَمَا لَهُ لِمَا يُرِيْدُ۔ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا۔ ہاں بے شک رب تجھیں ہے۔

(۴) توضیح تلویح ص۲۹۴ بیان التغییر والتقریر یجوز بالکتاب بالخبر الواحد دون التغییر لانہ دونہ فلا یغیرہ فلا یجوز التخصیص بخبر الواحد عندنا قال فی التلویح (لان حکمہ الواحد دون الکتاب لانہ ظنی والکتاب قطعی) یعنی تخصیص کتاب اللہ کے عام کی خبر واحد سے درست نہیں ہوگی کیونکہ خبر واحد کتاب اللہ سے نازل درجہ میں ہے۔ کتاب اللہ قطعی ہے اور خبر واحد ظنی ہوتی ہے۔ والتغییر لا یکون الا بما یساویہ او یکون فوقہ۔ یعنی کتاب اللہ کے حکم کی تغییر خبر واحد سے نہیں کر سکتی کیونکہ تغییر مساوی درجہ کی حجت سے ہو سکتی ہے یا فائق سے۔ خبر واحد کا درجہ کم ہے خواہ مشہور کے درجہ کی بھی ہو۔

اس پر حضرت علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے تلویح میں مناقشہ کیا کہ قرآن کریم کا متن اگرچہ قطعی ہے لیکن دلالۃ علی المراد میں ظنی ہو سکتا ہے لہٰذا تخصیص اسی سے نازل ہو سکتی ہے۔ فرمایا لانہ رفع الدلالۃ فی بعض الموارد فیکون متروکہ ظنی بالظنی۔ انتہی کلامہ۔ یہ فرمان ان کا بجا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا کہ وہ خبر واحد صحیح ہونے کے علاوہ صریح بھی ہو۔ کیونکہ خبر واحد فی نفسہ ظنی الثبوت ہوتی ہے خواہ مشہور کے درجہ میں بھی ہو۔ اگر دلالۃ علی المراد میں صریح نہیں تو دلالۃ بھی ظنی بن جائے گی۔ اس طرح کتاب اللہ کی آیت سے کم درجہ میں ہو کر اس کی تخصیص نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ تخصیص تغییر حکم کا نام ہے اور تغییر کرنے والی خبر

Scanned by CamScanner

مثلِ اوّل کے ہونی چاہیئے یا اس سے فائق درجہ کی کم درجہ والی تغییر نہیں کر سکتی بلکہ خود ساقط ہو جائے گی۔ عقل اور نقل کی شہادت یہی ہے۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے ایک معمولی کلرک کو کیا حق ہے کہ جج صاحب یا اور کسی افسر کی فرمودہ بات میں ترمیم کرے۔

فرمان نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کہ اہل اور نا اہل کی شناخت کی جائے۔ ہر افسر اپنی پاور کے اندر ہی رہتا ہوا کام کرتا ہے۔ کلکم راعٍ ومسئول عن رعیتہ فرمان بھی صحیح ثابت ہے۔ عوام بے چارے حدیث کے مراتب نہیں جانتے۔ لیکن اہلِ علم تو جانتے ہیں۔

صرف یہ سبق لوگوں کو سکھایا جاتا ہے کہ لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب۔ بخاری کی حدیث ہے اس میں مقتدیوں کو حکم ہے کہ فاتحہ پڑھیں نہیں تو نماز نہیں ہو گی اور ڈنکے بجاتے ہیں۔ چیلنج کرتے پھرتے ہیں کہتے ہیں اور کسی کی نہ سنو جگہ جگہ عوام غیر مقلدین حنفیہ کو تنگ کرتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ خبر واحد ہے۔ ظنی الثبوت ہے۔ حدیث کے صحیح ہونے سے وہ قطعی تو نہیں بن جاتی اور اس بخاری کی عام عنوان والی روایت میں صریح مقتدی کا حکم نہیں ہے۔ صرف لفظی عموم ہے اور عام میں اغلب تخصیص ہوا کرتی ہے اس حدیث میں بھی تخصیص آچکی ہے۔ حدیث (ترمذی صفحہ ۶۱) میں ان کان معک قرآن فاقرء ما تیسّر کے بعد و الّا فاحمد اللہ وکبّر وھللہ بھی روایت میں مروی ہے اور مدرک رکوع بلا فاتحہ پڑھے ہوئے اس کی نماز جمہور کے نزدیک ہو جاتی ہے یہی بات حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔ لکھتے ہیں: بعض متأخرینِ شافعیہ جیسے ابنِ منذرؒ اور ابنِ خزیمہؒ اس کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن قوی جمہور کا قول ہی ہے۔ جیسے یہ مستثنیٰ ہیں اسی طرح مقتدی کے استثناء کی روایت بھی مسلم شریف میں اذا قرأ فانصتوا صریح ثابت ہو چکی ہے۔ غور کریں کہ اس حدیث کا ثبوت[1] بھی ظنی ہے کیونکہ یہ خبر واحد ہے اور دلالت[2] مقتدی پر بھی ظنی ہے جیسے ابھی معلوم ہوا۔ تو اس سے آیتِ کریمہ کے حکم میں تغییر نہیں ہو سکتی۔

الحاصل: بخاری شریف کی یہ حدیث صحیح ہے لیکن بالمقابل قرآنِ کریم کی آیت

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔ ثبوت کے اعتبار سے قطعی ہے ہاں مقتدی کے بارہ میں ہونا ظنّی ہے کیونکہ یہ الفاظ خطبۂ جمعہ وعیدین کو بھی شامل ہیں۔ قول راجح اگرچہ نماز کے بارہ میں نازل ہونا ہے۔ لیکن شبہ سے خالی نہیں۔ لہٰذا آیت قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ بن گئی۔ یہ حسبِ قاعدہ راجح رہے گی۔ واجب الاعتبار ہوگی اس حدیث (لَاصَلٰوۃَ لمن لّم یقرأ بفاتحۃ الکتاب) کا مقام اور رتبہ آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ سے نازل درجہ یعنی کم رتبہ میں ہے آیت قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ ہے اور حدیث ظنّی الثبوت، ظنّی الدلالت ہے۔ اور اگر فریقِ ثانی کا استدلال فاتحہ خلف الامام کے فریضہ ثابت کرنے میں ترمذی، ابوداؤد کی روایت سے ہے جو محمد بن اسحٰق عن مکحول کے طریقہ سے مروی ہے تو اس میں ان کو دیکھنا ہوگا کہ یہ حدیث اس سند سے مروی شدہ صرف حَسَن کے درجہ کی ہے۔ حدیث عبادہ حدیث حسن صـ۷۲ پر امام ترمذیؒ فرما چکے ہیں۔ اور وہ صحیح سے کم درجہ کی ہوتی ہے۔ جیسے ادنیٰ درجہ کا پاس کہہ دیتے ہیں۔ عوام اگرچہ مراتب کا فرق نہیں جانتے وہ حَسَن کو بھی صحیح کہہ دیں گے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ مقبول کی اقسام میں ادنیٰ درجہ کی حدیث کو حسن کہتے ہیں۔ حَسَن روایت کو صحیح کے مقابلہ میں ترک کر دیا جاتا ہے۔ ہاں تقابل نہ ہو تو پھر حَسَن سے معمولی درجہ کا حکم ثابت ہو جاتا ہے۔ جمہور اسی کے قائل ہیں مگر حضرت امام بخاریؒ اور امام ابوبکر بن العربیؒ حسن حدیث کو سرے سے حجت ہی نہیں مانتے۔ (نیل الاوطار صـ۲۲ ج۱) اور نواب صدیق حسن خانؒ لکھتے ہیں: عمل بر حَسَن جائز نیست نزد بخاریؒ۔ (مسلک الختام صـ۱۴ ج۱) اور امام ابوحاتمؒ بھی حدیث حَسَن کو قابلِ احتجاج نہیں سمجھتے۔ (ملاحظہ ہو تدریب الراوی صـ۸۷، وتوجیہہ النظر صـ۱۴۶) لیکن ایک فریضہ کا اثبات اس سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے قوی دلیلِ صحیح حجت اور صریح حدیث درکار ہوتی ہے۔) لیکن جب حَسَن صحیح کے مقابل پڑ جائے تو اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور صحیح کو لے لیا جاتا ہے۔ موجودہ متنازعہ مسئلہ خلف الامام فاتحہ خوانی کا ہے اس میں صحیح مسلم شریف کی حدیث ثُمَّ لیؤمّکم احدکم فاذا کبّر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔ آچکی ہے کہ مقتدی کا فریضہ انصات (خاموشی) ہے

یہ صحیح بھی ہے صریح بھی ہے اور ترمذی اور ابوداؤد والی مذکورہ روایت محمد بن اسحاق عن مکحول والی صحیح نہیں ہاں حَسَن کے درجہ کی ہے۔ اس کو حسبِ قانون ساقط ہی کرنا ہوگا۔ بلکہ اگر ترمذی یا کوئی اور اس کو صحیح بھی کہہ دے جب بھی یہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ نخبۃ الفکر میں حضرت حافظ ابنِ حجرؒ کا ضابطہ لکھا ہوا ہے: یقدم رواۃ ما فی الصحیحین علی غیرھما لعلو درجتھا فی الروایۃ۔ یعنی صحیحین کی روایت کو غیر پر ترجیح ہوگی کیونکہ ان کا مقام حدیث کی معرفت میں اوروں سے اُونچا ہے۔ یہ بات میں نے حضرت امام ترمذیؒ کے حَسَن فرمانے کو مانتے ہوئے کہی ہے ورنہ محمد بن اسحاق کی روایت حَسَن کب ہوسکتی ہے؟ عنقریب تفصیلی بیان آنے والا ہے کہ یہ روایت حَسَن ہونے کے قابل بھی نہیں ہے بلکہ شاذ مردود ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسے رعایتی پاس کیا ہے۔ امام موصوف اس کی اطراف وجوانب کو زیرِ نظر نہیں لائے۔ ورنہ حَسَن کہنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ (یہ باتیں عرض کرنے کے بعد خیال آیا کہ کچھ تفصیل بیان کی جائے۔ اور فاضل جماعتِ اہل حدیث مصنف خیر الکلام کی کچھ کرمفرمائیاں آپ کے سامنے پیش کروں۔ صحیح فیصلہ دونوں طرفوں کی باتوں کے بعد ہوسکتا ہے۔ جونسی باتیں آپ کے دل کو لگتی ہیں قبول کیجئے۔ واللہ الحسیب)

مصنف خیر الکلام نے چالاکی سے قوم کو اندھیرے میں ڈالا ہے

خیر الکلام صـ۴۰۶ میں جب یہ سمجھے کہ اس حدیث (لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب) کے صرف صحیح بن جانے سے تو کام نہیں چلتا۔ کیونکہ یہ خبر واحد ہے اور آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کے مقابل اس کو کون مانے گا؟ آیت قطعی درجہ کی محکم ہے۔ خبرِ واحد کا درجہ کم ہی ہوتا ہے اس کو دیکھ کر انھوں نے کروٹ بدلی۔ لکھتے ہیں: اور حدیث لاصلوٰۃ بقول امام بخاریؒ متواتر ہے جزء القرأت صـ۶۵ اور متواتر کے ساتھ حنفیہ کے ہاں قرآن کی تخصیص اور نسخ بھی جائز ہے وہ سمجھے کہ متواتر بن جانے کے بعد یہ بھی قطعی حجت بن جائیگی۔

الجواب : مِنَ الْمَلِكِ الْوَهَّاب :

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

"انسان کو ہر تمنا حاصل نہیں ہوا کرتی۔ ہوائیں کبھی کشتی بان کی خواہش کے خلاف چلا کرتی ہیں"۔

اس تواتر سے اگر امام بخاریؒ رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ کا تواتر مراد ہو تو یہ قول بجا ہوگا۔ لیکن محدثینِ کرامؒ تواتر کا معنیٰ یہ کرتے ہیں کہ ہر طبقہ میں طبقات کے (صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ) اس روایت کی اتنی کثرت پائی جائے کہ عقلِ سلیم کو محض کثرت کو دیکھ کر یقین آ جائے۔ اگر اوّل طبقہ میں دو، چار ہی راوی ہوں بعد میں کثرت ہو جائے تو اس کو متواتر نہیں کہا جائے گا۔ اس کو خبر مشہور ہی کہیں گے۔ اگر حضرت عبادہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہ روایت بخاریؒ اور مسلمؒ کے علاوہ بقیہ صحاح ستہ میں پائی جائے جب بھی اس کو متواتر نہیں کہا جا سکتا حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ اختلافی مسائل میں اپنے رجحان کو پکا کرنے کے لیے ایسے مبالغہ کے الفاظ بول دیتے ہیں۔ جزء رفع الیدین کے رسالہ میں آپ لکھتے ہیں لَمْ يَثْبُتْ عَنْ اَحَدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ تَرْكُهُ۔ یعنی کسی صحابیؓ سے ترک رفع یدین ثابت نہیں۔ حالانکہ ان کے شاگردِ رشید حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث لم یرفع یدیہ الا اوّل مرۃٍ کے بعد ص۶۵ فرماتے ہیں: وبہ یقول غیر واحد من اھل العلم من اصحاب النبیؐ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم والتابعین۔ یعنی کثیر التعداد حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی مذہب ہے جو حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فرما رہے ہیں کہ وہ رفع یدین صرف ایک دفعہ تکبیر تحریمہ کے وقت کرتے تھے۔

الحاصل: تواتر حدیث کی فی نفسہٖ صفت ہے کہ زمانہ میں اتنی کثرت سے یہ روایت پائی گئی ہو کسی کے کہنے سے تواتر نہیں بنتا۔ یہ حدیث حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خبر واحد ہی متواتر نہیں۔ ظنّی الثبوت[1] ہے اور ظنّی الدلالہ[2] بھی ہے کہ مقتدی کو اس کے عموم میں داخل کر لیا جاتا ہے اور آیتِ کریمہ سورۂ اعراف والی قطعی الثبوت[1]، ظنی الدلالہ[2] ہے۔ لہٰذا یہ حدیث آیت کی تخصیص نہیں کر سکتی۔ کیونکہ تخصیص تغییر کو کہتے ہیں اور یہ حدیث آیت کے مساوی درجہ کی نہیں ہے بلکہ کم درجہ کی ہے۔ اس لیے یہ

Scanned by CamScanner

کہنا کہ مقتدی کے لیے انصات وخاموشی کا حکم ماسوٰی فاتحہ کے ہے قطعاً غلط ہے کیونکہ مقتدی کے لیے یہ حکم بشمولیّت فاتحہ تمام قرأت قرآن میں ہے۔

حاصل مقام یہ ہے کہ آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا جو قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہے۔ نماز مفروضہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہی اس کا اصل مورد ہے لیکن لفظی طور سے اختصاص نماز کے ساتھ نہیں رکھتی اس لیے اس کو ظنی الدلالت کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس حدیث اذا قرأ فانصتوا یہ امام اور مقتدی کے بارہ میں قطعی اور صریح ہے کیونکہ اس کا صدر حصّہ انّما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبّر فکبّروا ہے اس میں انصات کا حکم مقتدی کو دیا گیا ہے لیکن خبر واحد ہونے کے لحاظ سے یہ ظنی الثبوت ہے۔ اور حدیث حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لَاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ یہ خبر واحد ظنی الثبوت ہونے کے ساتھ ظنی الدلالۃ بھی ہے۔ مقتدی کو اس کی ظاہری تغییر یعنی لفظی عموم میں اعتبار کیا جاتا ہے۔ عام ویسے بھی ظنی ہوتا ہے کیونکہ اغلب اس میں تخصیص ہی ہوتی ہے اور مانحن فیہ میں تو تخصیص صحیح حدیث میں آچکی ہے: اَلْاَفْلَحَمَدَ اللّٰہَ وَکَبَّرَہٗ وَھَلَّلَہٗ۔ اس لیے حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی اس روایت کو کیسے ترجیح دی جاسکتی ہے جب کہ اوّل دونوں حجتیں اس سے اقوٰی اور ارفع شان والی ہیں۔ اس لیے اس حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرء کے عموم کو ماسوٰی مقتدی کے لیے اعتبار کرنا ہوگا۔ یعنی یہ کہ یہ حکم امام اور منفرد کا ہے کیونکہ مقتدی کے بارہ میں تو وہ دونوں شرعی دلیلیں اس سے اقوٰی درجہ کی آچکی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کے راوی حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ تعالیٰ حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث کے بعد ھٰذا اذا کان وحدہٗ فرمارہے ہیں۔ (ابوداؤد) اسی طرح امام احمد رحمۃ اللہ تعالےٰ کا قول اس حدیث کے متعلق اذا کان وحدہ امام ترمذیؒ نے صـ۷۲ پر نقل کیا ہے۔ بلکہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کا فرمان بھی اس حدیث کے بعد اَلَّا اَنْ یَّکُوْنَ وَرَاءَ الْاِمَامِ روایت کیا ہے۔ ترمذی صـ۷۲۔

اس بیان سے بخوبی واضح ہوگیا کہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب کی حدیث ظنی محض کو پیش نظر رکھنا اور اس کی تعلیم دینا اور آیت کو جو اس سے رفیع شان رکھتی ہے نہ لینا مرفوع کو راجح پر ترجیح دینا ہے جو بے انصافی ہے اور اعطاء کل ذی حقّ حقّہ کی ذمہ داری کے خلاف ہے۔ بلکہ یہ بھی گزر چکا ہے کہ اس حدیث کے آخر میں فصاعدًا، ومازاد، فمازاد وغیرہ الفاظ بھی مروی ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ حدیث مقتدی کے بارہ میں نہیں ہے۔ ہاں اس میں منفرد نماز پڑھنے والے شخص کا وظیفہ اور عمل بیان کیا گیا ہے یہ کئی دفعہ بیان گزرا ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کے دل میں یہ کھٹکا گزرے یا کوئی دھوکہ دے کہ تخصیص تو کلام مستقل اور موصول کو کہتے ہیں جیسے اقتلوا المشرکین ولا تقتلوا اھل الذمہ میں ہے اور یہاں موصول ہونا نہیں پایا جاتا۔

جواب یہ ہے کہ ہم نے ان دونوں حدیثوں کو تاریخ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے موصول اور مقارن بنایا ہے اس کو جہل بالتاریخ کہتے ہیں اسی طرح اس حدیث کو آیتِ کریمہ اعراف والی کے ساتھ ہونا اور تخصیص کا قول بھی کہا گیا ہے۔ حاشیہ تلویح نولکشوری ص۴۹۶ میں ہے ان مجھول التاریخ محمول علی المقارنۃ یعنی جن نصوص کی تاریخ معلوم نہ ہو ان کو مقارن ہی اعتبار کیا جائے گا۔ تقدیم اور تاخیر کا حکم تو سوائے عام تاریخ کے نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ عام عنوان والی حدیث آیتِ کریمہ اعراف والی کے مقارن ہی اعتبار کی جائے گی۔ آیت کا حکم مقتدی کے لیے انصاتِ محکم واجب العمل ہوگا اور حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جس میں ظن در ظن ہے۔ اس کے تابع بنائی جائے گی یعنی اس کو ماسوائے مقتدی پر محمول کیا جائے گا۔ ظن در ظن اس لیے کہا گیا کہ ۱ خبر واحد ہونے کی وجہ سے ظنی ہے اس میں تواتر تو نہیں پایا گیا۔ اور ۲ مقتدی پر دلالت بھی صریح نہیں ہے۔ مقتدی کا حکم جو صریح کے درجہ میں آیت کریمہ سے مفہوم ہوتا ہے وہ اس ظنی حدیث سے بدلا نہیں جا سکتا۔ مقتدی کا حکم صریح کے درجہ کا اس لیے کہا گیا ہے کہ آیتِ کریمہ کا نزول نمازِ مفروضہ کے بارہ میں

ہی ہُوا اور اس کا اصل مورد ہی وہی ہے اور مصنف خیر الکلام کا قول ہے کہ کسی موقع پر عام لفظ بولے جائیں تو مورد تو قطعاً داخل رہتا ہے۔ خیر الکلام ص۴۰۵ پہلے گزر چکا ہے۔ شاید اسی وجہ سے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حدیث کے آخر میں اِلّا ان یکون وراء الامام فرما رہے ہیں۔ (ترمذی)

مصنّف خیر الکلام فاضل جماعت اہلِ حدیث کی اُلٹی چال، اور اس میں ناکامی

ان واضح حقائق اور صحیح شواہد کو دیکھتے ہُوئے ان کو پسِ پُشت اور اپنے عندیات، خیالات اور روایاتِ ضعیفہ کو ایک فرضیہ کے اثبات کے لیے قوم کے سامنے پیش کرنا مصنف خیر الکلام کا کتاب میں عام رویہ پایا جاتا ہے دیکھئے خیر الکلام ص۴۰۵-۴۰۶ میں اپنے لوگوں کو یہ سبق دے رہے ہیں۔ آیت تو بالاجماع مکّی ہے اور حدیث مدنی ہے۔ پھر حضرت عبادہؓ بن صامت کی مفصّل روایت میں تو مقتدی کا خاص طور پر ذکر ہے۔ ص۴۰۶ مدینہ منورہ میں آپ نے یہ حکم دیا کہ بدون فاتحہ نماز نہیں ہوتی۔ اور بعض روایات میں خلف الامام کا لفظ بھی موجود ہے۔

اس میں کئی باتوں کا تذکرہ کر گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ آیت سے متأخر زمانہ کی ہے اور بعد از ہجرت مدینہ منورہ میں یہ حکم آپؐ نے دیا۔ لہٰذا حدیث کا حکم ہی لیا جائے گا۔ آیت کا یہ حکم متقدم زمانہ کا ہے اس کو چھوڑا جائے گا۔ قرأت خلف الامام کی یہ دلیل ہے لوگوں کو یہ سناتے جاؤ۔ اور ڈنکے بجاتے جاؤ۔ بلکہ سبق میں یہ بھی پڑھایا کہ یہ حدیث حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (مصنف خیر الکلام نے کسی جگہ صحابہ کرام کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا عنہم کا لفظ نہیں لکھا) کی ان کی مفصّل روایت سے جس میں فجر کا تذکرہ ہے مختصر ہے اس سے جہری نمازوں میں بھی خلف الامام فاتحہ خوانی کا ثبوت ہو گیا لیکن اس کی تردید عنقریب گزر چکی کہ یہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی رائے ہے۔ ان کی اوّل بات کا جواب سُنئے۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

الجواب : جب حدیث مدنی ہے اور آپ نے اس کو مدینہ منورہ کی تعلیم بتایا، اور آیت اعراف مکّی قبل از ہجرۃ کی ہے۔ اس طرح تو حدیث متأخر ہو گئی۔ پھر آپ نے اس

کو تخصیص کے قاعدہ کے نیچے کیسے ذکر کیا؟

تخصیص تو کلام مستقل موصول کو کہتے ہیں، متقدم متأخر کو تو ناسخ و منسوخ کہتے ہیں۔ آپ نے مولانا عبدالحیؒ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا کہ حنفیہ خبرِ واحد سے تخصیص مانتے ہیں۔ کیا وہ خبرِ واحد سے نسخ بھی جائز کہتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ناسخ کا حکم بطورِ معارضہ ہوتا ہے اور اس میں رفع الحکم السابق ہوتا ہے وہ اوّل حکم کی دلیل کے مثل سے یا اقوی سے ہوگا۔ خبرِ واحد سے نہیں ہوسکتا۔ کیا سیشن جج کا حکم ماتحت عدالت اٹھانے کی مجاز ہے؟ آپ نے تو تخصیص اور نسخ میں فرق ہی اڑا دیا ہے۔ آپ نے آیتِ قطعی کا حکم حدیث ظنی الثبوت اور ظنی الدلالۃ سے اُٹھا دیا ہے یہ تو من مانی شریعت ہے۔ آپ اگر غیر مقلد ہیں تو ہوں لیکن دُنیا تو بڑوں کی مانتی اور ان کی باتوں پر عمل کرتی ہے عقل کا حکم بھی یہی ہے۔ ایک مریض پہلوان کو کیسے گرا سکتا ہے؟ حدیث بخاری میں آجانے سے قرآن کے برابر تو نہیں بن جاتی۔ عقل کا فیصلہ یہی ہے۔ ضد کا علاج نہیں۔ آپ کی قوم اگر فرقِ مراتب نہیں کرتی تو یہ اس کا قصور ہے دوسروں کو اس غلط روی پر کیسے لایا جاسکتا ہے؟

بلکہ اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو یہ حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث مسلم شریف کی حدیث اذا قرأ فانصتوا کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتی وہ صحیح ہونے کے بعد قطعی الدلالۃ ہے کیونکہ وہ مقتدی کے بارہ میں خاص طور سے آئی ہے اور مقتدی کا حکم خلف الامام بتا رہی ہے جو محلِ نزاع ہے اور حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث عام عنوان والی ہے۔ خاص مقتدی کا حکم بیان نہیں کرتی من لم یقرأ بقول آپ کے عام میں اغلب ہوتی ہے۔ عقل والے کے لیے اتنا بیان کافی ہے۔ یہ ہے فریقین کے دلائل کا موازنہ، غور سے پڑھیں اور عقل سے پوچھیں اور اس کی ہدایت پر چلیں عصبیت کو چھوڑیں۔

(۲) اس کے بعد فاضل مصنف خیر الکلام کی دوسری بات کو زیرِ نظر لائیں کہ (یہ حدیث مدنی ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ نے یہ حکم دیا کہ بدون فاتحہ نماز نہیں ہوتی)، اس سے وہ اپنی جماعت والوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ کوئی حنفی آیتِ کریمہ وَاِذَا قُرِئَ

اَلْقُرْاٰنُ ... الخ سے استدلال کرے تو تم کہہ دینا کہ یہ آیت مکّی ہے۔ قبل از ہجرت کے زمانہ کی ہے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے بعد مدینہ منورہ میں یہ حکم دیا کہ بدون فاتحہ نماز نہیں ہوتی۔ ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔

الجواب : میں پوچھتا ہوں کہ اس بات کی دلیل پیش کرنی ہوگی کہ یہ فرمان مدینہ منورہ میں جاکر فرمایا۔ اگر یہ اس سے سمجھے کہ اس کا راوی حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انصارِ مدینہ سے ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ مدینہ شریف کے چند انصار ہجرت سے پہلے مکّہ شرفہا اللہ تعالیٰ کو گئے تھے جمرۂ عقبہ کے پاس آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی اور آپؐ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کی درخواست بھی کی تھی۔ لیکن آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خداوندِ تعالیٰ کی اجازت کے انتظار کا فرمایا۔ ان انصار مدینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں یہ حضرت عبادہؓ بن صامت بھی تھے۔ کیا بعید ہے کہ ان دنوں کی اقامت میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز کا یہ مسئلہ ان حضرات کو بتایا ہو۔ نماز تو اوّل زمانہ نبوت سے ہی مشروع ہے۔ مشکوٰۃ شریف کے آخر میں اسماء رجال کا رسالہ ہے۔ اس کے ص۲۱ میں ہے: عبادة بن الصامت شهد العقبة الاولى والثانية وشهد بدرًا۔ اس طرح یہ حدیث بھی مکّی بن گئی جیسے آیت مکّی ہے۔ یہ دونوں اس اعتبار سے مقارن بن گئے اور ان میں تخصیص کا حنفیہ کرام نے کہا کہ اس حدیث (لا صلوٰة لمن لم يقرأ) سے مراد ماسوای مقتدی کے نماز پڑھنا ہے یعنی انفرادی نماز، اس میں فاتحہ ضرور پڑھی جائے گی۔ مقتدی کا حکم تو آیت اور حدیث دونوں انصات بیان کر رہے ہیں۔ لیکن مصنف خیر الکلام نے حدیث کو مدنی بنا دیا کہ بعد از ہجرت آپؐ نے یہ حکم دیا اور اس طرح آیت کے حکم کو منسوخ بنا رہے ہیں۔ یہ سب جعلی کاروائی ہے جو نرے تعصب پر مبنی ہے۔

(۳) مصنف خیر الکلام فاضل جماعتِ اہلِ حدیث نے عام عنوان والی حدیث جو حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اس کو فجر کے قصّہ والی مفصّل حدیث سے مختصر ہونے کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ خاص مقتدی کے بارہ میں آئی ہے اور کہا کہ اس طرح

عموم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ اس میں لا تفعلوا الا بفاتحۃ الکتاب کی استثنار مروی ہے۔ اس میں خاص مقتدی کو فاتحہ خوانی کا حکم دیا گیا ہے۔ فانہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب آیا ہوا ہے اور کہا کہ اس طرح یہ حدیث آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ کے لیے مخصص بن سکتی ہے کہ استماع وانصات ضروری ہے لیکن مقتدی کو فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ انصات ماسوٰی فاتحہ کی قرأت کے وقت ہوگا۔

مزید فاضل اہلِ حدیث نے حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ کا حوالہ بھی دیا کہ انھوں نے کہا ہے کہ حنفیہ کے نزدیک خبر واحد سے تخصیص ہو سکتی ہے وہ سمجھے کہ الزام پختہ ہو گیا کیونکہ حدیث حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اگرچہ خبر واحد ہے لیکن اس سے تخصیص ہو سکتی ہے بلکہ خیر الکلام ص۱۴۱ پر لکھا: ہمارے نزدیک احادیث کے ساتھ تخصیص تقیید ہو سکتی ہے (وغیر ذلک)۔ یہ ان کی مراد کی تفصیل ہے اب اس کے بعد فسادات اور خامیاں جو اس میں ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیں۔

الجواب: مشہور ہے لَنْ يُّصْلِحَ الْعَطَّارُ مَا اَفْسَدَهُ الدَّهْرُ۔

بظاہر قوم نے ان کے ان علمی نکات سے خبردار ہو کر خراجِ تحسین ادا کیا ہوگا یہ بھوکے کو باسی روٹی مل جائے تو خوشی مناتا ہے شکر گزاری کرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس بیان میں انھوں نے قوم کو اندھیرے میں رکھ کر خطرناک مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ خالص کھوٹی چیز کو ملمع سازی سے چالو کر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سمجھ نصیب کرے۔

گزشتہ بیان گزر چکا ہے کہ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس مفصل روایت کو جس میں فجر کی نماز کا قصہ مذکور ہے عام عنوان والی روایت (لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ) سے ملانے اور جوڑنے کا دعوٰی کیا ہے لیکن یہ ان کا بلا دلیل اجتہادی نظریہ ہے حجت نہیں بن سکتا جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کو متواتر کہہ دیا تھا تاکہ کارآمد بن جائے۔ لیکن گزر چکا کہ اس سے کام نہیں بنتا۔ اسی طرح حضرت حافظ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا یہ دعوٰی بھی محض اپنی مذہبی پاسداری کی رعایت داری ہے۔ گزشتہ اس کی نظیر گزر چکی ہے۔ وَلَا حمد... الخ۔

(۲) مصنف خیر الکلام نے لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ۔ عام عنوان والی حدیث

کو مدنی کہا ہے۔ بیان گزرا کہ یہ دعوٰی بلا دلیل ہے۔ اس جگہ اس کو مختصر کہہ کر مدنی بنانا چاہتے ہیں کیونکہ حصّہ فجر کی نماز کا جو مفصّل روایت میں ہے وہ مدینہ منورہ کا ہے اور اس کو خاص بحق مقتدی بتا کر تخصیص کا دعوٰی کرتے ہیں کہ استماع و انصات کا حکم مقتدی کے لیے نہیں لیکن یہ نہ دیکھا کہ اس طرح یہ مختصر اور مفصّل دونوں متأخر ہو کر حکم قرآنی کے لیے ناسخ بن جائیں گے اور حضرت مولانا عبدالحی رحمہ اللہ تعالیٰ جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ خبر واحد کا کتاب اللہ کے لیے ناسخ ہونا نہیں مانتے اور اس متأخر کو آپ تخصیص کے ضابطہ کے نیچے لاتے ہیں۔ آپ کی قوم اگر ایسی بے تمیزی کرتی ہے تو ان کی مرضی۔ باشعور اور اہلِ علم حضرات تو کہتے ہیں کہ ناسخ کا درجہ اور مقام منسوخ کے مساوی ہونا چاہیئے یا قوی، ضعیف قوی کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے؟ اسی مجبوری سے تو امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خبر متواتر کہہ دیا تھا۔ جیسا کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔

(۳) تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ مفصّل فجر کے واقعہ والی حدیث جس کو حضرت حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ تعالیٰ اور آپ عام عنوان والی (لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ) کا ماخذ بناتے ہیں اور کہتے ہیں الظاھر انہ مختصر من ھٰذا۔ یہ صحیح بھی نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کو حسنٌ فرما رہے ہیں۔ اور حسن صحیح سے کم درجہ کی حدیث ہوتی ہے صحیح کے مقابلہ میں اس کو ردّ کر دیا جاتا ہے۔ آپ حضرات ایسی کمزور، دق اور سل کی بیمار روایت کو کتاب اللہ کے مقابل اعتبار کر رہے ہیں اور صحیح مسلم کی حدیث کو چھوڑ رہے ہیں۔

جب مختصر حصّہ یعنی لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب صحیح ہونے کے باوجود قرآنی حکم فاستمعوا لہ وانصتوا کے مقابل نہیں اعتبار کیا جا سکتا۔ جس کا تذکرہ ابھی گزرا تو یہ محمد بن اسحٰق عن مکحول عن محمود بن الربیع والی مفصّل روایت۔ حسن درجہ کی حدیث آیتِ کریمہ کے بالمقابل کیسے اعتبار کی جا سکتی ہے؟ یہ مفصّل روایت صرف حسن درجہ کی ہے اور یہ تو مسلم شریف کی صحیح حدیث اذا قرأ فانصتوا کے مقابل بھی قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ صحیح اور صریح ہے اور آپ کی محمد بن اسحٰق عن مکحول والی صرف حسن کے درجہ کی حدیث ہے اور انشاء اللہ العزیز عنقریب آنے والا ہے کہ امام ترمذیؒ کا اس کو حسن فرمانا

بھی رعایتی ہے اور آپ اس کو مدنی بتا کر اور آیت کریمہ سے متأخر کہہ کر اس پر عمل کرتے ہیں بلکہ اس کو دیکھ کر مقتدی پر فاتحہ فرض ہونے کا حکم کر رہے ہیں کیا یہ بے اصولی بات نہیں ہے؟ غیر مقلدی کیا اسی کا نام ہے کہ مسلمہ قواعد کو نظر انداز کیا جائے اور من مانی کی جائے؟ محمد بن اسحٰق کی یہ روایت اگرچہ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، جزء القرأت میں لائی گئی ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ اس کو حسنٌ فرما رہے ہیں لیکن محمد بن اسحٰق اس سند کے بیان میں منفرد ہیں اور وہ مدلّس بھی ہیں اور روایت عن مکحول عن محمود کے طریقہ سے کرتے ہیں۔ مدلّس کی عن والی روایت مشکوک ہوتی ہے۔ مدلّس راوی کبھی ضعیف الحال راوی کو گرا کر اُوپر کی طرف منسوب کر کے عن کے ذریعہ سے روایت کر جاتا ہے۔ حضرت امام بیہقی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ رواہ اھل الشام مرسلاً یعنی شام والے ثقات اس حدیث کو مرسل طور سے نقل کرتے ہیں۔ یعنی مکحول عن عبادۃؓ کہتے ہیں۔ پانچ حضرات کے نام لیے جو اس طرح مُرسَل نقل کرتے ہیں۔ یہ پانچوں مکحول کے شاگرد ہیں۔ ابن اسحٰق ان سب کے خلاف نقل کرتا ہے۔ جب یہ مُرسَل روایت ہے تو صحیح مسلم شریف کی حدیث مُسند صحیح کے بالمقابل کیسے اس کو لیا جا سکتا ہے۔ بلکہ حضرت امام بیہقی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ چار راوی اور مکحول عن نافع بن محمود عن عبادہ نقل کرتے ہیں اور نافع بن محمود مجہول من الطبقۃ الثالثۃ ہے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ محمد بن اسحٰق کی اس دق ورسل والی بیمار روایت کو لینا اور اس پر فاتحہ خلف الامام کے فریضہ کہنے کی مدار رکھنا انصاف کے خلاف ہے۔ تفصیل ان باتوں کی انشأ اللہ تعالیٰ موقع پر آنے والی ہے۔

غور فرمائیں کہ محمد بن اسحٰق کی اس روایت میں اگر کچھ جان ہوتی تو امام بخاریؒ اس کو ترجمۃ الباب میں ہی ضرور ذکر فرما دیتے۔ باب تو وجوب القرأۃ خلف الامام کا باندھا، لیکن یہ حدیث ترجمۃ الباب میں بھی نہیں لائے۔ جہاں کہیں ضعیف حدیث ہوتی ہے وہاں صیغہ مجہول یُذکر عن فلان یا یروی کہہ کر ترجمۃ الباب میں لے آتے ہیں۔ شارحین کہہ جاتے ہیں کہ مجہول کے صیغہ سے لانا اس کے ضعف کی طرف اشارہ ہے لیکن باوجود اشد ضرورت کے امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے محمد بن اسحٰق کی اس حدیث کو ترجمۃ الباب

میں بصیغۂ مجہول بھی ذکر نہیں کیا۔ ہاں اپنے رسالہ جزأ القرأت میں اسے ذکر کر دیا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ امام بخاریؒ کے اس رسالہ جزء القرأت کا وہ مقام نہیں جو بخاری شریف کا ہے۔

غیر مقلدین عموماً یہ دھوکہ دیا کرتے ہیں اور امام بخاریؒ کی جزء القرأت کی حدیثیں نقل کر دیتے ہیں اور لوگوں کو اعتبار دیا کرتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے یہ روایت بیان کی ہے حالانکہ وہ روایت جزء القرأت کے رسالہ کی ہوتی ہے جس میں انھوں نے صحت حدیث کا التزام نہیں کیا۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ اس کا راوی کون اور کیسا ہے؟

اس مقام پر پہنچ کر یہ بات بھی یاد رکھیں کہ غیر مقلدوں کو عموماً یہ سبق پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے کہ اگر کسی حنفی نے صحیح مسلم کی حضرت سلیمان تیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ والی حدیث اذا کبّر فکبروا و اذا قرأ فانصتوا سے قرأت خلف الامام کے منع پر استدلال کیا تو تم کہہ دینا کہ اس حدیث کی سند امام مسلمؒ نے نہیں ذکر کی۔ ویسے کہہ دیا کہ زاد سلیمان التیمی فی ھذا الروایۃ اِذا قرأ فانصتوا۔ لہٰذا یہ مسلم کی حدیث نہ ہوئی اور اس کو وہ مُسند نہیں لائے۔ یہ نکتہ انھوں نے امام نووی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کلام اور نقل سے کیا ہے۔ انھوں نے کہا: لم یروھا مسندۃ فی کتابہ۔ (نووی شرح مسلم ص ۱۷۵ ج ۱)۔

اسی کے جواب کے لیے مَیں نے کئی جگہ لکھا ہے کہ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فتح الباری ص ۱۹۲ ج ۲ میں فرمایا: اخرجہ مسلم فی صحیحہ من حدیث ابی مُوسیٰ الاشعریؓ .... الخ۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ حضرت امام مسلمؒ نے سند کے ساتھ اس حدیث کو بیان کیا ہے اور حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کما رواہ مسلم فی صحیحہ من حدیث ابی موسیٰ الاشعریؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا و اذا قرأ فانصتوا۔ (تفسیر ابن کثیرؒ ص ۲۸۰ ج ۲)۔ اور علامہ ابو البرکات ابنِ تیمیہؒ نے مرفوع روایت میں یہ ارشاد یوں نقل کیا ہے: ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبّر فکبروا و اذا قرأ فانصتوا۔ الحدیث۔ (منتقی الاخبار مع النیل ص ۲۴۹ ج ۲)۔ اور

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں : وقد اخرج مسلم فی الصحیح ھذا الزیادۃ فی حدیث ابی موسیٰ الاشعریؓ .... الخ

اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت علامہ نوویؒ کا یہ بہانہ طفل تسلی والی بات ہے۔ علامہ نوویؒ رعایت سے ایسی باتیں کر جاتے ہیں۔ دیکھیے حنفیہ کرام نے کہا کہ فرض مطلق قرأت قرآن ہے : فاقرءِ ما تیسّر معك من القرآن حدیث میں ہے اور فاتحہ واجب ہے اس کے بدون نماز ناقص ہوتی ہے۔ لیکن امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ماتیسر سے مراد یہی ہے۔

الجواب : کیوں جناب! فاتحہ کی تو سات آیات ہیں اور والعصر اور سورۃ الکوثر کی تین تین آیات ہیں۔ کیا سات کا پڑھنا آسان ہے یا تین کا ؟ ما تیسّر کا مصداق آپ نے سات آیات والی سورۃ کو کیسے متعین بنا دیا۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ چار آیات ہیں۔ سات سے تو یہ بھی آسان ہے یہ بھی صرف مذہبی رعایت سے انھوں نے کہا ہے۔ ورنہ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔

علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کا اس جگہ یہ فرمان بھی کچھ قیمت نہیں رکھتا کہ حضرت قتادہؒ کے شاگردوں سے صرف سلیمان تیمیؒ یہ زیادت (واذا قرأ فانصتوا) نقل کر رہے ہیں کیونکہ یہ زیادت دیگر رواۃ کی روایت کے مخالف نہیں ہے۔ ہاں زیادۃ ثقہ کی ہے جو بمنزلہ حدیث مستقل سمجھی جاتی ہے۔ شافعیہ حضرات اس کو نہیں دیکھتے۔ یہ صرف ان کا لانا اور اوروں کا نہ لانا ذکر کر جاتے ہیں۔ یہ قواعد حدیثیہ کے خلاف ہے اسی غلط راستہ پر مصنف خیر الکلام بھی چلے ہیں حضرت امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ فرما چکے ہیں ھل ترید احفظ من سلیمان ان کا یہ کہنا اس جملہ کی صحت کی ضمانت ہے۔ یہ پورا بیان دوسری جگہ آچکا ہے۔

اسی طرح شارح علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ بیان بھی کوئی وقیع نہیں کہ سلیمان تیمیؒ کی اس روایت کی سند امام مسلمؒ نہیں لائے۔ غور فرمائیں جب کہ ان کی سند وہی مذکور متقدم ہے تو مستقل اسناد لانے کی کیا ضرورت ہے ؟ دیکھئے ص ۲/۱۷ امام بخاری رحمہ

اللہ تعالیٰ قال ابن شھاب واخبرنی ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن ... الخ سے ایک مزید بات بیان کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مستقل سند بیان نہیں کی۔ اس جگہ حاشیہ میں کہتے ہیں کہ اسکی اسناد وہی متقدم ہے جو مذکور ہو چکی ہے یا امام کو کسی اور سند سے یہ روایت ملی ہوگی۔ اسی طرح یہاں بھی اس کی اسناد وہی متقدم مذکور ہے۔ اسی لیے حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اخرجہ مسلم فی صحیحہ فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔

کیا بخاری کی اس حدیث کو (جو ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کے طریقہ سے انھوں نے ذکر کیا لیکن مستقل اس کی اسناد نہیں ذکر) آپ بخاری کی حدیث نہیں کہیں گے؟ کیا اس کو اخرجہ البخاری فی صحیحہ نہیں کہا جائے گا۔ لم یخرجہ مسندۃ فی صحیحہ امام نوویؒ کی طرح تو یہاں بھی آپ کہہ سکتے ہیں۔ غور و فکر سے کام کیجئے۔ واللہ الموفق۔

بقدر ضرورت ادلّہ منع القرأت خلف الامام کا بیان آچکا ہے۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ مزید کچھ باتیں فریقِ ثانی کے ادلّہ اور ان کے جوابات کے بیان میں انشاء اللہ تعالیٰ آنے والی ہیں۔

وصلّی اللہ تعالیٰ وسلّم علیٰ محمد وعلیٰ الہ واصحابہ وازواجہ واتباعہ اجمعین

سیّد محمّد ذاکر علی شاہ

حنفی